مطالعہ تاریخ

مطالعۂ تاریخ

مُطالعۂ تارِیخ

تصنیف

ہنری سٹیل کومیجر

ترجمہ

غلام رسُول مہرؔ

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور • پشاور • حیدرآباد • کراچی

Published by Charles E. Merrill Publishing Company, Columbus, Ohio.

FIRST URDU EDITION
PRINTED IN PAKISTAN

طبع اوّل ۱۹۷۲ء
تعداد ۱۱۰۰
طابع .. .. .. شیخ نیاز احمد
مطبع .. .. .. علمی پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت .. .. [redacted] روپے

ناشر
شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، چوک انارکلی، لاہور
بہ اشتراک
مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن، لاہور - نیویارک

فہرست ابواب

معاشرتی علوم کے سیمینار کا سلسلہ

(مرتبہ ریمنڈ ایچ میوسگ اور ونسنٹ آر۔ راجرز)

معاشرتی علوم کے سیمینار کے سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ، جغرافیہ، سیاسی علوم، اقتصادیات، عمرانیات اور بشریات کی نوعیت و مسائل کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نگاہ پیش کیے جائیں۔ معاشرتی علوم کا مواد ہر دائرے کے عملی طرزِ مطالعہ سے مہیا ہوتا ہے، ابتدائی جماعتوں اور ثانوی جماعتوں کے اساتذہ دونوں کے لیے۔

ان چھ جلدوں میں پہلا کام یہ ہے کہ ہمارے سکولوں میں معاشرتی مطالعے کے پروگرام میں ان معاشرتی علوم کی جھلک موجود ہو جن سے اخذ کیا جاتا ہے۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ تعلیمی کاموں میں حصّہ لینے والے لوگ معاشرتی علوم کا مواد تعلیمی تجربات میں ڈھال کر پیش کرنے کے ذمّہ دار ہیں تاکہ نوجوان ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے معاملات پر اسی طرح بحث و گفتگو کر سکتے ہیں جس طرح یہ انھیں دیکھتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ اس روشنی سے آگاہ ہو سکیں جو سکولوں میں تعلیم دینے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کام پیشہ ور ماہرِ تعلیم کا ہے جو تعلیمی نظریات اور معمولات کو اکٹھا کرنے کا تجربہ رکھتا ہے۔ یہ اسی کا کام ہے کہ ایسا ڈھانچا تیار کرے جو معاشرتی علوم سے حاصل کی گئی ہنرمندیوں اور روشوں کے لیے سہارے کا کام دے سکے۔ یہ بھی اسی ماہرِ تعلیم کا کام ہے کہ فیصلہ کر سکے، کون کون سی چیز تعلیم کی کس کس سطح پر استعمال کی جا سکتی ہے اور موضوع کو موزوں طریقوں، مواد اور مآخذ سے پختہ اور مستحکم کیا جا سکتا ہے۔

تمام تازہ ترین تعلیمی پروگراموں اور ہیجان انگیز مواد میں ایک انتقادی ضرورت ہے جو معاشرتی علوم میں دورِ حاضر کے فکر کو جلوہ گر کر سکے۔ معلّمین کو چاہیے کہ ان چیزوں کو سائنسی مطالعہ جاری رکھنے کے دائرے سمجھیں۔ یہ خیال نہ کریں کہ یہ فراہم شدہ کے ساکن و جامد ڈھانچے ہیں۔ انھیں ان دائروں کی نوعیت اور تعبیر کی زیادہ حقیقت پرستانہ گرفت کی ضرورت ہے نیز وہ مسائل سمجھ لینے چاہییں جن سے کسی دائرے میں کام کرنے والے لوگ دوچار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ اساتذہ کی مدد

کی جائے تاکہ وہ اپنے مقاصد کا ازسرِ نو جائزہ لے لیں اور دیکھ سکیں کہ خاص موضوعات کی تعلیم کے سلسلے میں ان کا طریقِ رسائی کیا ہے جو وسیع تر تنظیمات سے وابستہ ہیں۔

اس نقطۂ نگاہ کے پیشِ نظر سلسلے کے ایڈیٹروں نے تجویز پیش کی کہ معاشرتی علوم کے متعلق لکھنے والوں میں سے ہر ایک سے پوچھا جائے، اس کے دائرے میں کیا کچھ ہے جو تعلیم سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی وساطت سے نوجوانوں کو سکھایا جا سکتا ہے۔ ہر مصنّف سے کہا گیا کہ وہ اپنے دائرۂ کار کی نوعیت بیان کرے۔ اس کی تاریخ بتائے۔ اوضاع و اطوار پر نظر ڈالے اور جو جو چیزیں اسے بنیادی حیثیت کی نظر آئیں۔

اس سلسلے کی ہر جلد کے ساتھ کتابیں مرتّب کرنے والوں نے ایک ایک باب کا اضافہ کر دیا ہے جس میں معاشرتی علوم پر بحثیں اور تجزیے کیے گئے ہیں۔ مرتّب کرنے والوں نے معاشرتی علوم کے مطالعے کے سلسلے میں کوئی بڑے بڑے نظریے نہیں بنائے بلکہ انھوں نے ان طریقوں پر توجہ جمائے رکھی جو سکولوں کے اندر جماعتوں کی تعلیم کے لیے رائج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سلسلوں کے آخری ابواب میں پورا پروگرام یا کوئی بڑا نظریہ پیش نہیں کیا گیا۔ کتابیں مرتب کرنے والوں نے جن تعمیمات سے کام لیا ہے وہ صرف اس لیے اختیار کی گئی ہیں کہ ان پر زور تو رہے گا لیکن وہ کوئی بنیادی حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔ جن افکار کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ خاص موضوعات اور خاص پروگراموں سے بالا ہیں۔ مرتّب کرنے والوں نے "کیوں"، "کہاں"، "کب" والے سوالات پر بھی بحث نہیں کی جن سے معاشرتی علوم کے مطالعے میں معاشرتی علوم کا خاص مقام معلوم ہو جائے ان کے نزدیک ہر معاشرتی علم بجائے خود سکھایا جا سکتا ہے اور اسے اضافی مقاصد کے لیے موجودہ پروگرام میں شامل کیا جا سکتا ہے یا انھیں ایسا مقام دیا جا سکتا ہے جو کسی آئندہ نصاب کے لیے موزوں ہو۔

جگہ کی کمی کے باعث اپنے ان افکار پر سیر حاصل بحث نہیں کی گئی جو ہر معاشرتی علم سے اخذ کیے گئے۔ مرتّب کرنے والوں نے مختلف طریقے پیش کیے ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے یا مختلف حالات میں انھیں اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مقصود یہ نہیں کہ یہ افکار جو سلسلوں میں پیش کیے گئے ہیں، متفرق یا غیر مرتّب صورت میں استعمال کیے جائیں۔ مختلف افکار سے کوئی سطحی چیز لے کر پیش کرنا طلبہ کے لیے چنداں معنی خیز نہ ہوگا۔ مرتّب کرنے والے سمجھتے ہیں کہ بڑے بڑے افکار کو سمجھنے اور نشوونما دینے کے مختلف طریقے ہیں اور ان سے سکول میں تعلیم کے دوران رفتہ رفتہ وسیع تر پیمانے پر کام لیا جا سکتا ہے۔

معاشرتی علوم کے سیمینار کا یہ سلسلہ ہمارے نزدیک آغازِ سفر کا نقطہ ہے یا سفرِ دریافت کے لیے اسے بادبان اٹھانے کی دعوت سمجھنی چاہیے۔

دیباچہ

یہ کتاب ایک مؤرخ اور معاشرتی معلومات کے دو معلّموں کی مساعیٔ تعاون کا انتہائی نقطہ ہے۔ ڈاکٹر ہنری سٹیل کومیجر ایمہرسٹ کالج میں تاریخ اور امریکی موضوعات کے مطالعے کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کتاب کے ابتدائی ابواب لکھے جن میں تاریخ پر ایک علم کی حیثیت میں بحث کی گئی۔ پروفیسر کومیجر نے تاریخ کی نوعیت، مقاصد، نصب العین اور داخلی بصیرتوں پر بحث کی۔ ساتھ ہی اس کے طریقے اور مسائل پیشِ نظر رکھے۔ موصوف کے مسودے میں مزید مطالعے کے مفید مآخذ کی دولت موجود ہے۔

آخری حصّہ جس میں جماعتوں کے اندر تعلیم دینے کے طریقوں کا ذکر ہے۔ پروفیسر ریمنڈ ایچ مُیوسگ نے لکھا جو اوہایو سٹیٹ یونیورسٹی میں کالج آف ایجوکیشن کے پروفیسر ہیں۔ ان کے معاون پروفیسر ونسنٹ آر، راجرز تھے جو منی سوٹا کی یونیورسٹی میں کالج آف ایجوکیشن کے پروفیسر ہیں۔ پروفیسر کومیجر کے لکھے ہوئے ابواب میں جو خاص افکار ہیں ان پر ان دو پروفیسروں یعنی مُیوسگ اور راجرز نے توجہ دی اور ان تک پہنچنے کے لیے متعدد طریقے واضح کیے جن سے ابتدائی اور ثانوی سکولوں میں کام لیا جاسکتا ہے اور طلبہ ان اہم تاریخی تبصروں کو سمجھنے کے سلسلے میں فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

مرتّبین

پہلا باب

ماہیتِ تاریخ

تاریخ کی تعریف

تاریخ کے متعلق جو بات سب سے پہلے کہنی چاہیے، یہ ہے کہ لفظ تاریخ مبہم اور غیر واضح ہے۔ اس کے مفہوم دو ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ اس کا پہلا مطلب ہے زمانۂ ماضی اور جو کچھ اس میں گزرا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب ہے، زمانۂ ماضی کا ریکارڈ۔ یعنی وہ سب کچھ جو انسانوں نے زمانۂ ماضی کے متعلق کہا اور لکھا ہے یا جیکب برک ہارٹ[1] کے مختصر الفاظ میں "جو کچھ ایک دور کے متعلق دوسرے دور کے نزدیک لکھ رکھنے کے لائق ہے۔" بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں باتیں حقیقتہً بڑی حد تک یکساں ہیں۔ ماضی کے وجود کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق ریکارڈ کر دیا گیا یا جس حد تک ہم اس کے حالات سے باخبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ریکارڈ کے بغیر زمانۂ ماضی کا بامقصد وجود کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اٹلی کے عظیم القدر فلسفی مؤرخ بینی ڈیٹو کروچے نے دعویٰ کیا ــــــ کہ پوری تاریخ اصل میں معاصرانہ تاریخ ہے۔ ہمیں آگے چل کر معلوم ہو گا کہ اس میں سچائی کا ایک خاص جرثومہ موجود ہے لیکن یہ نظریہ اتنا غلط نہیں جتنا کہ مبہم اور ایک لحاظ سے بگڑا ہُوا ہے۔ ماضی اپنے وجود کے لیے ہم پر انحصار نہیں رکھتا بلکہ وہ بجائے خود موجود ہے۔ یہ موجود تھا اگرچہ مؤرخ اس کے متعلق ریکارڈ مرتب کرنے میں ناکام رہے اس کی مثال وہی ہے کہ کسی جنگل میں درخت گر جائے لیکن وہاں کوئی فرد اس کے گرنے کی آواز سُننے والا نہ تھا۔ تاریخ یکایک زندہ نہیں ہو جاتی جب کوئی مؤرخ اس کی دریافت یا تحریر و نگارش کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جو مؤرخ زمانۂ ماضی کا کوئی معمّا حل کرتا ہے یا نئی معلومات کی فراہمی میں سرگرم ہوتا ہے اور اس طرح ہمارے علمِ ماضی میں کوئی خلا پورا کر لیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ماضی کی تخلیق کی۔ البتہ وُہ نئی چیز دریافت کرنے کا ذمّہ دار یقیناً ہو گا۔ جو کچھ پیش آ چکا تھا وہ اس کے باوجود پیش آ چکا تھا اور اس سے جو نتیجے برآمد ہو چکے تھے وہ اس کے بغیر برآمد ہو چکے تھے۔

---

[1] : سوئٹزرلینڈ کا ایک مصنّف (۱۸۱۸ء – ۱۸۹۷ء)۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ" جیمز میڈیسن نے وفاقی اجتماع (فیڈرل کنونشن) کے متعلق جو نوٹ لکھے تھے وہ ۱۸۳۶ء تک شائع نہ ہوئے۔ جب شائع ہو چکے تو اس کے بعد مؤرخوں کو وہ سب کچھ جان لینے کا موقع ملا جو کنونشن کے ایوان میں پیش آیا تھا۔ اس وقت وہ یہ واضح کرنے کے قابل ہوئے کہ وہاں کیا کچھ پیش
۲ آیا تھا حالانکہ جو کچھ کنونشن میں پیش آیا تھا —— مثلاً مندوبین نے جو کچھ کہا تھا —— بہت پہلے کہہ چکے تھے اور اس نے تاریخی صورت اختیار کر لی تھی۔ کنونشن کی بحثوں کے نتائج میڈیسن کے نوٹوں کی اشاعت کے منتظر نہ تھے۔

تاہم اگر فیڈرل کنونشن کی بحثیں تاریخ تھیں تو میڈیسن کے نوٹ بھی تاریخ ہی کے اجزا تھے۔ کنونشن میں جو کچھ پیش آیا تھا اس سے بھی بعض نتائج برآمد ہوئے تھے۔ اسی طرح پچاس سال بعد میڈیسن کے نوٹ شائع ہوئے۔ ان سے بھی نتائج برآمد ہوئے۔ ان نتائج نے رسمی قراردادوں کے ڈھانچے پر گوشت پوست چڑھایا اور اس کی رگوں میں خونِ حیات دوڑا دیا۔ قبل ازیں مؤرخین محض سرسری باتوں پر مطمئن تھے۔ ان نوٹوں کی اشاعت کے بعد زیادہ حقیقت پسندی اور دستور کی تعبیرات کے متعلق زیادہ قومی نقطۂ نگاہ کے دور کا آغاز ہوا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ جب کوئی مؤرخ زمانۂ ماضی کا کوئی گم شدہ جزئیہ دریافت کرتا ہے یا اس دور کے کسی تاریک گوشے پر روشنی ڈالتا ہے تو وہ زمانۂ ماضی کا ڈھانچا حقیقتہ" از سرِ نو تیار کرتا ہے۔ تاریخ وہاں پہلے سے موجود تھی، جو کچھ پیش آنا تھا پیش آ چکا تھا۔ خواہ انسانوں کی یادداشتیں اس سے آگاہ تھیں یا نہ تھیں۔ یاد جھنجھوڑی جا سکتی ہے۔ شعور کو حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ زمانۂ ماضی کی تصویر بدلی جا سکتی ہے۔ جب کوئی مؤرخ یہ کارنامہ انجام دیتا ہے تو کہا جا سکتا ہے اس نے "تاریخ سازی کی۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ زمانۂ ماضی ہے۔ نیز تاریخ زمانۂ ماضی کی یاد بھی ہے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ہمارا تعلق اس معنی کے دوسرے پہلو سے ہے۔

تاریخ بطورِ حافظہ

آئیے۔ تاریخ پر حافظے کی حیثیت میں غور کریں۔ جو لوگ تاریخ نہیں رکھتے یا تاریخ سے

لہ : امریکہ کا ایک قومی لیڈر (۱۷۵۱ء — ۱۸۳۶ء) جمہوریہ امریکہ کا چوتھا صدر (۱۸۰۹ تا ۱۸۱۷ء) میڈیسن نے "فیڈرل کنونشن" کے متعلق جو نوٹ مرتب کیے تھے وہ اس کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔

ناآشنا ہیں ان کی حیثیت اس آدمی کی سی ہے جو قوتِ حافظہ سے محروم ہو۔ وہ ہر وقت ایک ہی قسم کی دریافتیں کرتا جائے گا جو بار ہا زمانۂ ماضی میں دریافت ہو چکیں۔ ایک ہی قسم کی ٹیکنیک ایجاد کرے گا۔ ایک ہی قسم کے مسائل سے الجھے گا۔ ایک ہی قسم کی غلطیاں کرے گا پھر وہ یادداشت کی نہایت بیش قیمت مسرّتوں سے بھی محروم رہے گا۔ جس طرح تہذیب کے بغیر تاریخ کا تصوّر مشکل ہے اسی طرح تاریخ کے بغیر تہذیب کا کوئی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ فریڈرک ہیریسن[1] نے ٹھیک لکھا :

"فرض کیجیے کہ تہذیب کی تدریجی ترقی یا فنونِ حیات اور طبعی علوم کی آہستہ آہستہ تکمیل کے متعلق تمام معلومات محو کر دی جائیں۔ فرض کیجیے کہ ابتدائی نسلوں کی تمام جد وجہد اور سعی و کوشش یا بڑے آدمیوں کے تمام کارنامے مٹ جائیں۔ تاریخ کا کوئی ایسا نشان قائم نہ رہے جس سے مختلف دوروں کا اندازہ ہو سکے جس کی وجہ سے ہر قوم، نسل یا شہر کو دورِ ماضی کے دوسرے شہروں یا نسلوں یا ملکوں سے امتیاز حاصل ہو۔ کچھ معلوم نہ ہو سکے انسانوں نے کیا کچھ کیا یا کیا کچھ کر سکتے تھے۔ ان کی بہت سی ناکامیوں، کامیابیوں اور اُمیدوں کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکے۔ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیجیے کہ تمام کتابیں، تمام روایتیں، زمانۂ ماضی کی تمام عمارتیں رُوئے زمین سے ناپید ہو جائیں، ان کے ساتھ ہی معاشرے کے ادارے، تمام سیاسی اوضاع، تمام سیاسی اصُول، تمام نظام ہائے فکر، تمام یومیہ مراسم، تمام شناسا فنون، غرض کوئی چیز باقی نہ رہے۔ فرض کیجیے کہ ہمارے نہایت مقدّس اور حد درجہ گہری جڑوں والے ادارے بھی ختم ہو جائیں۔ فرض کیجیے کہ خاندان، گھر بار، جائداد اور انصاف کے تصوّرات بے معنی رہ جائیں۔ غرض وہ تمام مراسم جو پیدائش سے موت تک ہمیں گھیرے رہتے ہیں، ختم کر دیے جائیں اور انسانوں کی ایک ایسی نسل وجوُد میں آ جائے جن کے قلوب قدرت کی ایک عجیب و غریب ضرب کی بنا پر
۳ یاد سے بالکل معرّا کر دیے جائیں، جن کے لیے یہ دُنیا بالکل نئی ہو۔

کیا ہم اپنے ذہنوں میں کامل بے چارگی، ذہنی پریشانی اور مصیبت کا

---

[1] ۔ انگریز فلسفی اور مصنّف (۱۸۳۱ — ۱۹۲۳ء)

تصوّر پیش کر سکتے ہیں جو ان لوگوں کو پیش آئے گی۔" [1]

تصوّرِ تاریخ کے مختلف پہلو

واضح ہے کہ تاریخ کا جو تصوّر یہاں پیش کیا گیا ہے، اس میں ان سے زیادہ پہلو شامل ہیں جن کا دعویٰ اکثر مؤرخوں نے کیا ہے۔ مثلاً زمانۂ ماضی کا پورا ریکارڈ یعنی ادب، قانون، آرٹ، تعمیرات، مجلسی ادارے، مذہب، فلسفہ غرض وہ سب کچھ جو انسانی حافظے میں زندہ ہے اور اس کے ذریعے سے منظرِ عام پر آتا ہے۔ ہمیں تاریخ کی اس عمومی تعریف میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں جس میں اس رائے سے بھی اتفاق کے لیے یہ ماننا ضروری ہو کہ حافظے کے بغیر انسان بالکل متحیّر اور ہر شے سے محروم ہو جائے گا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حافظہ بھی ایک دَوری شے ہے اور یہ بھی وقتاً فوقتاً اَوہام کی صُورت اختیار کر سکتا ہے۔ تاریخ دراصل منظّم حافظہ ہے اور تنظیمی پہلو ہی ہر درجہ ضروری ہے۔ منظّم حافظے کی صورت میں تاریخ بے شمار شکلیں اختیار کرتی ہے اور بے شمار مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ آئیے ہم بعض شکلوں پر غور کریں جو یہ اختیار کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ بعض مقاصد کا بھی ذکر کرتے چلیں جن کی خدمت اس کے ذریعے سے انجام پاتی ہے۔

داستاں سرائی

سب سے پہلے ہمیں کہنا چاہیے کہ تاریخ ایک داستاں سرائی ہے۔ اگرچہ یہ سب سے زیادہ اہم پہلو نہیں تو کم از کم یہ مان لینا چاہیے کہ یہ بالکل ابتدائی پہلو ہے۔ یہ تاریخ کا ابتدائی کردار تھا اور اب تک یہی سب سے زیادہ ممتاز کردار رہا ہے۔ اگر تاریخ کوئی داستان بیان کرنا بھول جائے گی یا اس سے تغافل برتے گی تو لازماً اس کا اثر ہی سرد نہ ہو جائے گا بلکہ یہ سند و اعتبار کی حیثیت بھی بڑی حد تک کھو بیٹھے گی۔ ایلیڈ [2] اور اوڈیسی [3] میں داستاں سرائی اور تاریخ اس طرح باہم مل گئی ہیں کہ ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ کتابیں ادب کی ہیں یا تاریخ کی۔ یقیناً ان میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ "بابائے تاریخ" یعنی ہیروڈوٹس [4] نے جب یونانیوں اور ایرانیوں کے درمیان رزم و پیکار کا ذکر کیا تھا تو اس نے بھی

---

[1] : "دی مِیننگ آف ہسٹری اینڈ اَدر ہسٹاریکل پیسز" (نیویارک، ۱۹۱۴ء) صفحہ ۵۔

[2] : ہومر کی مشہور کتاب، ٹرائے کے محاصرے کے متعلق۔

[3] : ہومر کی کتاب جس میں اوڈیسیس یا یولی سس کا ذکر ہے۔

[4] : یونان کا مشہور مؤرخ (۴۸۴؁ ــ ۴۲۴؁ ق م)

ایک داستان ہی سنائی تھی جسے بڑے جوش و خروش سے بیان کیا تھا۔ اس کے جانشین تھیوسی ڈائڈز[1] نے بھی ہمیں پیلوپونیشیا[2] کی جنگ کی داستان سنائی تھی۔ لوی[3] اور ٹیسی ٹس[4] عظیم القدر رومی مؤرخ تھے۔ وہ بھی بہت بڑے داستاں سرا تھے جیسے کہ دورِ حاضر کے اکثر ممتاز مؤرخ ہیں مثلاً والٹیر[5]، گبن[6]، کارلائل[7]، میکالے[8]، پرسکاٹ[9]، موٹلے[10] اور پارک مین[11]۔ لارڈ میکالے لکھتا ہے کہ تاریخ بیان کا ایک فن ہے اس سے انسانی تاثرات کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ تصوّر کے سامنے تصویریں آتی ہیں لیکن ضروری ہے کہ مختلف واقعات کو ہنرمندانہ طریق پر انتخاب کیا جائے اور انھیں مناسب ترتیب سے پھیلا دیا جائے اور اپنے دماغ سے کچھ ایجاد و اختراع نہ کی جائے۔

اب ہم تاریخ کی دوسری صفت پر پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ یقیناً داستان سرائی ہے لیکن یہ خودساختہ داستان نہیں۔ تاریخ کے لیے یقیناً تخیّل سے کسی قدر کام لیا جاتا ہے اور تخیّل پر اثر انداز ہوتی ہے تاہم یہ نری خیال آرائی نہیں۔ اس میں وہ داستان بیان کی جاتی ہے جو زمانۂ ماضی کے حالات پر مبنی ہو، یا مؤرخ اپنی چھان بین سے ماضی کے واقعات دریافت کرکے انھیں ازسرِنو مرتّب کر دے۔ مختصر یہ کہ تاریخ ایک ریکارڈ ہے۔ اس میں وہ حقائق فراہم کرکے مرتّب کیے جاتے ہیں جو مہیّا ہو سکیں اور ان میں باہم تعلق ہو۔ نیز ان کے لیے پہلے سے کوئی نہ کوئی ڈھانچا تیار کر لیا گیا ہو معہذا ان حقائق کو

---

۱ : ایتھنز کا مؤرخ جس نے پیلوپونیسی جنگ کی تاریخ لکھی (۴۶۰ء - ۳۹۹ء ق م)

۲ : پیلوپونیسیا یونان کے جنوبی حصّے کا پرانا نام ہے جسے آجکل موریا کہتے ہیں اس کے متعلق سپارٹا اور ایتھنز میں طویل جنگ ہوئی تھی جس کے تین دور تھے۔ تھیوسی ڈائڈز نے اسی جنگ کی کیفیت لکھی ہے۔

۳ : رومی مؤرخ (۵۹ء ق م - ۱۷ء)

۴ : رومی مؤرخ (۵۸ء - ۱۲۰ء)

۵ : مشہور فرانسیسی مصنّف (۱۶۹۴ء - ۱۷۷۸ء)

۶ : انگریز مؤرخ (۱۷۳۴ء - ۱۷۹۴ء)

۷ : انگریز اہلِ قلم (۱۷۹۵ء - ۱۸۸۱ء)

۸ : مشہور انگریز مصنّف و مؤرخ (۱۸۱۸ء - ۱۸۵۹ء)

۹ : امریکی مؤرخ (۱۷۹۶ء - ۱۸۵۹ء)

۱۰ : امریکی مؤرخ (۱۸۱۴ء - ۱۸۷۷ء)

۱۱ : امریکی مؤرخ (۱۸۲۳ء - ۱۸۹۴ء)

پیش کرنے کے لیے کوئی خاکہ بنا لیا جائے۔ تاریخ ان واقعات وحقائق کے لیے ایک نظم، ہم آہنگی اور طریقِ پیش کش مہیا کرتی ہے جو متفرقات کا غیر مرتب انبار ہو۔ لیکن اس ریکارڈ پر بھی بھاری پابندیاں ہیں۔ نیز ریکارڈ کو تاریخ کی شکل میں تبدیل کرنا بھی ہرگز سہل نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ کوئی پریشانی برداشت کیے ۴
بغیر اسے تسلیم کرلیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو بھی ریکارڈ ہمارے سامنے پیش ہوگا وہ بہرحال جزوی اور نامکمل ہوگا۔ چھاپے کی ایجاد سے بیشتر کئی ہزار سال کی تاریخ کے متعلق تو یہ بات خصوصیت سے درست ہے۔ بہت سی ایسی قومیں ہیں جو پندرھویں صدی کے وسط کے بعد بھی چھاپے سے آشنا نہ ہوسکیں مثلاً امریکہ میں بسنے والے اصل باشندے جنھیں انڈین کہا جاتا ہے یا افریقہ کی مختلف قومیں جن کی تاریخ بڑی حد تک ضبطِ تحریر ہی میں نہیں آئی۔ دورِ حاضر کی تاریخ کے بیشتر حصے کے متعلق بظاہر ریکارڈ قریباً مکمل معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً پینٹاگان[1] میں فائلوں کی مختلف الماریاں میلوں میں پھیلی ہوئی ہیں جن میں دوسری عالمی جنگ کے متعلق دستاویزیں جمع ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں بھی ریکارڈ نامکمل ہے۔ مثلاً ہم کیوں کر جان سکتے ہیں کہ دورانِ جنگ میں جو ایک کروڑ بیس لاکھ امریکی فوجی وردیاں پہنے ہوئے تھے ان میں سے ایک ایک کو کیا حالت پیش آئی۔ دوسرے ملکوں کے چار یا پانچ کروڑ مردوں اور عورتوں کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں جو جنگ میں برسرِ پیکار رہے۔ ہم کیوں کر جان سکتے ہیں کہ کروڑوں شہریوں کو کیا کچھ پیش آیا جو جنگ میں اُلجھ گئے تھے۔ ان میں سے بعض شریک تھے۔ بعض جنگ کا ہدف بنے۔ بعض محض تماشائی تھے۔ اس ریکارڈ کے نامکمل ہونے کی ایک اور وجہ بھی ہے یعنی مؤرخوں کے وقت، قوتِ عمل، ذہن وفکر، علمی اور فنی مآخذ کا سلسلہ محدود ہے۔ کوئی مؤرخ اگرچہ اس کے ساتھ مؤرخوں کی ایک بہت بڑی مجلس کارفرما ہو۔ وہ دستاویزیں پڑھ ہی نہیں سکتا جو میلوں میں پھیلی ہوئی ہیں یعنی تمام اخبارات اور دوسری جنگ میں حصہ لینے والے ملکوں کے جنگ آزماؤں میں سے ایک ایک کا ذاتی ریکارڈ کون دیکھ سکتا ہے؟

ناہموار اور جانبدارانہ

یہ ریکارڈ نامکمل ہی نہیں۔ ناہموار اور جانبدارانہ بھی ہے۔ اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ محض اتفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ ماضی کے متعلق ہمارا علم صرف ان باتوں پر مبنی ہے جو اتفاق سے محفوظ رہ گئیں اور جو محفوظ رہ گئیں وہ پورے ریکارڈ کا نہایت مختصر بلکہ بالکل ناقابلِ ذکر ریکارڈ ہے۔ بیشتر ریکارڈ آگ اور تلوار میں تباہ ہوگیا۔ سکندریہ کا کتب خانہ جلا یا گیا اور دوسری عالمی جنگ میں

---

[1]: وہ پنج گوشہ عمارت جو واشنگٹن کا سرکاری دفتر ہے اور دنیا کا سب سے بڑا دفتر ہے۔

بمباری سے بہت کچھ تباہ کر دیا گیا۔ بہت سا ریکارڈ مذہبی و قومی تعصّب کی بنا پر برباد ہو گیا۔ بہت سا ریکارڈ
ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پولیبیس[1] نے تاریخ کی چالیس جلدیں لکھی تھیں، صرف پانچ
باقی رہ گئیں۔ لوی نے تاریخِ روما کی ایک سو بیالیس جلدیں مرتّب کی تھیں ان میں سے ہمارے ہاتھ صرف
پینتیس جلدیں آئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں نہ کوئی منطق ہے نہ کوئی مسلّم نمونہ۔ جو کچھ محفوظ رہ گیا، وہ محض
قسمت اور اتفاق کی بات ہے۔

جو کچھ باقی رہ گیا وہ تماماً نہیں تو بڑی حد تک محض قوّت کا نتیجہ ہے۔ جسٹس ہومز کہا کرتا تھا کہ سچائی
اس قوم کی اکثریت کا ووٹ ہے جس نے دوسری قوموں کو شکستیں دے کر برباد کر دیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ
بھی جزواً اس قوم کا فرمان ہے جو دوسروں پر مسلّط ہو گئی۔ صدیوں سے تاریخ محض فاتح قومیں ہی لکھتی رہی ہیں
مفتوحوں نے کبھی نہیں لکھیں۔ یہ رومی ہی ہیں جنھوں نے پیونک[2] جنگوں کی تاریخ لکھی۔ اہلِ قرطاجنہ کا کوئی حصّہ
نہیں۔ مسیحیوں نے کافروں پر مسیحیت کی فتوحات کا ریکارڈ مرتّب کر لیا۔ کافروں کا اس میں کوئی حصّہ نہیں۔
ہسپانویوں نے میکسیکو اور پیرو میں فتوحات کی داستانیں بیان کر دیں۔ یہ داستانیں ازٹکوں[3] اور
انکاؤں[4] نے بیان نہیں کیں۔ زمانۂ ماضی میں فاتحوں کی ایک خصلت یہ بھی رہی ہے جو ہرگز خوشگوار نہیں
۵ کہ وہ دشمن کے ریکارڈ دانستہ تباہ کرتے رہے۔ تاکہ ان کی آواز کوئی سُن نہ سکے۔ بعض اوقات دشمنوں کے
مؤرخوں کو موت کی سزا دیتے رہے۔

ظاہر ہے کہ جو ریکارڈ ہمارے ہاتھوں تک پہنچا ہے وہ محض جزوی ہی نہیں بلکہ صرف خاص خاص
حصّوں پر مبنی ہے اور تعصّب اس میں بھی کارفرما رہا ہے۔ انسان میں تعصّب کی کارفرمائی اسی طرح
موجود ہے جس طرح خطا و نسیان کا مادہ اس میں موجود ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تعصّب واقعات کی

---

۱ : یونانی مؤرخ (۲۰۵ء - ۱۲۵ء ق م)

۲ : یہ جنگیں رومیوں اور قرطاجنیوں کے درمیان تین مرتبہ ہوئیں آخر قرطاجنہ تباہ ہو گیا۔ رومی کامیاب ہوئے۔

۳ : امریکہ کے قدیم باشندوں کا ایک گروہ جس نے سولھویں صدی تک میکسیکو میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ ہسپانیہ کے ایک منچلے افسر کارٹیز نے اسے تباہ کیا۔

۴ : یہ بھی قدیم امریکی باشندوں کا ایک گروہ تھا جس کی سلطنت کا مرکز پیرو تھا۔ ان کے آثار ایک عظیم تہذیب کے شاہد ہیں۔ انھیں بھی ہسپانویوں نے برباد کیا۔

سادہ سی تعبیرات میں بھی داخل ہو جاتا ہے۔کسی خاندان کے جھگڑے کے متعلق محض دو کہانیاں سامنے رکھ لیجیے وہ کبھی ایک جیسی نہ ہوں گی۔ پھر ہم کیوں کر توقع رکھ سکتے ہیں کہ گیٹس برگ[1] کی جنگ کے متعلق بیسیوں بیانات یا پہلی عالمی جنگ کے آغاز کے متعلق مختلف تعبیرات ایک جیسی ہوں گی۔ تاریخ کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان سے الگ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ انسانی قلب و ذہن سے چھَن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن اس پر آگے چل کر گفتگو ہو گی جب ہم تاریخ کے بعض مسائل زیرِ غور لائیں گے۔

ریکارڈ کی تین حالتیں

تاریخ ریکارڈ کی حیثیت میں تین حالتوں یا عملوں پر مشتمل ہے لیکن یہ تینوں اس ہنرمندی سے ایک دوسرے میں ضم کر دیے گئے ہیں کہ یہ ایک معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز ہے متعلقہ حقائق کی فراہمی لیکن واضح رہے کہ جو حقائق ایک شخص کو متعلقہ معلوم ہوتے ہیں وہ دوسرے کو بالکل بے تعلق نظر آئیں گے۔ دوسری چیز ہے ان حقائق کی ترتیب و تنظیم تاکہ یہ ایک مربوط شکل اختیار کر سکیں۔ یہاں بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی دو شکلیں لازماً یکساں نہیں ہو سکتیں۔ غرض یہ عمل ایک دوسرے میں مِلتے جاتے ہیں جو مؤرخ تجربہ کار ہے اسے عموماً یہ احساس نہیں ہوتا کہ آخری فیصلے پر پہنچنے کے لیے کون کون سے قدم اٹھائے گئے جس طرح بیس بال کھیلنے والا مشّاق آدمی بالکل آگاہ نہیں ہوتا کہ کوئی ضرب لگانے کا فیصلہ کرنے میں الگ الگ کون سے قدم اٹھائے گئے۔ حقائق کی فراہمی کوئی نہ کوئی نظریۂ تعلّق پیشِ نظر رکھے بغیر ممکن نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ آپ حقائق کو کسی ایک شکل میں منظم نہیں کر سکتے جب تک ان کے تعلق میں کوئی نظریہ قائم نہ کر لیں گے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حقائق کی تعبیر آپ کے انتخاب کردہ نمونے کی بنا پر کی جائے گی جو آپ نے سامنے رکھ لیا ہے۔

واقعات و حقائق کی فراہمی اور تنظیم کسی ایک مؤرخ کے ضبط و نظم میں نہیں آسکتی۔ وُہ جن معلومات سے کام لیتا ہے انھیں مہیا کرنے کے ذِمّہ دار دوسرے نہیں جن پر ان کا انحصار ہے۔ کوئی عالمِ تاریخ معلومات کی فراہمی میں زیادہ آگے نہیں جا سکتا۔ یہ کام عموماً برسوں اور صدیوں سے اس کے لیے فراہم کیا جاتا رہا۔ اس کے ذمہ دار بیشتر کے عالم تھے یا وہ لوگ جو محافظ خانوں کے ناظم تھے جہاں مخطوطے اور ریکارڈ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ یا بعض کتب خانوں کے علم دوست ناظموں نے مخطوطے، دستاویزیں اور کتابیں جمع کر لیں، انھیں منظم کر کے بہ اعتبارِ اصناف الگ الگ کر لیا اور محفوظ رکھ لیا۔

---

[1]: امریکہ کا ایک مشہور مقام جہاں جولائی ۱۸۶۳ء میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کی فیصلہ کُن جنگ لڑی گئی۔

سرکاری ملازموں نے عدالتوں یا قانون ساز مجلسوں یا سفارتی ریکارڈوں کی فراہمی کا انتظام کر لیا اور بعض ایڈیٹر انھیں ایک نظم میں لے آئے۔ آپ سوچیں اور غور کریں کہ اگر دورِ حاضر کی پارلیمنٹ کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں تو آیا یہ ہنسرڈ[1] کے مباحث کے بغیر لکھی جا سکتی ہے؟ یہ بھی سوچیں اور غور کریں کہ آیا امریکہ کے دستوری نظام پر لکھنا سپریم کورٹ کی رپورٹوں کی پونے چار سو جلدوں کے بغیر ممکن ہے؟ اس سلسلے میں ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی ہزاروں جلدیں اس پر مستزاد ہیں۔ یہ بھی سوچیں کہ اگر کینیڈا میں فرانسیسیوں ٦
کی تاریخ لکھنا منظور ہو تو آیا یسوعیوں[2] کی خط و کتابت کے بغیر لکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر ٹامس جیفرسن[3] کے متعلق کچھ لکھنا منظور ہو تو آیا ان ایڈیٹروں کی محنت سے بے نیاز ہو کر لکھا جا سکتا ہے جنھوں نے اس کے کاغذات فراہم کیے اور اہلِ علم کے مطالعے کے لیے مہیا کر دیے۔

تعبیر کا معاملہ

اب معاملہ تعبیر کا ہے، یہ ریکارڈ کی تنظیم میں تیسرا قدم ہے جو عموماً انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن مؤرخ سے اس کے متعلق خاص توجہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ محنت سے پہلا مسئلہ یعنی معلومات کی فراہمی حل ہو سکتا ہے۔ دوسرے معاملے کے لیے صحیح قوتِ فیصلہ کارآمد ہو گی۔ اس سے مراد ہے معلومات کی ترتیب و تنظیم۔ لیکن حقائق کی ترتیب کے لیے اعلیٰ درجے کی ذہانت درکار ہے۔ دورِ حاضر میں سب سے بڑے مؤرخ وہی ہوئے جو تعبیر میں سب سے بڑے تھے۔ ان مؤرخوں نے تعبیر کے لیے ہمیشہ خاص کوششیں کیں گویا انھوں نے تاریخ کے غیر مرتب خام مواد سے کوئی نہ کوئی معنی اخذ کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ یا اس پر کسی نہ کسی فلسفے کی مہر لگا دی۔ بڑے بڑے انگریز مؤرخ مثلاً کلیرنڈن[4]، گبن، ہیوم[5]،

---

[1] : ٹامس ہنسرڈ نے ۱۸۰۳ء سے برطانوی پارلیمنٹ کی کارروائیاں چھاپنی شروع کی تھیں اور ۱۸۹۵ء کے بعد یہ کام "ٹائمز" نے سنبھال لیا۔

[2] : مسیحیوں کا ایک فرقہ جس نے کینیڈا میں بڑے زور شور سے مسیحیت کی تبلیغ کی تھی۔

[3] : امریکی مدبر (۱۷۴۳ء — ۱۸۲۶ء) — جمہوریہ امریکہ کا تیسرا صدر۔

[4] : (۱۸۰۰ء — ۱۸۷۰ء)

[5] : ۱۷۱۱ء — ۱۷۷۶ء۔

میکالے، فرُوڈ[1]، لِکی[2]، بکل[3]، فری مین[4]، میٹ لینڈ[5]، اور لارڈ ایکٹن[6] خود ہمارے زمانے میں نیمیر، بٹر فیلڈ، ڈیوڈ نولز، ویرونیکا ویج وُڈ، ڈینس بروگن اور ونسٹن چرچل[7]۔ اسی طرح فرانس میں مونتسکیو[8]، والتیر، مشلے[9]، تین[10]، تاکوے ول[11] اور آلرڈ۔ جرمنی میں نیبور[12]، رانگے[13]، فان سبل، ٹریسکے[14]، لیمپرشٹ، برک ہارٹ اور زمانۂ حال میں مائینکے اور راتھ فلیس، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں فرانسس پارک مین، موٹلے، ہنری ایڈمز، ورنان پیرنگٹن، لارنس گپسن، ایف ای مورلیسن اور ایلن نیونز۔

تعبیر حقائق کی فراہمی اور ان کی ہنرمندانہ تنظیم پر موقوف ہے۔ انتہا درجے کی محنت اور تکلیف افزا تجزیے کے بعد بھی صحیح تعبیر کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لیے صحیح قوتِ فیصلہ، جدت، تخیل اور فنکاری درکار ہے۔ اس طرح ہم تاریخ کی تیسری خصوصیت پر پہنچ جاتے ہیں، یعنی تاریخ بطورِ فن۔

آرتھر شلے سنگر جونیر لکھتا ہے:-

"فنکاری کے تمام عناصر اسی طرح تاریخ کے اجزاء ہیں جس طرح

---

۱ : ۱۸۱۸ — ۱۸۹۴ء۔
۲ : ۱۸۳۸ — ۱۹۰۳ء۔
۳ : ۱۸۲۱ — ۱۸۶۲ء۔
۴ : ۱۸۲۳ — ۱۸۹۲ء۔
۵ : ۱۸۵۰ — ۱۹۰۶ء۔
۶ : ۱۸۳۴ — ۱۹۰۲ء۔
۷ : انگلستان کی شہرۂ آفاق شخصیت۔
۸ : ۱۶۸۹ — ۱۷۵۵ء۔
۹ : ۱۷۹۸ — ۱۸۷۴ء۔
۱۰ : ۱۸۲۸ — ۱۸۹۳ء۔
۱۱ : ۱۸۰۵ — ۱۸۵۹ء۔
۱۲ : ۱۷۷۶ء — ۱۸۵۱ء۔
۱۳ : ۱۷۹۵ — ۱۸۸۶ء۔
۱۴ : ۱۸۳۴ — ۱۸۹۶ء۔

> کسی ادبی تصنیف کے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ مؤرخ کی قوتِ ایجاد پر یقیناً پابندیاں ہیں لیکن اس کی وسعتِ نظر اور بصیرت کی صلاحیت پر کوئی پابندی نہیں۔ تاریخ مکتوب حقائق کے انبار پر جمالیاتی تصوّر کی نظر ڈالنے کے سوا اور کیا ہے۔ ہر تاریخی تصنیف کا وزن اور اس کی اہمیت تصوّر کی حیثیت پر موقوف ہے۔" [1]

یہ اس بیان کی ایک اور صورت ہے کہ تاریخ ادبیات کی ایک شاخ ہے لہٰذا اس پر ادبیات کے بعض اصول کا اطلاق ضرور ہوتا ہے۔ یقیناً بہت سی تاریخی تصانیف جنھیں ہم عالی قدر تصانیف سمجھتے ہیں اور انھیں کلاسیکی دائرے میں شامل کر لیتے ہیں۔ ادبی اعتبار سے بھی ممتاز سمجھی جاتی ہیں۔

اسلوبِ تحریر کا معاملہ

ادبی تاریخ کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا اسلوبِ تحریر بہت عمدہ ہو۔ اسلوب عموماً بہت عمدہ ہوتا ہے۔ ۷
بہترین اسلوبِ تحریر وہ ہے جو سادہ، صاف اور بے لاگ ہو جیسے لنکن اور چرچل کی تصانیف سیاسیات کے دائرے میں۔ ٹریولین[2] اور بروگن کی تصانیف انگریز مؤرخوں کے دائرے میں۔ فری مین اور نیونز کی تصانیف امریکی مصنفوں کے دائرے میں۔ ادبی اسلوبِ تحریر کا مطلب یہ ہے کہ بیان کا انداز عمدہ، رنگ اچھا، آہنگ بلند نیز اس میں حرکت کا پہلو ہو۔ یہ دراصل وضع و ترتیب کی ہمواری، کوشش کی مرکزیت اور تعمیری اتحاد و ہم آہنگی کا معاملہ ہوتا ہے۔ تخیّل کا رنگ اس پورے کل پر چھایا رہتا ہے۔ ادبی اسلوبِ تحریر کے ایک بہت بڑے فنکار کا بیان پڑھیے جو خود تاریخی حقائق نگاری کا استاد ہے۔ یعنی فرانسس پارک مین۔ وہ ہماری توجہ فرانسیسی امریکی تاریخ کے بعض معمّوں کی طرف مبذول کراتا ہُوا لکھتا ہے:-

> "فرانسیسی حکمرانی گزرے ہوئے زمانے کی یادگار ہے۔ جب ہم اس کے بچھڑے ہوئے سایے ذہنوں میں تازہ کرتے ہیں تو یہ سایے اپنی قبروں سے عجیب و غریب رومانی لباس پہن کر اٹھتے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کیمپوں میں آگ جل رہی ہے۔ جھلملاتی روشنی،

---

[1]: "دی ہسٹارین ایز آرٹسٹ" (مؤرخ بطور فنکار)

[2]: ۱۸۳۸ء - ۱۹۲۸ء۔

آقا و غلام اور سیاہ پوشس پادری کے چہروں پر یکساں پڑتی ہے جو وحشی جنگجوؤں میں ملے جلے ہیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہے۔ پھر ہمارے سامنے ایک لامحدود منظر پیدا ہوتا ہے۔ ایک وسیع برّ اعظم ہے جسے ابھی تک انسان اپنے قابو میں نہیں لاسکا۔ وسیع جنگلوں کی ہریاول ہے۔ پہاڑ اپنی ابتدائی نیند میں خاموش لیٹے ہوئے ہیں۔ دریا ہیں۔ جھیلیں ہیں۔ جھلملاتے چشمے ہیں۔ وسیع سمندر ہیں جو آسمان کے ساتھ مل رہے ہیں۔ یہ وسیع خطّے فرانس نے تہذیب کے لیے مسخر کیے تھے۔ آہنی ٹوپیاں جن کے اوپر پر لگے ہوئے ہیں جنگلوں کے سایے میں چمک رہی ہیں۔ پادریوں کے لباس غاروں اور قدیم بربریّت کے حصاروں میں نظر آرہے ہیں۔ ہمیں ایسے آدمی نظر آرہے ہیں جن کے رجحانات قدیم وضع کے ہیں۔ وہ خانقاہوں کے تنگ حجروں میں رہنے کے باعث زرد پڑ گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی دوپہریں اور شامیں یہیں بسر کی ہیں۔ وہ وحشیوں پر پدرانہ شفقت اور نرمی سے حکومت کرتے تھے۔ جب موت انتہائی بری حالت میں ان کے سامنے آتی تو ان کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار نہ ہوتی۔ وہ درباروں کی فضا میں پیدا ہوئے ان کے نسب نامے تہذیب میں بہت دُور تک جاتے تھے۔ یہاں انھوں نے اتنی شدتیں اور سختیاں برداشت کیں کہ یہاں کے سخت جان فرزند بھی ان کے سامنے شرماتے تھے۔" [1]

درست اور منصفانہ

یہ بالکل درست ہے کہ جب تک تاریخ معقول حد تک درست اور مبنی بر انصاف نہ ہوگی اسے پڑھنا نہ چاہیے۔ اس طرح یہ بھی درست ہے کہ جب تک تاریخ کا اسلوب تحریر اچھا نہ ہوگا اسے پڑھا نہ جائے گا۔

ایلین نیونز خود ایک مشّاق ادبی تاریخ نگار ہے، وہ لکھتا ہے :-

" دنیا بہ حیثیتِ مجموعی سائنٹفک الجماد کا فقدان نظرانداز کر

---

[1]: " پائنیرز آف فرانس اِن دی نیو ورلڈ " (نئی دنیا میں فرانس کے علمدار)

دے گی۔ مگر تحریر کے ادبی لُطف کا فقدان کبھی گوارا نہ کرے گی۔ تاریخ میں اور ہر تصنیف میں سب سے بڑا محافظ اسلوبِ تحریر ہے۔ جس کتاب کا اسلوبِ تحریر ہر اعتبار سے بے داغ ہوگا اس میں تاریخ کے بعض غیر مناسب حصّے آسکتے ہیں لیکن وہ نسلاً بعد نسلٍ برابر پڑھی جائے گی۔ یہ احتیاج بالکل بے سُود ہے کہ لارڈ کلیرنڈن انگریزی خانہ جنگی کے بیان میں بہت جانبدار ہے۔ بہ ایں ہمہ اس کی کتاب صدیوں تک پڑھی جائے گی۔ صرف اس لیے کہ اس کا اسلوبِ تحریر پُر مغز و پُر معنی ما قلّ و دلّ اور فصیحانہ ہے۔ اس میں انسانوں اور وقائع کی نہایت عمدہ تصویریں ہیں۔ موٹلے نیدر لینڈز میں ہسپانیہ کی بدنظمی کے بارے میں کچھ زیادہ معقول پہلو اختیار نہیں کرتا لیکن دنیا موٹلے کی کتاب ضرور پڑھتی جائے گی۔ اگر کسی مؤرخ کو انتخاب پر مجبور کر دیا جائے گا تو شہرت اسے اعلیٰ درجے کا اسلوبِ تحریر انتخاب کر لینے پر مائل کرے گی۔ ارسطو کا ذہن و دماغ وہ قبول نہ کرے گا۔ وہ اپالو دیوتا کو چُنے گا۔ ہنزدا کو نہ چُنے گا۔ یا وہ دونوں کو چُن سکتا ہے۔"[1]

جسٹس ہومز کہا کرتا تھا کہ زندگی تصویر کشی ہے، حساب کی کسی رقم کا جمع کر لینا نہیں۔ اسی طرح ہم ۸
کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ نگاری تصویر کشی ہے فوٹوگرافی نہیں۔ فوٹوگراف دے دینا کافی نہیں۔ بریڈی کا فوٹوگراف بھی وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو گویا[2] کی تصویر پیدا کر سکتی ہے مثلاً "قتل" کی تصویر۔ اعداد و شمار جمع کرنا کافی نہیں۔ اگر یہی کافی ہوتا تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر سال اعداد و شمار کا جو مرقع چھپتا ہے، وہ تاریخ کی بہترین جلد ہوتا۔ تاریخی اور مجلسی جزئیات کے پہاڑ فراہم کر لینا کافی نہیں اگر ایسا ہوتا تو تمام اخباروں کا فراہم کردہ سرمایۂ معلومات تاریخ کا بدل بن سکتا۔ مختلف کہانیوں اور وقائع کی لڑیاں اکٹھا کر لینا کافی نہیں۔ اگرچہ وہ کتنی ہی ڈرامائی ہوں۔ مصوّر رسالے یہ کام بڑی حسن و خوبی سے انجام دیتے ہیں۔ بلاشبہ تاریخ اعداد و شمار ہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں تفصیلات بھی شامل ہونی چاہییں۔ ڈرامائی حصّے بھی آنے چاہییں، لیکن یہ تمام اجزا اور تمام عناصر اس طریق پر ضبط و نظم میں لانے چاہییں جیسے فنکار اپنے موضوع کے اجزا اور سر و سامان کے عناصر ضبط میں رکھتا ہے۔ ان پر پورا قابو پاتا ہے۔ ان کی معنویت پر غور کرتا ہے اور اس کا تخیّل ان سب پر چھایا رہتا ہے۔

---

[1]: "دی گیٹ وے ٹو ہسٹری" (باب تاریخ)

[2]: ایک ہسپانوی مصوّر (۱۷۴۶ء — ۱۸۲۸ء)

ہمیں یہ بھی ہر وقت یاد رکھنا چاہیے کہ ادبی تاریخ یا تاریخ بطورِ ادب محض اسلوبِ تحریر کا معاملہ نہیں۔ یہ کافی نہیں کہ الفاظ نہایت خوبصورت، جملے اور تراکیب نہایت دل آویز، فقرے بڑے شاندار اور جابجا ڈرامائی فنکاری کا اظہار ہوں۔ کوئی مؤرخ خود بخود ادبیت کے مکتب میں شامل نہیں ہو جاتا جب وہ اچھے انداز میں لکھتا ہے۔ اور جب اس کا انداز چنداں دلچسپ نہیں ہوتا تو اس لیے وہ ادبی مکتب سے خارج نہیں ہو جاتا۔ ادبی تاریخ اسلوبِ تحریر سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ دراصل ایک گونہ فلسفے کا مسئلہ ہے۔

ادبی مؤرخ اصلاً ماضی کو از سرِ نو پیشِ نظر لانے کا خواہاں ہوتا ہے گویا ایک اعتبار سے اسے مصوّر سمجھنا چاہیے۔ کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ ریمبرانٹ[۱]، گویا، تونگھی، کینا لیٹو[۲]، رینالڈز[۳] یا جارج کاٹلن کو مؤرخوں میں جگہ نہ دی جائے گی۔ شیکسپیئر[۴] ایک لحاظ سے یقیناً ڈرامانگار ہے۔ لیکن اسے یا مولیار[۵] یا ہال برگ کو مؤرخ قرار دینے میں کون تامّل کرے گا؟ ادبی مؤرخ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر ایک ایسی چیز ذہن میں از سرِ نو تازہ کرتا ہے جو کسی زمانے میں حقیقتہً موجود تھی مگر اب باقی نہیں رہی۔ وہ دیکھنے والے تخیل میں ہیجان پیدا کرتا ہے تاکہ وہ ماضی کو اس کی (مؤرخ کی) آنکھ سے دیکھ لے۔ مصوّر اور ڈرامانگار کی طرح مؤرخ ایک لمحے کے لیے ایک نہایت پیارا، مشہور اور شاندار منظر سامنے لے آتا ہے۔ ایک ایسی تصویر کھینچتا ہے جو بالکل متعارف معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایسی ہی مثال ہے جیسے موٹلے، ہمیں فلپ دوم فرمانروائے ہسپانیہ کے مرنے کے وقت اس کے پلنگ کے پاس لے جاتا ہے۔ اسی طرح پریس کاٹ دیکھنے والوں کے سامنے وہ منظر لے آتا ہے جب ہسپانویوں نے ازٹکوں کے بادشاہ کے شہر پر حملہ کیا تھا۔ مثلاً جب دوشیزۂ اورلیانز[۶] کے جلائے جانے کا درد انگیز منظر پیش کرتا ہے، تو پڑھنے والے بے اختیار گھٹنوں کے بل جھک جاتے ہیں۔ کارلائل

---

۱ : ولندیزی مصوّر (۱۶۰۶ء - ۱۶۶۹ء)

۲ : اطالوی مصوّر (۱۶۹۷ء - ۱۷۶۸ء)

۳ : ۱۷۲۳ء - ۱۷۹۲ء

۴ : مشہور عالم انگریز ڈرامانگار (۱۵۶۴ء - ۱۶۱۶ء)

۵ : فرانسیسی ڈرامانگار (۱۶۲۲ء - ۱۶۷۳ء)

۶ : یعنی جون آف آرک (۱۴۱۲ء - ۱۴۳۱ء) فرانس کی ایک دوشیزہ جس نے انگلستان و فرانس کی جنگ میں محض ایک حملے سے پانسہ پلٹ دیا اور انگریز فرانس سے نکل گئے۔ اس دوشیزہ کو انگریزوں نے گرفتار کر کے جلا دیا تھا۔

جب فریڈرک[1] کی مشہور جنگ روسباخ[2] کی گرم جوشی کا ذکر کرتا ہے تو پڑھنے والے بھی اس میں پوری طرح شریک ہو جاتے ہیں۔

سائنٹفک مؤرخ

یہ تمام باتیں سائنٹفک مؤرخ کے حقیقت پسندانہ مقاصد سے بہت دُور ہیں۔ یعنی ادبی اور
سائنٹفک تاریخ کے درمیان جو خلا ہے وہ محض اسلوبِ تحریر کا نہیں بلکہ زیادہ گہرا ہے اور زیادہ 9
بنیادی ہے۔ یہ فلسفۂ تاریخ کا اختلاف ہے۔ سائنٹفک مؤرخ کو دراصل ماضی کی یاد تازہ کرنا بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتا وہ کتاب پڑھنے والے کے تخیّل کو ابھارنے کے لیے زحمت نہیں اٹھاتا بلکہ وہ ڈرامائی یا مصوّرانہ معاملات سے دُور بھاگتا ہے۔ وہ تخیّل کو نہیں عقل کو ابھارنا چاہتا ہے۔ وہ ماضی کو تازہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی وضاحت پیش کرتا ہے مثلاً ایک بہت ٹیکنیکل مؤرخ فریڈرک میٹ لینڈ وُہ شخص ہے جس نے محافظ خانوں کی گرد کو سونا بنا دیا۔ یا ہیسٹنگز ریشڈل نے زمانۂ وسطیٰ کی یونیورسٹی کو معاصرانہ یونیورسٹی بنا دیا۔ یا نولز اور موریسن کا اندازِ تحریر ایسا ہے جس میں موسیقی بھی ہے اور پرداز بھی لیکن ان کا اصل مدعا تخیّل کو برانگیختہ کرنا نہیں بلکہ مسئلے حل کرنا ہے۔ انصاف کے جن آئینوں پر لارڈ کوک نے انحصار رکھا کیا وہ حقیقی تھے؟ سینٹ برنارڈ[3] نے کلونیوں[4] پر کیوں کر فتح پائی؟ دورِ وسطیٰ کے بولونا[5] اور پاڈوآ[6] کے طلبہ نے کیوں قومیں منظم کیں؟ کیا پیوریٹن[7] واقعی موسیقی اور فنونِ لطیفہ کے مخالف تھے؟ یہ اور اس قسم کے تمام مسائل ہمارے ہر مؤرخ نے حل کیے حالانکہ ان کا

---

[1] : (۱۱۲۴ھ – ۱۲۰۰ھ / ۱۷۱۲ء – ۱۷۸۶ء) پروشیا کا بادشاہ جسے فریڈرک اعظم کہتے ہیں۔

[2] : ایک میدانِ جنگ جس میں فریڈرک نے جرمنی اور فرانس کی فوجوں کو شکست دی۔

[3] : (۴۸۴ھ – ۵۴۸ھ / ۱۰۹۱ء – ۱۱۵۳ء) اسے مسیحیت میں بلند مقام حاصل تھا۔ اس نے دوسری صلیبی جنگ کے لیے بڑا کام کیا۔

[4] : کلونی – فرانس کا ایک قصبہ، جہاں راہبوں کی ایک مشہور خانقاہ بن گئی تھی۔ اور یہاں کے کلیسا کو مسیحیت میں بلند مقام حاصل تھا۔

[5] : اٹلی کا ایک قصبہ جہاں یونیورسٹی تھی۔

[6] : یہ بھی اٹلی کا ایک قصبہ ہے جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے کے لیے آتے تھے۔

[7] : مسیحیوں کا ایک فرقہ جو ان تمام تحریفوں کے خلاف تھے جو بائبل میں کی گئی تھیں اور خالص بائبل کے احکام کے پابند تھے۔

اسلوبِ تحریر بھی بڑا اچھا تھا لیکن ان کے پیشِ نظر مسائل کا حل تھا نہ کہ لُطفِ تحریر۔

آئیے ہم یہ دیکھیں کہ دو ممتاز مؤرخ ایک ادبی اور دوسرا سائنٹفک ایک صورتِ حال کو کس انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہ وین وائک بروکس ہے جو امریکی مؤرخوں میں سب سے زیادہ جذبات کو اُبھارنے والا ہے۔ ہمارے سامنے نتھانیل ہاتھورن[۱] کی تصویر اُبھارتا ہے اور اس کے سامنے نئے انگلستان کے پیوریٹن کی تصویر رونما ہوتی ہے۔

کیا ہاتھورن اس احساس میں حق بجانب تھا کہ مصنّف کو اپنی تصویر میں حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے مقامی ہوا اور فضا کی ضرورت ہے۔ روما نے اس کی آخری رومانی داستان کے لیے بہترین ماحول مہیا کر دیا تھا یعنی ہلڈا، مریم اور ڈوناٹیلو کی کہانی جو اس نے سب سے آخر میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی۔ دُھندلے سے رنگ کی مریم ماضی کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی اور مغربی جنگل کا نازک شقائق النعمان معلوم ہوتی تھی۔ امریکی دوشیزاؤں، جنگلی دیویوں اور روحانی شکلوں کا رقص ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے پمپی[۲] کی دیواروں پر تصویریں بنی ہوئی ہیں یا یونان کے کسی خاکدان پر کوئی چیز غیر متحرک بنا دی گئی ہے۔ اس پر رال کی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے سایوں کی دنیا میں بعد دوپہر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان پوسن[۳] کی ساحرانہ اور اساطیرانہ دلربائی کے جھنڈ حرکت کرتے ہوئے نظر میں سما گئے۔ ہوا کا بربط وقتاً فوقتاً بج رہا تھا، اور اس کی گہرائیوں سے ہگنان[۴] کا گیت سُنا جا رہا تھا۔ ہاتھورن نے روما کی فضا سے سحر حاصل کیا تھا لیکن اس سحر کے باوجود جو "ماربل فان" میں صرف کیا۔ "سکارلٹ لیٹر" یا "ہاؤس آف دی سیون گیبلز"[۵] کے برابر نہ تھا۔ بہت سے جلاوطنوں کی ثعلبی زندگی دل میں بے اعتمادی پیدا کر

---

۱ : امریکی مصنّف (۱۸۰۴ء - ۱۸۶۴ء)

۲ : اٹلی کا ایک شہر جو ویسو ویس کے پھٹنے سے تباہ ہو گیا تھا اور اب اس کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔

۳ : فرانسیسی مصوّر (۱۵۹۴ء - ۱۶۶۵ء)

۴ : مشہور موسیقار۔

۵ : تینوں ہاتھورن کی کتابیں ہیں۔

رہی تھی۔ رومی باغوں میں سرو اور شاہ بلوط کے زیرِ سایہ جی چاہتا تھا کہ انسان ہمیشہ خواب دیکھتا رہے اور اس کے ذہنی اعصاب سُست پڑ جائیں۔ نارٹن کا مجلسی شعور بہت تیز تھا۔ اس کا احساس جگہ جگہ بیدار رہتا تھا۔ اس نے اطالوی زندگی کی سطح کے نیچے بھی پہنچ کر دیکھا کہ وہاں سیاسی نظام کی گھٹن لوگوں کو پریشان کر رہی تھی۔ اس نے خود مشاہدہ کر لیا تھا کہ پیٹرارچ [1] دانتے [2]، اور ایلفری [3] کو کیا غم تھا جو اپنے ملک اور اس کی افتادگی کا ماتم کرتے رہے۔ نارٹن کی انتقادی صلاحیتیں بیدار تھیں۔ اس نے پرانی رومانی کتابوں کو جو رہنمائی کے لیے لکھی گئی تھیں، مذاق کا ہدف بنایا۔ یہی سلوک جرمن مصوّروں کی ان نمایشی تصویروں کے ساتھ کیا جو دورِ حاضر کے روما میں سب پر چھائے ہوئے تھے۔ اسے اطالوی زندگی کی حقیقتوں کی تلاش تھی جیسے اس سے پیشتر گرینو [4] اور مارگرٹ فلر [5] کو تلاش تھی۔ دوسرے لوگوں کو ایسی کوئی تلاش نہ تھی۔ وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ زندگی کی بے لطفیوں سے بچ نکلیں چنانچہ امریکہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اگر ان کی تحریروں میں گرفت باقی نہ رہی اور ان کا کوئی پیندا محسوس نہیں ہوتا تو کیا اس کی وجہ یہی نہیں جس کی تشریح یہاں کی گئی ہے۔" [6]

میتھی سن کی تعبیر

اب ملاحظہ فرمائیے کہ فرانسس میتھی سن نے اپنی کتاب "امریکہ میں احیائے علوم" میں اس کے متعلق کتنی عمدہ تعبیر پیش کی ہے:-

"بروک کے تاثر کا خطرہ اس نصف پیراگراف میں بہت نمایاں ہے

---

[1] : اٹلی کا مشہور شاعر (۱۳۰۴ء - ۱۳۷۴ء)

[2] : ڈیوائن کامیڈی (طربیۂ آسمانی) کا مشہور مصنف۔ (۱۲۶۵ء - ۱۳۲۱ء)

[3] : اطالوی ڈراما نگار (۱۷۴۹ء - ۱۸۰۳ء)

[4] : امریکی مجسّمہ ساز (۱۸۰۵ء - ۱۸۵۲ء)

[5] : (۱۸۱۶ء - ۱۸۵۰ء)

[6] : "دی فلاورنگ آف نیُو انگلینڈ"

.... جو اس نے ماربل فان کے لیے وقف کیا ہے۔ جب اس نے کہا کہ ہاتھورن کے لیے روما میں بڑا اچھا ماحول مہیا ہو گیا تھا پھر اس نے دُھندلی سی مریم کا ذکر کیا جو ماضی کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی ساتھ ہی مغربی جنگل کے نازک شقائق النعمان کا ذکر کر دیا حالانکہ جس پھول کا ذکر اس نے کیا ہے اسے ہاتھورن کے تلخ پھل سے کوئی تعلق نہیں .... اپنی توجہ اس معاملے کی طرف منعطف کرنے سے وہ اصل تصنیف کو نظر انداز کر گیا اس نے ہمارے چند بڑے فنکاروں میں سے ایک کو مردمی اور توانائی سے محروم کر دیا اور ہمیں بتایا کہ وہ حقیقتہً ویسے اہم معاملات میں منہمک نہ تھا جن کا حل اس نے پیش کیا۔ ہاتھورن کی تمام ہیروئنوں میں سے مریم دل پر جو اثر چھوڑتی ہے وہ اس نزاکت سے عاری ہے جس کا ذکر بروکس نے کیا ہے .... وہ جھٹ کلیوپیٹرا[1] کے اس مجسمے کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گئی جو کینین نے بنایا تھا اور اس کے احساسات ایسے ہیں، جیسے وہ نہایت تند و تلخ اور خلل انگیز اوصاف کا مظاہرہ کرنے والی ہے .... مریم ایک مبہم جرم کے پس منظر میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے ہاتھورن کے کسی دوسرے کردار کی یہ کیفیت نہیں اور اس نے یہ کیفیت پیش کرنے کی جو ٹیکنیک اختیار کی وہ بڑی دردناک ہے کیونکہ یہ براہ راست جیمز اور ایلیٹ کی طرف لے جاتی ہے۔"

یہاں جو اختلاف بروئے کار آیا وہ ماہیت تاریخ کے مسئلے کی تہ تک پہنچا دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ادبی مؤرخ کیوں ماضی کو تاریکی کے سمندر سے نکال کر سطح پر لاتا اور از سر نو زندہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ اسے صرف ماضی سے، صرف ماضی کی حیثیت میں دلچسپی ہے۔ وہ ان واقعات میں ڈرامائی کیفیتوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اسے منظر اور پُرشکوہ جلوسوں سے دل بستگی ہے۔ اس کے زنانہ و مردانہ کرداروں سے خاص تعلق ہے۔ جارج میکالے ٹریویلین نے اسی کا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"ماضی کا سب سے بڑا سبق اور تاریخ کا اعلیٰ ترین موضوع انسان کا ارتقا نہیں بلکہ وہ ہے جو کچھ اس نے حاصل کیا۔"

---

[1]: مصر کی شہرہ آفاق ملکہ۔ (۶۹ قبل مسیح - ۳۰ قبل مسیح)

سائنٹفک مؤرخ کو تاریخ سے اس کی خاطر کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تاریخ کا مطالعہ اس لیے کرتا ہے کہ اسے ارتقائی عمل کا ایک جزو سمجھتا ہے۔ یہی عمل اس کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ ہربرٹ بٹرفیلڈ کے الفاظ میں اس کی روش یہ ہے کہ :

> "صرف وہی چیزیں توجہ کے لائق ہیں جو صرف اس لیے اہمیت حاصل کرتی ہیں کہ انھوں نے ہمیں دوسری چیزوں پر پہنچایا ہے۔"

ایک اچھے سائنس دان کی طرح ٹیکنیکل مؤرخ مسائل حل کرنا چاہتا ہے۔

اگر سائنٹفک مؤرخ نے تاریخ کے مختلف عملیات کو نمایاں کیا ہے تو ادبی مؤرخ نے اس کے ۱۱
حدود بہت پھیلا دیے ہیں کیونکہ اگر ہم ماضی کو از سرِ نو تازہ کرنا چاہتے ہیں تو محض اس کے ڈرامے اور بہادریاں ہی نہیں بلکہ روزانہ کی سادہ چیزیں ہی تازہ ہو جائیں گی اور ہم انھیں نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یقیناً اوّل تاریخ نگار ڈرامائی کیفیتوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ یہ حقیقت آپ پر پرلیں کاٹ یا موٹلے یا ہمارے عہد میں گو یڈلا لے اور راؤزی سے واضح ہو سکتی ہے۔ کارلائل بھی ڈرامائی چیزوں کی طرف خود بخود کھنچ جاتا تھا لیکن ایک صدی پہلے اس نے ہمیں متنبہ کر دیا تھا۔ وہ کہتا ہے :-

> "یہ دیکھنا قابلِ رنج ہے کہ جسے تاریخ کہا جا سکتا ہے، وہ ان روشن اور منوّر زمانوں میں بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی۔ کیا آپ اس سے .... اس بڑے سوال کے جواب میں دھندلا سا سایہ بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ آدمی کیوں کر جیتے تھے اور اپنے وجود کیوں کر قائم رکھتے ہیں یا کیا اقتصادی نقطۂ نگاہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ انھیں کیا اجرتیں ملتی تھیں اور وہ اپنے ساتھ کیا لاتے تھے؟"

کارلائل نے یہ بتانے کی کوشش کی اور یہی کام اس کے معاصر جان گرین [2] نے انجام دیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈین ٹرولز لنڈ [3] اور کارل لیمپرشٹ اور فرانس کے ایلی ہلیوے نے انجام دیا۔ امریکہ کے جان میک ماسٹر کی روش بھی یہی تھی اگرچہ اس کا انداز بھدا تھا۔ لیکن ہم آغاز کی طرح انجام میں بھی یہی کہتے ہیں کہ ادبی تاریخ عمدہ اسلوبِ تحریر کا معاملہ نہیں بلکہ یہ ذہنی اور تاریخی اعتبار سے

---

۱ : انگریز مصنف (۱۸۵۹ء - ۱۹۴۴ء)

۲ : مشہور انگریز مؤرخ (۱۸۳۷ء - ۱۸۸۳ء)

۳ : ڈنمارک کا مؤرخ۔

مرکز کشش کا معاملہ ہے۔

تاریخ فن اور فلسفے کی حیثیت میں

تاریخ فن ہے۔ تاریخ فلسفہ بھی ہے۔ لارڈ بالنگ بروک[۱] نے ایک مستقل بات کہہ دی کہ زمانۂ ماضی کے متعلق لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ ایک فلسفہ ہے جو مثالوں کے ذریعے سے تعلیم دیتا ہے۔ بڑے بڑے مؤرخوں کی رائے بھی یہی ہے۔ تھیوسی ڈائڈز سے ٹائن بی تک سب اسی رائے کے ہیں۔ عہد نامۂ قدیم کی کہانیوں میں بھی تاریخ فلسفہ ہی تھی۔ تھیوسی ڈائڈز پولیبیس، پلوٹارک، لوی اور ٹیسی ٹس کے نزدیک بھی یہ فلسفہ یہی ہے۔ دورِ حاضر کے اکثر مؤرخوں نے بھی بالنگ بروک کا یہ مقولہ تسلیم کر لیا۔ مونتسکو نے "سپرٹ آف دی لاز" میں نیز "دی گرینڈیر اینڈ ڈی کیڈنس آف روم" میں والٹیر نے "ایج آف لوئی دی فورٹینتھ" میں گبن نے "دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر" میں ایبی رینل نے اپنی کئی جلدوں کی کتاب "ہسٹری آف دی انڈیز" میں۔ یہ کتاب حقیقتہً کلیسا اور سلطنت کے خلاف آلۂ جنگ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ سب سے آخر میں ڈیوڈ ہیوم نے "ہسٹری آف انگلینڈ" میں۔ زمانۂ حال ہی میں مؤرخوں نے تاریخ کے اس روایتی وظیفے کو چھوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ فلسفہ سامنے کے دروازے سے نکلا اور پچھلے دروازے سے پھر آہستہ آہستہ اندر گھس آیا۔ قارئین کو تاریخ کے ساتھ فلسفے کی طلب ہے اور یہ کوئی اتفاقی سانحہ نہیں کہ ہمارے زمانے کے پسندیدہ عوام مؤرخ تاریخ فلسفے ہی کی حیثیت میں لکھتے رہے ہیں مثلاً ایچ۔ جی ویلز[۲]، چرچل، ٹائن بی، جارج برینڈس، آسولڈ شپینگلر[۳]، بینی ڈیٹو کروچے، آنڈری مالرا، سالواڈور ڈی میڈری آگا اور ریمنڈ آرون۔

لیکن رسمی اعتبار سے بہت کم مؤرخ فلسفی ہوئے ہیں ان میں سے اکثر کا انحصار تاریخ پر رہا ہے۔ وہ سادہ سے اخلاقی سبق دیتے رہے ہیں۔ مثلاً مسیحیت کی برتری دوسرے مذاہب پر۔ 12
بے وفائی کے خطرات، بدی پر نیکی کی فتح، مذہبی ناروا داری کی بے حقیقتی، بادشاہوں کی برائیاں، انسان کی بدعملی، انسانی جذبات پر پابندیوں کی ضرورت، سلطنتوں کا عروج و زوال اور اس کے اسباب۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے سبق سادہ اور عام فہم بھی ہیں اور مشتبہ بھی۔

---

۱ : (۱۶۷۸ء — ۱۷۵۱ء)

۲ : انگریز مصنف (۱۸۶۶ء — ۱۹۴۶ء)

۳ : جرمن مصنف (۱۸۸۰ء — ۱۹۳۶ء)

اعترافِ حقیقت

بہر حال کوئی بھی سنجیدگی کے ساتھ اس دعوے سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ تاریخ داستان بھی ہے، ریکارڈ بھی، ادب بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ سوال یہ ہے کہ تاریخ کے اس دعوے کے متعلق کیا کہا جائے جو اس کے بعض بہت ہی سحرزدہ شاگردوں نے پیش کیا ہے یعنی یہ کہ تاریخ سائنس ہے۔ بلاشبہ تاریخ کو عموماً اس ڈھیلی ڈھالی اصطلاح میں شامل کیا جاتا ہے جسے "معاشرتی علوم" کہتے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ اس اصطلاح کا مطلب حقیقتہً کیا ہے؟ آیا معاشرتی علوم واقعی سائنسیں ہیں۔ یا یہاں سائنس کا مطلب محض علم ہے۔

وہ عہدِ وکٹوریا کے مؤرخ تھے جنھوں نے سب سے پہلے تاریخ کو سائنس قرار دیا۔ اس عہد کے لوگوں کو اپنی صلاحیت پر اتنا بھروسا تھا کہ انسان کی سائنس بھی پیدا کر لیں گے اور اسی میں معاشرے، اقتصادیات، سیاسیات، قانون اور تاریخ کی سائنس بھی تخلیق کر لیں گے۔ ٹامس بکل کو یقین تھا کہ میں نے تاریخ کو ایک سائنس کی منزل پر پہنچا دیا ہے کیونکہ میں اسے ایک آفاقی اور غیر متبدل باقاعدگی کی شاندار اصل پر لے آیا ہوں جسے قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ رود بار پار یعنی فرانس میں آگوسٹ کونٹ[۱] نے اعلان کیا کہ اب تاریخ پر پہلی مرتبہ منظم انداز میں غور کیا گیا ہے اور دوسرے مظاہر کی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بھی غیر متبدل قوانین کے طابع ہے۔ گزشتہ صدی کے موڑ پر کیمبرج یونیورسٹی کے دو پروفیسروں لارڈ ایکٹن اور جے۔ وی بری نے کہا کہ اگر تاریخ نے اب تک سائنس کا درجہ حاصل نہیں کیا تو لازماً یہ آگے چل کر سائنس بن جائے گی۔ اب کوئی بڑے سے بڑا پروفیسر بھی اس اعتماد سے بات نہیں کرتا لیکن تاریخ کو سائنس سمجھنے اور کہنے کی عادت ذہنوں میں بسی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ تاریخ ان معنی میں سائنس نہیں جن معنی میں علمِ کیمیا یا حیاتیات سائنس ہیں۔ تاریخی مواد سائنٹفک تجربات کے لیے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے تجربات دُہرائے نہیں جا سکتے۔ یہ اپنے مواد کو ضبط و نظم میں نہیں رکھ سکتا۔ ان کوتاہیوں کے پیشِ نظر یہی کہا جائے گا کہ تاریخ سائنس کے لفظ کی افادی حیثیت کے اعتبار سے سائنس نہیں۔ تاہم ظاہر ہے کہ تاریخ میں سائنس کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یا استعمال کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں یعنی یہاں بھی ان تمام چیزوں کی آزمائش کی جاتی ہے جن کی آزمائش کی جا سکتی ہے اور جو چیز کھری ثابت ہوتی ہے اسے قائم رکھا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تاریخ چیزوں کی آزمائش کیوں کر کرتی ہے؟ اس کے ہاں آزمائش کی ٹیکنیک

---

[۱]: فرانس کا مشہور فلسفی (۱۷۹۳ - ۱۸۵۷ء)

کیا ہے ؟ کیوں کر معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش حقیقت پر پہنچ چکی ہے، یا تمام حقائق ایک صف میں آگئے ہیں ؟ کیمیا داں ان کیمیائی اجزا میں اپنی شخصیت یا معتقدات یا رجحانات شامل نہیں کر دیتا۔ جنھیں تجربات کے لیے استعمال کرتا ہے، مگر مؤرخ اپنے مواد کو ان اجنبی اجزا سے پاک کیونکر رکھتا ہے ؟
۱۳ حقیقت یہ ہے کہ آیا تاریخ میں سائنٹفک طریقے کی اصطلاح کے وہی معنی ہیں جو علوم قطعیہ میں مانے جاتے ہیں یا کیا اس کی جگہ زیادہ حقیقت پسندانہ اصطلاح استعمال کرنی چاہیے مثلاً انتقادی طریقہ۔ اور کیا سائنٹفک تاریخ کو ٹیکنیکل تاریخ کہنا چاہیے ؟

ایک قدم آگے بڑھائیں تو ایک اور مرحلہ سامنے آتا ہے کہ سائنٹفک طریقے کا صحیح استعمال تاریخ کے صرف ابتدائی دائرے میں کیا جا سکتا ہے، حقیقی اساسی دائرے میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ثابت کر سکتے ہیں یعنی سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے کہ جان ولکس بوتھ نے صدر لنکن [1] کو واشنگٹن کے فورڈ تھیٹر میں ۱۴۔ اپریل ۱۸۶۵ء کی رات میں قتل کیا۔

یہ بالکل درست ہے۔ لیکن آگے کیا ؟

اِس سے آگے ہماری سائنس ہمیں نہیں لے جاتی، یعنی :

بوتھ نے کیوں یہ قدم اٹھایا ؟

کون اور کیوں اس فعل کا ذمّہ دار تھا ؟

اس کے نتیجے کیا برآمد ہُوئے ؟

یہی حقیقتہً دلچسپ سوالات ہیں اور سائنٹفک طریقے پر ان کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ صحیح یہ ہے کہ ان کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔

سائنٹفک طریقے کے دعوے سے مایوس ہو کر دورِ حاضر کے بعض مؤرخوں نے ٹیکنیکل تاریخ پر جم جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ اصطلاح کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ہربرٹ بٹر فیلڈ نے ایجاد کی تھی۔ ہمیں زیادہ بلند پروازی سے کام نہ لینا چاہیے۔ بہتر یہی نظر آتا ہے کہ تاریخ کے لیے قوانین مرتّب کرنا مناسب نہ ہوگا اور ہمیں سائنس کا لبادہ نہ اوڑھنا چاہیے۔

بہتر یہ ہے کہ ماہر حیاتیات یا ماہر لسانیات کی طرح ایک ایک مسئلہ الگ الگ لیں اور اس کا فیصلہ کرتے چلیں۔ مناسب یہ ہے کہ جتنا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ لیں اتنا ہی اچھا ہوگا۔

---

[1] : (۱۸۰۹ء – ۱۸۶۵ء) امریکہ کا نہایت مشہور صدر جس کے عہد میں غلامی کے مسئلے پر شمالی اور جنوبی ریاستوں میں جنگ ہوئی اور شمالی ریاستوں نے کامیابی حاصل کی۔ لنکن ایک تھیٹر میں بوتھ کے ہاتھوں مارا گیا۔

اگر زیادہ سے زیادہ مؤرخین ان تھک طریق پر زیادہ سے زیادہ مسائل حل کرلیں تو ہم ایسی پختہ بُنیاد پر پہنچ جائیں گے جن پر آئندہ تاریخ نگار تاریخ کی شاندار عمارت استوار کرسکیں گے۔

ٹیکنیکل تاریخ

ٹیکنیکل تاریخ میں بدنمائی کے جو پہلو ہیں ان سے لوگ خاصے متعارف ہو چکے ہیں۔ اس انداز کے تاریخ نگار ڈرامائی انداز سے دُور بھاگتے ہیں اور تاریخ کو کیمیائی انداز میں حل کرلینا چاہتے ہیں۔ گویا اس کی نشو ونما تھوڑی دیر کے لیے رُک گئی ہے۔ وہ اس کا تجزیہ کرنے کے درپے ہیں۔ غرض اس کی حیثیتِ داستان سرائی نظر انداز کردی جاتی ہے اور مسائل سامنے رکھ لیے جاتے ہیں، اگرچہ یقین نہیں ہوتا کہ کوئی مسئلہ قطعی طور پر حل ہو جائے گا۔

ٹیکنیکل تاریخ میں تعمیمات کو ٹھکرایا جاتا ہے اور قوانین سے گریز اختیار کیا جاتا ہے۔ صرف چھوٹی چھوٹی اور مختص چیزوں کو پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اور ایک ایسے رسالے کی شکل اختیار کرلی جاتی ہے جو کسی موضوع سے مختص ہو۔ اسے افکار یا افراد سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انھیں اصل موضوع سے انحرافات سمجھا جاتا ہے۔ اگر تاریخ کے تصوّر میں ادبیّت شامل کی جائے، تو اسے گوارا نہیں کیا جاتا اور تاریخ کو فلسفے کی حیثیت میں یک قلم رد کردیا جاتا ہے۔ ایک علم دوست ذہن و فکر کے لیے اس میں ناقابلِ مزاحمت جاذبیّت ہوتی ہے۔

ساتھ ساتھ ٹیکنیکل تاریخ کو دورِ حاضر کے ادبی ارتقا سے بھی کھلے بندوں وابستگی ہوتی ہے۔ مثلاً آرٹ، انتقاد اور فلسفہ۔

بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری چوتھائی میں ادبیات نے بھی کروٹ لی اور بیان و ڈرامہ کا روایتی طریقہ چھوڑ کر تجزیے اور تصویر کشی کا طریقہ اختیار کیا یعنی پلاٹ اور کرداروں میں دلچسپی ترک کرکے اپنے آپ کو غیر تشخصی، لاشعوری اور غیر متشکل میں اُلجھا لیا۔

ورجینیا ولف[1] نے لکھا: ہمیں ایٹموں کا ریکارڈ رکھ لینا چاہیے جس طرح اور جس طریق سے یہ قلب پر گرتے ہیں۔ ہمیں وہ نمونہ تیار کرلینا چاہیے جو ہر نظارہ یا واقعہ شعور کے سامنے لاتا ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی بے تعلق اور غیر مرتب کیوں نہ ہو۔ فن بھی زیادہ سے زیادہ تجریدی اور غیر تشخصی ہوتا گیا۔ نہ وہ کوئی کہانی بیان کرنے سے متنفر تھا، نہ کوئی چیز ڈرامائی یا پُراثر اور

---

[1]: انگریز مصنف (۱۸۸۲ء - ۱۹۴۱ء)

رنگین انداز میں پیش کرنے پر آمادہ تھا۔ تاریخی تصویریں اور تاریخی بیانات یا سوانح ترک کر دیے گئے۔ انتقاد زیادہ تر متن کی توضیح میں صرف کیا جاتا۔ فلسفہ بڑے بڑے مسائل سے رُخ موڑ بیٹھا جن میں بہ روایتی اعتبار سے منہمک رہتا تھا۔ ان حالات میں یہ تعجب انگیز نہیں کہ مؤرخ ٹیکنیکل تاریخ کی پیچیدگیوں سے منتقل ہو کر تاریخ پر شبہات کی نظر ڈالے خواہ تاریخ کو بیان کی حیثیت میں لیا جائے یا فلسفے کی حیثیت میں یا آرٹ کی حیثیت میں۔ اور کسی ایسی چیز کی تلاش کرے جو اسے ذہنی حفاظت کا یقین دلاتی ہوئی معلوم ہو۔

دُوسرا باب

تاریخ کی قسمیں

تاریخ کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنے مؤرخ ہیں اور ہر مؤرخ اپنے انداز کی تاریخ لکھتا ہے۔ تاریخ ۱۵
کے فلسفی کارل بیکر نے کہا کہ یہاں بے شمار مؤرخ ہیں، چونکہ ہر آدمی خود اپنا مؤرخ ہے۔ ایک اعتبار
سے یہ قول بالکل درست ہے کیونکہ ہر شخص جو کوئی کہانی سناتا ہے اور اپنے بچپن کے واقعات یاد کرتا ہے
یا کسی خط میں سفر کا حال بتاتا ہے یا بیس بال کے کھیل یا نمائش کا ذکر کرتا ہے تو وہ ایک لحاظ سے تاریخ
نگار ہی ہے۔ یہ کام وہ خام انداز میں کرتا ہے۔ پیشہ ور مؤرخ اسے زیادہ بہتر انداز میں انجام دیتا ہے۔
وہ زمانۂ ماضی کو ہر ممکن شہادت کے ذریعے سے تازہ کرتا ہے۔ اپنی معلومات کو ترتیب میں لاتا ہے اور
انھیں ڈرامائی انداز اور فنکاری سے نیا لباس پہناتا ہے۔ ضمناً تعبیرات بھی پیش کرتا جاتا ہے۔ کہانی
کے دوران میں وہ اپنے آپ کو بھی مرکز بنا لیتا ہے۔ اس طرح خود نوشتہ سوانح بھی مرتّب کر دیتا ہے۔
ہم ہر خط لکھنے والے کو مصنّف قرار نہیں دے دیتے اور جو شخص کوئی تصویر بنا لے اسے مصوّر نہیں کہتے۔
لہٰذا ہمیں ہر اس شخص کو مؤرخ قرار نہ دینا چاہیے جو زمانۂ ماضی کے کسی تجربے کو معرضِ تحریر میں لاتا ہے۔
یہی اچھا ہے کہ یہ اصطلاح ان لوگوں کے لیے وقف رکھی جائے جو عمداً کسی گزشتہ واقعے کو تازہ کرتے
ہیں اور ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ ان کا طریقِ ترتیب پیشہ ورانہ ہوتا ہے اور وہ محض نجی تفریح پر حصر
نہیں کرتے بلکہ اس سے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ کیوں کر بیان کی جائے؟ کوئی دو مؤرخ ٹھیک ٹھیک یکساں نہیں
ہو سکتے جس طرح دو نظمیں یا ناول ٹھیک ٹھیک ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم ایک کو
دوسرے کا سرقہ قرار دیتے۔ لیکن مؤرخوں نے گزشتہ صدیوں میں تاریخ نگاری کے کئی نمونے
پیدا کر لیے ہیں۔ انھیں رسمی نمونے قرار دیا جاتا ہے جیسے کہ نظم، موسیقی اور فن میں نمونے ہوتے ہیں۔
یہ نمونے ایسے نہیں کہ حرفاً حرفاً ان کی پابندی کی جائے اور انھیں معیّن و لازم سمجھا جائے۔ ان میں
اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔ نئے تجربے کے لیے بھی آزادی ہے (جیسا کہ آجکل فلموں اور ٹیلی ویژن
میں دیکھا جاتا ہے) ان نمونوں میں کوئی چیز آخری یا حکمی نہیں۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی روایتی نمونے یہی ہیں جو ۱۶

صدیوں کے تجربات کی پیداوار ہیں اور جو تاریخ نگاری کے بہترین ذریعے سمجھے جاتے ہیں۔

بعض نمونے

سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نمونے مندرجہ ذیل ہیں :-

۱ : جغرافیائی

۲ : سیاسی

۳ : ثقافتی

۴ : اداری

۵ : سیر افراد

یہ نمونے اس قدر متعارف ہیں کہ ان کی تشریح و توضیح کی چنداں ضرورت نہیں۔ تاہم ہمیں جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے میں بھی بعض مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے مثلاً آپ کہاں سے شروع کریں گے ؛ آپ کہتے ہیں کہ ابتدا سے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سہل نہیں جتنا بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب پورے یقین کے ساتھ ابتدا ۴۰۰۴ قبل مسیح سے ہوتی تھی کیوں کہ عام روایت کے مطابق آدم و حوّا کے باغِ عدن سے نکلنے کی تاریخ یہی تھی۔ صدیوں تک مؤرخین اور سائنسدان اپنی تاریخی ترتیب اسی تنگ واسکٹ کے مطابق موزوں کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ اور حقیقتہً اٹھارھویں صدی تک انھیں اس سے مخلصی پانے کا راستہ نہ ملا۔ گزشتہ صدی میں یا اس کے آس پاس تاریخ چند لاکھ سال پیچھے چلی گئی جسے مبہم طریق پر تاریخ سے پیشتر کا دور کہا جاتا ہے، اور تاریخ سے پیشتر کے دَور کو سمجھنے کے لیے بشریات، علم ادوارِ ارضیات، آثارِ قدیمہ اور بہت سی دوسری چیزوں کی ضرورت ہے اور چند ہی مؤرخ ان علوم سے آگاہ ہوتے ہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ تاریخ سے پیشتر دور کے بارے میں ضرور کہنا چاہیے اگرچہ اس کا تعلق آغاز کے ابتدائی حدود ہی سے ہو۔ پھر آخری دورِ حجریہ کے ان لوگوں کی بابت کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے جو میگڈ الینی کہلاتے تھے اور دس پندرہ ہزار سال پیشتر مغربی یورپ میں انھیں ترقی پسندانہ زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ وہ ہڈیوں سے بھی اوزار بنا لیتے تھے لیکن ان کی سب سے زیادہ اچھی یادگار فرانس میں لیسکا[۱] اور ہسپانیہ میں التمیرا[۲] کے غاروں کی دیواروں پر تصویریں تھیں۔ اگر ہم اس سلسلے میں ترجیح کا مسئلہ بشریات

---

[۱] : یہ پہاڑ فرانس میں ہے۔

[۲] : یہ پہاڑ وسطِ ہسپانیہ میں ہے۔

کے ماہرین پر چھوڑ دیں۔ پھر بھی یہ سوال ہمارے سامنے باقی رہتا ہے کہ آیا ہمیں بیان کا آغاز ان "مہذب" لوگوں سے شروع کرنا چاہیے جو ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے آس پاس دوآبہ دجلہ و فرات (عراق) میں رہتے تھے یا وادیٔ سندھ کے لوگوں سے شروع کرنا چاہیے جو مسیحؑ سے اڑھائی ہزار سال پیشتر ترقی یافتہ شہری تہذیب پر فخر کرتے تھے؟ ان کے علاوہ شمالی چین کے شنگ خاندان کا معاملہ بھی زیرِ غور رکھنا چاہیے جو اس وقت تک ایسی زبان ایجاد کر چکے تھے جو لکھی جاتی تھی اور جو خود ہمارے زمانے تک قائم رہی۔

رسمِ عام

رسمِ عام یہ ہے کہ ابتدا مصر، یہودیہ، یونان اور روما سے کرتے ہیں۔ یہاں خود اپنی تہذیب کی جڑیں ہمیں ملتی ہیں اور ان خطوں کا معاملہ زیادہ یقینی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی دیکھ بھال پوری طرح ہو چکی ہے۔ رہنمائی کے خط اور راستے کے نشان لگائے جا چکے ہیں۔ پھر عہدِ وسطیٰ کی تاریخ تک پہنچ جانا کسی زحمت و تکلیف کا موجب نہیں۔ روایتی اعتبار سے اس کی ابتداء سلطنتِ روما کے زوال سے ہوتی ہے جب دارالحکومت روما سے تبدیل ہو کر قسطنطنیہ آ گیا تھا۔ عجیب امر یہ ہے کہ اس تبدیلی کے بعد بیزنطینی تاریخ عموماً نظر انداز کی گئی۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے مرکزی کشش مشرقی جانب منتقل ہو گئی تھی۔ تاہم زیادہ تر مؤرخین نے مغرب ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ وہ ان صدیوں کی تاریخ کو "قرونِ مظلمہ" کہتے رہے۔ اس کے بعد مؤرخین نے جدوجہد کر کے دورِ وسطیٰ میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ یہ بارھویں صدی کے احیائے علوم کا دور تھا۔ پھر احیائے علوم کا وہ شاندار دور شروع ہو گیا جو چودھویں صدی سے سولھویں صدی تک جاری رہا۔ اسے دورِ حاضر کی تاریخ کی دہلیز سمجھنا چاہیے۔ جس کا آغاز نئی دنیا کی دریافت سے ہُوا یا لُوتھر کے مشہور دعاوی و نظریات سے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب مؤرخ کی خواہش پر موقوف ہے۔ بعد کا سفر بہت آسان تھا۔

یوں تاریخ کے قدیم، وسطانی اور دورِ حاضر کی تقسیم کچھ زیادہ مشکل نہ تھی لیکن یہ سب کچھ اپنی مرضی سے طے کر لیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا نمایاں نقص یہ تھا کہ معاملہ حلقوں تک محدود رکھا گیا۔ یہ تقسیم پوری تاریخ کے لیے نہ تھی بلکہ اس کا تعلق صرف مغربی یورپ سے تھا۔ ایشیا، افریقہ کے علاوہ امریکہ کے دونوں برِّاعظم بالکل نظر انداز کر دیے گئے اور فرض کر لیا گیا کہ یورپ سے باہر کسی مقام پر بھی کچھ نہ ہُوا اور جو کچھ یورپ میں جائز سمجھا گیا وُہی پُورے کرۂ ارض کے باب میں درست قرار دے لیا گیا۔

اس تقسیم میں اور نقائص بھی تھے۔ تاریخ کے لمبے دوروں کے لیے نام رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ ان دوروں کو ہم اپنے تصوّر کے اندر قید کر دیتے اور متوقع رہتے کہ وہ ہمارے رکھے ہُوئے ناموں اور تصوّروں ہی کے مطابق رہیں گے۔ ہم یہ بھول گئے کہ یہ نام بھی کسی سند کے بغیر اپنی مرضی سے رکھ لیے گئے تھے اور چھوٹے چھوٹے حلقوں تک محدود تھے۔ جو لوگ پیری کلیز[1] کے ایتھنز میں رہتے تھے وہ اپنے آپ کو قدیم زمانے کے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح آٹھویں صدی کے لندن اور تورز[2] کے باشندے بھی قرونِ وسطیٰ کے باشندے نہ تھے۔ ناموں کے اطلاق کا مطلب بھی یہ تھا کہ تعمیم کی صُورت پیدا کی جائے یعنی اگر فرض نہ کیا جائے تو کم از کم خیال ظاہر کر دیا جائے کہ جو لوگ احیائے علوم کے دَور میں رہتے تھے۔ ان سب نے تمام خصوصیات سے فائدہ اٹھایا جو اس دَور سے مختص ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دَورِ احیائے علوم کا جو انسان فلارنس میں رہتا تھا وہی اپسالا[3] میں بھی مقیم تھا اور جیسا انسان بوہیمیا کے جنگل میں پایا جاتا تھا ویسا ہی آئرلینڈ کی دلدلوں میں تھا۔ ایک مشکل اور بھی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ مختلف دوروں کے اعتبار سے کیا جائے تو اس مغالطہ انگیز عقیدے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ تاریخ میں واقعی ایسے معیّن دور تھے۔ اس طرح یہ حقیقت نظر انداز ہو جاتی ہے کہ تاریخ کے مختلف دَور بھی باہم ملے جلے تھے اور بعض اوقات ایک دور کے واقعات دوسرے دور میں پہنچ جاتے تھے اور ان کے درمیان امتیاز یا حد بندی ممکن نہ تھی۔

ان سب باتوں کے علاوہ سہولت کا مسئلہ باقی رہتا ہے۔ کسی علم کا مطالعہ خواہ اس کا تعلق ادب سے ہو یا فن سے، حیوانیات سے ہو یا ریاضیات سے، ہمیں اس کے لیے کوئی نہ کوئی نظام تیار کر لینا چاہیے اور اسی کے مطابق اسے تقسیم کر کے الگ الگ ٹکڑے تیار کر لینے چاہییں۔ جب تک ہم ان حدود سے آگاہ ہیں اس وقت تک تاریخ وار ترتیب درست رہتی ہے اور یہ طریقہ دوسرے طریقوں کے مقابلے میں زیادہ سہولت کا باعث ہے لیکن کیا ہمیں یہ بتانا نہ چاہیے کہ اگر ہم مطالعہ کسی ایک خاص ملک مثلاً برطانیہ یا امریکہ یا قوموں کے ایک ملے جلے گروہ تک محدود رکھیں تو تاریخ وار امتیازات کا معاملہ زیادہ گفتگو کا محتاج ہو جاتا ہے۔

الزبتھ کا عہد ماضی اور مستقبل کے ساتھ اپنے تمام روابط کے باوجود خود اپنے عہد کی بھی خصوصیات کا حامل تھا۔ یہی کیفیت پیوریٹنوں کے دور کی تھی اور یہی کیفیت انگلستان میں بحالیٔ بادشاہی کے

---

[1] : ایتھنز (یونان) کا شہرہ آفاق مدبّر (۴۹۹ ق م - ۴۲۹ ق م)

[2] : فرانس کا ایک مشہور شہر۔

[3] : سویڈن کا ایک ضلع جو سٹاک ہوم کے شمال میں ساحل پر واقع ہے۔

دور کی تھی۔ انقلاب نے امریکہ میں قومی دَور کو استعماری دَور سے الگ کر دیا۔ اسی طرح زاروں کے روس اور کمیونسٹوں کے روس کا معاملہ ایک دوسرے سے الگ تھا اس لیے ہم انھیں دو دَوروں میں رکھ کر الگ الگ مطالعہ کریں تو یہ بالکل حق بجانب ہو گا۔ ہمیں "روحِ زمانہ" (ZEITGEIST) کے مغالطوں کی تائید نہ کرنی چاہیے اور یہ نہ کہنا چاہیے کہ جوانی اور بڑھاپے کی خصوصیات الگ الگ ہوتی ہیں۔

تاریخ وار ترتیب

تاریخ کے لیے ایک مختلف تاریخ وار ترتیب بھی موجود ہے مثلاً دورِ حاضر سے شروع کیا جائے
اور اسے پیچھے کی طرف لے چلیں اس طریقے میں کم از کم نوجوانوں کے لیے بعض اچھے نکتے ہیں۔ یہی طریقہ
ہے جس کے مطابق بہت سے نوجوان اپنے خاندان کی تاریخ کا پتا لگا لیتے ہیں۔ وہ اپنے والدین سے ۱۸
شروع کرتے ہیں پھر دادا دادی کو لیتے ہیں اور اسی طرح پیچھے کی طرف سلسلہ چلا جاتا ہے یا جہاں کچھ معیّن
طور پر معلوم نہ ہو گا وہ عوامی افواہ پر یقین کر لیں گے۔ یہی طریقہ ہے جس کے مطابق قانون دان عادۃً
کام لیتے ہیں۔ پیشِ نظر مقدمے کے سلسلے میں اس سے پہلے کے مقدمے کو دیکھتے ہیں پھر زیادہ دُور
کی مثالوں پر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم کئی اداروں کا مطالعہ کر سکتے ہیں مثلاً سیاسی جماعتیں، صدارت،
کارپوریشن، لیبر یونین، یونیورسٹی۔ ہم ان اداروں کے موجودہ کردار سے واقف ہو کر ان کی اصل و
ابتدا پر پہنچ جائیں گے۔

ہم میں سے اکثر معاصرانہ تاریخ لکھنے کو شبہات کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہی چیز تاریخ کے متعلق نقطۂ نگاہ کا باعث بن جاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ابھی معلومات مہیا نہیں ہوئیں یا وہ منظر پیدا کر لینا ممکن نہیں جو معروضیت کے لیے حد درجہ ضروری ہے۔ یہ درست ہے۔ بہ ایں ہمہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بہت سے بڑے بڑے مؤرخوں نے معاصرانہ تاریخی کتابیں لکھیں۔ تھیوسی ڈائڈز نے پلیپونیسی جنگ اپنی آنکھوں سے دیکھی جس کی تاریخ وہ بیان کرتا ہے۔ ٹیسی ٹس نے بھی اپنے عہد کے حالات قلم بند کیے۔ میکیاولی[1] کی "ہسٹری آف فلارنس" معاصرانہ تاریخ ہے اور فرانسیسکو گیوسی آرڈینی کی "ہسٹری آف اٹلی" بڑی عظیم القدر کتاب ہے۔ یہ بھی معاصرانہ لکھی گئی۔ کلارنڈن کی "تاریخِ بغاوت" جزواً خود نوشتہ سوانح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر والٹیر کی تاریخ یعنی عہدِ لوئی چہاردہم ٹھیک ٹھیک معاصرانہ تاریخ نہ تھی تو والٹیر نے کم از کم عمر کے بیس سال لوئی چہاردہم کے عہد

---

[1]: فلارنس کا مشہور مدبّر اور مصنّف (۱۴۶۹ – ۱۵۲۷ء)۔

میں گزارے۔ جو شخص ونسٹن چرچل کی نہایت شاندار کتاب "ورلڈ کرائسس" یا "ہسٹری آف دی سیکنڈ ورلڈ وار" پڑھتا ہے کیا اسے شک ہو سکتا ہے کہ کامل الفن مؤرخ کی معاصرانہ تاریخ بھی عظیم القدر تاریخ ہو سکتی ہے۔

تاریخ وار تاریخ مرتب کرنے کی طرح جغرافیائی اعتبار سے تاریخ مرتب کرنے میں اک گونہ سادگی ہے جس کی کشش سے سکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ اور نصاب کی کتابیں لکھنے والے مصنّف بچ نہیں سکتے۔ انیسویں صدی میں تاریخ کے متعلق کچھ اس قسم کا خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ صرف یورپی دُنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ یورپی دنیا سے مراد ہے برّاعظم یورپ، بحیرۂ روم اور امریکہ کے دونوں برّ اعظم۔ بلاشبہ مشرقِ ادنیٰ کی طرف جزوی توجہ ہوتی تھی مثلاً حمورابی[1] کا قانون، مسلمانوں کے ہاتھوں شمالی افریقہ اور ہسپانیہ کی تسخیر یا صلیبی جنگوں کا دور۔ وقتاً فوقتاً مشرقی دنیا کو چور دروازے سے کبھی کبھی داخل کر لیا جاتا تھا مثلاً کبھی چین میں بارود کی دریافت کا قصّہ۔ کبھی مارکوپولو[2] کا سفر نامہ۔ کبھی ہندوستان میں کلائیو[3] کی فتوحات۔ کبھی جاپان میں میتھیو پیری[4] کا پہنچنا اور اس کے ساتھ تعلقات کا پیدا ہونا۔ کبھی باکسروں[5] کی بغاوت۔ اہلِ یورپ کے خلاف چینیوں کے اٹھ کھڑے ہونے کو "بغاوت" قرار دینا بھی کس قدر دلچسپ ہے۔ کبھی کبھی افریقہ بھی تاریخ کے افق پر اُبھر آتا تھا۔ یقیناً اس وقت جب اہلِ یورپ اس بدنصیب برّاعظم پر غلام حاصل کرنے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نو آبادیوں کا انتظام کر لیا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے مؤرخ

یہ سب کچھ ایک عجیب وضع کے تاریخی حقائق کی نمائش تھی۔ اٹھارھویں صدی کے مؤرخ مثلاً والٹیر

---

[1] : زمانۂ ماضی کا بادشاہ جس کا مرکز عراق تھا۔ (۱۹۵۵ ق م – ۱۹۱۳ ق م) اس کا قانون بہت مشہور ہے۔

[2] : (۱۲۵۴ء – ۱۳۲۴ء) اطالوی تاجر اور سیاح جس نے چین اور دوسرے ملکوں کا سفر کیا۔

[3] : (۱۷۲۵ء – ۱۷۷۴ء)

[4] : ایک امریکی جہازران جس نے جاپان کے ساتھ مغربی دنیا کے روابط کی ابتدا کی۔ (۱۷۹۴ء – ۱۸۵۸ء)

[5] : چینیوں کا ایک گروہ باکسر کہلاتا تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں یورپی سفارت خانوں پر حملے کیے تھے اس کے لیے چین پر بہت بڑا تاوان عائد کیا گیا۔

اور ایبی رینال - یورپی تنگ نظری سے رشتہ توڑ کر عالمِ انسانیت کا جائزہ چین سے پیرو تک لینے پر آمادہ ہو گئے لیکن ان کی تمام حرکات بھی مصنوعی ہی رہیں۔ انھیں کرۂ ارض کے صرف ان غیر یورپی حصّوں سے دلچسپی تھی جو کسی نہ کسی حیثیت میں یورپ سے متصادم ہو گئے تھے۔ صرف ماضیٔ قریب ہی میں مؤرخوں نے یہ تصوّر ترک کیا ہے کہ تاریخ کا تعلق صرف یورپی دنیا سے ہے یا جس سے یورپی دنیا پر اثر پڑا۔ اب اعتراف کر لیا گیا ہے کہ کرۂ ارض کا دو تہائی غیر یورپی حصّہ بھی ویسا ہی اہم ہے۔ جیسا ایک تہائی یورپی حصّہ۔ بہ ایں ہمہ تاریخ کے متعلق شعور اب بھی جزوی اور وقتی ہے۔ سکولوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ اب تک یورپی تاریخ ہی ہے۔ عام قارئینِ تاریخ جن کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ بھی قریب قریب تماماً یورپی ہیں۔ اس اصطلاح کا تعلق بھی زیادہ تر برطانوی جمعیتِ اقوام اور دونوں امریکی برّاعظم ہیں۔ یہ عادت بہت پختہ ہو چکی ہے کہ ایشیا اور افریقہ اور ایک حد تک ہسپانوی امریکہ محض یورپ کے متعلقات ہیں اسی سے آپ موجودہ دور کے بین الاقوامی سیاسی اور ثقافتی تعلقات کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہر حال جغرافیائی حدود کی تاریخی تنظیم کے متعلق روایت میں اک گونہ منطق ضرور ہے۔ اس میں سہولت ہی نہیں بلکہ مدد ملتی ہے کہ بحیرۂ روم کی دنیا کو ایک وحدت سمجھ لیا جائے۔ یورپ کو ایک جداگانہ وحدت اور دونوں امریکی برّاعظموں کو ایک الگ جزد۔ تمام قوموں کی تاریخیں ایک دوسری سے گہرا تعلق رکھتی ہیں لیکن جغرافیہ اور آب و ہوا یعنی ماحول اسی طرح تاریخی رفتار کا فیصلہ کرتا ہے جس طرح میراث۔ اور مؤرخ ماحول کو اپنا نقطۂ آغاز بنا سکتا ہے اور اسے ڈھانچے کے طور پر قبول کر سکتا ہے لیکن یہاں ایک خطرہ ہے جس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ ہنری ٹامس بکل جس نے انگلستان کی تہذیب کی تاریخ لکھی اس نے جغرافیے کو محض نقطۂ آغاز ہی نہ بنایا بلکہ تاریخ کی تہذیب کا انحصار اسی پر رکھا اور وہ اپنے دعوے کو مقبول بنانے میں بُری طرح ناکام رہا۔ تاہم اگر جغرافیے کو ایک تنظیمی اصل کے طور پر استعمال کیا جائے اور فلسفیانہ توضیحات کا مرکز نہ بنایا جائے تو یہ ہمارے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔

تاریخ نگاری کا ایک تیسرا طریقہ بھی ہے۔ یہ طریقہ جغرافیے سے اخذ کیا گیا ہے۔ اسے عموماً سیاسی کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خصوصیّت سے اس وقت پیشِ نظر آیا جب سے قومیّت (نیشنلزم) پیدا ہوئی یوں ہم فطرۃً اپنے مواد روما یا فرانس یا ریاستہائے متحدہ امریکہ یا وفاقِ اعلیٰ (کنفیڈریسی) میں حسنِ ترتیب سے شامل کر دیتے ہیں۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ تاریخ نگاری کے لیے یہ سیاسی نقطۂ نگاہ تماماً دورِ حاضر کی پیداوار ہے اور قومی مملکتیں خود دورِ حاضر میں پیدا ہوئیں۔ تاریخ نگاری کے تمام اقسام میں سے سیاسی سب سے زیادہ سہل اور سب سے بڑھ کر ہر دلعزیز ہے۔ آجکل تقریباً

تمام تاریخیں سیاسی ڈھانچے کی شکل میں لکھی جاتی ہیں۔ یہ ڈھانچا ردِ عمل کے طور پر مستعمل ہے تاکہ ان قوموں کی تاریخیں بھی اپنے اندر سمیٹ لی جائیں جو قومیتوں اور سیاسی مملکتوں کی ترتیب سے بہت پہلے گزر چکی ہیں۔ تاریخ نگاری کے لیے سیاسی نقطۂ نگاہ اس وجہ سے بھی خاص سہولت کا باعث ہے کہ آجکل پورے تاریخی مواد قومی خطوط ہی کی بنا پر مدوّن کیے جاتے ہیں اور انھیں سیاسی اور انتظامی دائروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یعنی حکومت، عدالتوں، فوج بحریات وغیرہ کے تمام ریکارڈ الگ الگ چھاپے جاتے ہیں اور محافظ خانوں یا لائبریریوں میں جو کچھ ہے وہ بھی اسی تقسیم کے مطابق رکھا جاتا ہے۔
۲۰ یہ اس وجہ سے بھی سہل ہے کہ اس میں علمائے تاریخ کی لسانی صلاحیتوں پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔ یہ طریقہ اس وجہ سے ہر دلعزیز ہو گیا کہ اس سے قومی افتخار کے جذبے پر خاص اثر پڑتا ہے۔ قارئینِ تاریخ کی عملی دلچسپیوں اور ڈرامائی ذوق کے ساتھ ربط ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ضروری نکتہ یہ ہے کہ بچّے ابتدائی دور میں جو کہانیاں سنتے ہیں پھر سکول میں جو کچھ پڑھتے ہیں۔ نیز سیاسیات اور حبِّ وطن کے جشنوں میں جو کچھ دیکھتے اور پاتے ہیں ان سب سے ایک سلسلہ مجڑ جاتا ہے۔

ماضی کی سیاسیات حال کی تاریخ

اندریں حالات یہ تعجب انگیز نہیں کہ دورِ حاضر کے بیشتر مؤرخوں نے فری مین[۱] کا یہ مقولہ درست تسلیم کر لیا ہے کہ تواریخ زمانۂ ماضی کی سیاسیات ہیں اور زمانۂ ماضی کی سیاسیات دورِ حاضر کی تاریخ ہیں۔ سیاسی نظریے کی ناتمامی کی کیفیت خواہ کچھ ہو۔ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ نگاری کی اس روش نے —— اسے فلسفے کا ایک جذبہ کہنا کچھ زیادتی معلوم ہوتا ہے —— میکالے کی "ہسٹری آف انگلینڈ"، مشلے کی "ہسٹری آف فرانس"، یوہان میونز کی "ہسٹری آف دی سوس کنفیڈریشن"، پیٹر منچ کی "ہسٹری آف دی ناروےجن پیپل"، ہنری ایڈم کی "ہسٹری آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس ڈیورنگ دی ایڈمنسٹریشن آف جیفرسن اینڈ میڈیسن" مہیا کر دیں۔ یہ تمام کتابیں نادر الوجود، ضخیم، عالیشان اور اعلےٰ درجے کی ہیں۔ یہ اصل دعوے کے جواز کی دلیل ہے۔ قومی تاریخ پر کتنی ہی پابندیاں عائد کر دی جائیں، مؤرخ ان سے عہدہ برا ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے بلکہ انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ اگر کوئی تاریخ پیشتر کے قومی تصورات کے بغیر لکھی جائے یا قومی ڈھانچے سے باہر رہ کر مرتّب کی جائے تو یہ معاملہ توجہ طلب ہے کہ آیا اس طرح قومی تاریخ بہتر طریق پر پیش کی جاسکے گی۔

تاریخ پڑھنے والے کو یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ سیاسی نقطۂ نگاہ کے مطابق تاریخ

۱: انگریز مؤرخ (۱۸۲۳ء — ۱۸۹۲ء)۔

لکھنا گوناگوں خطرات سے لبریز ہے۔ اس میں تاریخ کا تنگ اور محدود منظر پیش کیا جائے گا۔ اس میں مؤرخ اور تاریخ خواں دونوں جارحانہ حبِّ وطن کا پیکر بن جائیں گے۔ اس طرح زمانۂ ماضی پر دورِ حاضر کی قومیّت کا پرتو ڈال کر مصنوعی تقسیمیں پیدا کی جائیں گی۔ تاریخ کے دوسرے عناصر کو چھوڑ کر سیاسیات اور ڈپلومیسی کا کردار بہت بڑھا دیا جائے گا۔ سیاسی کٹھالی میں جو چیز ڈالی جائے گی وہ پگھل پگھل کر ثقافت، مذہب، مجلسی اور اقتصادی ادارت سب کو ایک تختی کی شکل میں بدل دے گی اور اس پر جو چھاپ لگائی جائے گی۔ اسی نام سے اسے پکارا جائے گا۔

ثقافتی تاریخ نگاری

تاریخ نگاری کی چوتھی شکل ثقافتی ہے۔ ثقافتی تاریخ کی تعریف آسان نہیں۔ یہ قوم کے قلب، ذہن اور کردار کی تاریخ ہوتی ہے۔ اس میں وہ اہم افکار بیان کیے جاتے ہیں جو کسی معاشرے یا دور میں غلبہ حاصل کر گئے۔ یا وہ ادارے جنھیں ہم انسانوں کے مذہب اور کردار سے وابستہ کرتے ہیں۔ غالباً تاریخ کی کوئی دوسری قسم صاحبِ علم و تصنیف سے زیادہ بڑے مطالبوں کی متقاضی نہیں اور جب یہ مطالبے پورے ہو جائیں تو ویسی دل آویز تاریخ بھی کوئی نہ ہوگی۔ لیکن بعض غلط اندیش مؤرخ سمجھے بیٹھے ہیں، ثقافتی تاریخ کے تقاضے پورے کرنے کی یہ صورت نہیں کہ کسی معاشرے نے ایک خاص دور میں جو کچھ لکھا یا تصویریں بنائیں یا نظمیں کہیں یا عمارتیں کھڑی کر دیں وہ سب کچھ معرضِ تحریر میں لے آیا جائے۔ ایک دور میں موزارٹ[1] اور بیتھوون[2] نے گانے مرتّب کیے۔ کانٹ[3] اور کیر کے گار[4] گہرے افکار میں ڈوبے رہے۔ رینائر[5] اور مانے[6] نے عصر پرستی کو تقویت پہنچائی۔ یہ نہیں، ثقافتی مؤرخ کا اصل کام یہ ہے کہ کسی نسل یا کسی دور کے مختلف معاشروں کی دلچسپیوں اور افکار کو جانے سمجھے اور ان کی توضیحات کرے اور تاریخ کے پورے ڈھانچے میں ان مظاہروں کا سُراغ لگائے۔ افکار ہمیشہ آفاقی و عالمی ہوتے ہیں۔ مؤرخ سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ قوموں اور زبانوں کی حد بندیوں

---

[1]: یورپ کا شہرہ آفاق موسیقار (۱۷۵۶ء – ۱۷۹۱ء)۔

[2]: موسیقار (۱۷۷۰ء – ۱۸۲۱ء)۔

[3]: جرمنی کا شہرہ آفاق فلسفی (۱۷۲۴ء – ۱۸۰۴ء)۔

[4]: ڈنمارک کا فلسفی (۱۸۰۳ء – ۱۸۵۵ء)۔

[5]: فرانس کا مشہور مصوّر (۱۸۴۱ء – ۱۹۱۹ء)۔

[6]: فرانس کا سب سے بڑا مصوّر (۱۸۳۲ء – ۱۸۸۳ء)۔

سے بالا ہو کر ان چیزوں کا جائزہ لے بلکہ ممکن ہو تو وقت کی حدود سے بھی اوپر نکل جائے۔ آپ ۱۸۷۶ء کے متنازع فیہ انتخاب[1] کی کہانی بالکل مجرد انداز میں پیش کر سکتے ہیں لیکن آپ ایک سو سال بعد ۱۸۷۶ء کے انتخابات اس وقت تک درست ثابت نہیں کر سکتے جب تک رومانیت، سائنس، آرٹ، صنعت اور ایک درجن دوسرے موضوع نہیں لائیں گے۔ ثقافتی مؤرخ کے لیے لازم ہے کہ بہت سے دوسرے ملکوں کی تاریخ سے آگاہ ہو۔ آرٹ، ادب، فلسفہ اور سائنس جانتا ہو اور ان سب کو ایک سلسلے میں امتزاج کی اس کے اندر خاصی صلاحیت ہو۔

مشکلات

تاہم یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ایک خاص نوع کی سادگی اور بیانی خطوط کی وضاحت پیش کرتی ہے۔ اس کے برعکس ثقافتی تاریخ میں بے قاعدہ پھیلاؤ اور انتشار ہوتا ہے۔ نیز ہم اسے متشکل نہیں غیر متشکل ہی قرار دے سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہے کیا؟ کیا یہ بشریات کا موضوع ہے جیسا کہ فریزر[2] نے اپنی مشہور کتاب "شاخِ زریں" میں اور لیوس مارگن[3] نے "اینشنٹ سوسائٹی" میں پیش کیا ہے۔ کیا اسے عمرانیات میں شامل کرنا چاہیے جیسا کہ ڈنمارک کے ممتاز مؤرخ ٹرائلس لُنڈ نے اپنی کتاب "ڈیلی لائف اِن دی نارتھ اِن دی سکسٹینتھ سینچری" جو چودہ جلدوں میں ہے۔ یا چارلس بوتھ نے اپنی عظیم القدر کتاب "لائف اینڈ لیبر اِن لنڈن" میں بتایا ہے۔ کیا ہم اسے اقتصادیات میں شامل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ راسٹووٹزف[4] نے "اکنامک ہسٹری آف روم" میں بتایا ہے۔ مینڈل کریٹن[5] نے اسے اپنی "ہسٹری آف دی پوپس" میں اور لڈوگ فان پاسٹر نے متعدد جلدوں کی "ہسٹری آف دی پیپیسی" میں۔ یا اینسن فیلپس سٹوکس نے "چرچ اینڈ سٹیٹ اِن دی یونائیٹڈ سٹیٹس" میں پیش کیا ہے اور یہ کتاب تین بڑی جلدوں میں ہے۔ کیا یہ آرٹ ہے جیسا کہ برک ہارٹ نے "ری نیسنس اِن اٹلی" یا برینسن نے "پینٹرز آف دی نارورن اٹیلین ری نیسنس" میں۔ یا ریوالڈ کی ضخیم کتاب "امپریشنِسٹس اینڈ پوسٹ امپریشنِسٹس" میں۔ کیا یہ تعلیم ہے۔ جیسا کہ ریشڈل نے "ہسٹری آف میڈیول یونیورسٹیز" میں۔ یا سینڈیز نے "ہسٹری آف کلاسیکل سکالرشپ" میں۔

---

۱ : ۱۸۷۶ء کے انتخابات میں بہت سے اختلافات رونما ہو چکے تھے جو دیر تک قائم رہے۔

۲ : انگریز مصنف۔ اس کی تاریخ پیدائش ۱۸۵۴ء ہے۔

۳ : (۱۸۱۸ء ۔ ۱۸۸۱ء)۔

۴ : پیدائش ۱۸۷۰ء۔

۵ : انگریز مصنف (۱۸۴۳ء ۔ ۱۹۰۱ء)

کیا یہ قانون ہے۔ جیسا کہ ہولڈس ورتھ نے "ہسٹری آف انگلش لاء" کی پندرہ جلدوں میں۔ اور چارلس وارن نے "سپریم کورٹ ان یونائیٹڈ سٹیٹس ہسٹری" میں لکھا ہے۔ کیا یہ سائنس ہے۔ جیسا کہ نیڈھم نے "ہسٹری آف سائنس اِن چائنا" یا تھارن ڈائک[1] نے "ہسٹری آف میجک اینڈ ایکسپیریمنٹل سائنس" میں بتایا ہے۔ یا کیا اس کا تعلق عسکریات سے ہے جیسا کہ فارٹیسکو نے "ہسٹری آف دی برٹش آرمی" میں۔ یا اومن[2] نے "ہسٹری آف دی پیننسولر کمپین" یا ڈگلس فری مین نے "آر۔ای۔لی" اور "لیز لیفٹیننٹس" میں۔ یقیناً یہ ادب ہے۔ ثقافتی تاریخ روایتی اعتبار سے ادب کو اختیار کر چکی ہے اور ادب ہی اس کا سب سے زیادہ موزوں ذریعہ ہے۔ مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ ان کا یہاں اعادہ نہیں کیا جا سکتا۔

بعض مؤرخ بڑی جرأت سے کام لے کر ان تمام چیزوں کو اکٹھا کر دیتے ہیں اور ایک ایسا مرکب پیش کرتے ہیں جو معاشرے کے کردار اور فکر و نظر کا پورا مرقع ہوتا ہے۔ مثلاً جان اڈنگٹن سیمنڈز[3] نے "ری نیسنس اِن اٹلی" کی تاریخ پر سات جلدیں لکھی ہیں۔ ایلفرڈ زمرن[4] نے "گریک کامن ویلتھ" پر نہایت روح افروز کتاب مرتب کی۔ پال ہیزرڈ[5] نے اٹھارھویں صدی میں یورپی فکر و نظر کی تعبیر بڑی فصاحت سے کی۔ جائگر نے یونانی ثقافت کے مطالعے پر ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام پائیڈیا ہے۔ "پیرنگٹن" نے "مین کرنٹس اِن امریکن تھاٹ" نام ایک کتاب لکھی جو متنازع فیہ ہے۔ اس میں فکر کے وہ تمام مظاہر آ گئے ہیں جن کی حیثیت فلسفیانہ نہ تھی۔

ان تمام کتابوں کا تعلق مشترکہ حیثیت میں "افکار" سے ہے نہ کہ "وقائع" سے۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ان حدود سے گزر جائیں جو سیاسیات، قانون، اقتصادیات، معاشرہ، فلسفہ، سائنس اور آرٹ کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ یہ بڑے قابلِ قدر مقاصد ہیں۔ لیکن ان کا پورا کرنا مشکل ہے۔ شرمن کے "انٹی ٹرسٹ ایکٹ" (۱۸۹۰ء) کی تاریخ لکھ لینا سہل ہے لیکن ۲۲
جرمنی، انگلستان اور امریکہ کے موضوعی فلسفے کے پیچیدہ اور گریز پا عناصر کا سراغ لگانا اتنا سہل نہیں۔ تاہم اگر ذہنی تاریخ لکھنے کی مشقتیں اور خطرے زیادہ ہیں تو اس کے منافع بھی کم نہیں۔ یہ سوچنا باعثِ مسرت ہے کہ برک ہارٹ، سیمنڈز، سٹیفن اور ٹرولس لنڈ جیسے ثقافتی مؤرخوں کی

---

[1] : پیدائش ۱۸۸۱ء
[2] : (۱۸۶۰ء – ۱۹۴۶ء)
[3] : انگریز مصنف (۱۸۴۰ء – ۱۸۹۳ء)
[4] : تاریخ پیدائش ۱۸۷۹ء
[5] : (۱۸۷۸ء – ۱۹۴۴ء)

تحریرات ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی نئی نسلوں کے نزدیک پہلے جتنا زور و اثر اور جاذبیت رکھتی ہیں۔

ثقافتی بشریات

تاریخ کے حالیہ مطالعے میں بعض نہایت دلچسپ چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ چیز ہے جسے آجکل ثقافتی بشریات کہا جاتا ہے۔ اسے امریکا میں بطورِ خاص فروغ حاصل ہوا ہے۔ پیشتر بھی ایسی معزز مثالیں موجود ہیں مثلاً اٹھارھویں صدی میں "ہسٹری آف دی مارلز اینڈ کسٹمز آف نیشنز" اور ریںال کی مبسوط "ہسٹری آف انڈیز"۔ ان دونوں کتابوں کو ثقافتی بشریات کے متعلق مقالات کہا جاسکتا ہے۔ امریکا پر جو سب سے بڑی کتاب لکھی گئی یعنی ٹاکوے وِل کی کتاب "ڈیموکریسی اِن امیریکا"۔ اسے بھی رسمی اعتبار سے پہلی کتابوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں وہ مجلسی اور نفسیاتی خصوصیات بدرجۂ اتم شامل ہیں جن کا کھوج ثقافتی ماہرینِ بشریات آجکل لگا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے دوسرے ثقافتی مؤرخوں نے بھی بشریات سے بہت کچھ مستعار لیا۔ اس کی مثالیں درجِ ذیل ہیں:

۱ : ہنری مارگن کی کتاب "اینشنٹ سوسائٹی"

۲ : فریزر کی کلاسیکی کتاب "شاخِ زریں"

۳ : ولہلم گرون بیک کی بھولی بسری کتاب "کلچر آف دی ٹیوٹنز"

۴ : تھارسٹائن ویبلن[۱] کی عہد آفریں کتاب "تھیوری آف دی لیبر کلاس"

ایسے ہی مؤرخوں کی تصانیف نیز ہربرٹ سپنسر[۲] اور لسٹر وارڈ جیسے علمائے عمرانیات کی تصانیف پر ثقافتی ماہرین بشریات کے نئے دبستان کی تعمیر ہوئی۔ غالباً ان کے طریقے اور ٹیکنیک ان کے افکار سے زیادہ جدید ہے۔ انھوں نے امریکا یا برطانیہ جیسے اعلیٰ درجے کے مہذب معاشروں کے لیے وہی ٹیکنیک استعمال کی جو نہایت قدیم معاشروں کے مطالعے کے لیے تجویز ہوئی تھی۔ جیسے ساموآ[۳] اور جزائر ٹروبریانڈ[۴] کے معاشروں یا پیوبلو[۵] کے قدیم امریکی شہریوں کے لیے۔

---

[۱] : (۱۸۵۷–۱۹۲۹ء) [۲] : (۱۸۲۰–۱۹۰۳ء)

[۳] : مغربی بحرالکاہل میں جزیروں کا ایک مجموعہ جو فیجی کے شمال میں ہے۔

[۴] : یہ بھی قدیم آبادی کے جزیرے ہیں۔

[۵] : امریکا کے قدیم باشندوں کا ایک گروہ۔

وہ جس شے کو سائنٹفک طریق پر بروئے کار لانے کی امید پر کام شروع کرتے ہیں اسے مڈل ٹاؤن یا پلین ول (امریکہ) یا مانچسٹر، کوپن ہیگن یا والکلوز[1] کی مختلف رسموں، ریتوں، عادتوں وغیرہ پر بشریات اور عمرانیات کے نقطۂ نگاہ سے کچھ کچھ روشنی ڈالنے کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں متعارف امور سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یعنی سیاسیات یا ادبیات یا فلسفہ یا آرٹ۔ وہ زیادہ تر ایسے امور پر توجہ دیتے ہیں جیسے آرائش و زیبائش مختلف تاریخوں کے نمونے بچّوں کے کھیل، جنسی معمولات، خور و نوش کے عادات، وقار کے تصورات اور جوانوں کی نسلی روشیں۔

مطالعۂ کردار کا نیا پہلو

ان سب چیزوں کی اصل قدر و قیمت مؤرخ کی نظروں میں شاید یہ تھی کہ متعارف اور روایتی جد و جہد یعنی قومی کردار کے مطالعے کے لیے ایک نیا پہلو نکل آیا۔ انیسویں صدی ان تصورات اور ٹاکو سے ویل کی کتاب "ڈیماکریسی ان امیریکا" اور ایمرسن[2] کی کتاب "انگلش ٹریٹس" جیسی کتابوں سے مسحور ہو گئی۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے برطانیہ کا مؤرخ تھا۔ وہ اس قدر آگے نکل گیا کہ اصرار کرتا رہا، جو موضوع قابلِ مطالعہ ہے وہ ایک ہی ہے یعنی قومی کردار۔ لیکن جیسے جیسے قدم آگے ۲۳
بڑھتا گیا بیسویں صدی میں قومیت اور نسل نے نہایت بُرے مقاصد کو جنم دیا اور مؤرخ قومی کردار کے متعلق تعمیم میں متأمل ہو گئے اور آخر کار اس تصوّر ہی کو ترک کر دیا اور سمجھ لیا کہ یہ "قطعاً" قابلِ توجہ شے نہیں۔ انھوں نے کہا کہ انسانوں میں اتنے علیحدگی کے اوصاف نہیں جتنے اشتراک کے ہیں۔ قومی اوصاف کی حیثیت ہنگامی ہے۔ یہ انسانوں کی فطرت میں مضمر نہیں ہوتی گویا قومی کردار کا پورا تصوّر محض رومانی بلکہ مضر ہے۔

اب ثقافتی بشریات کا ظہور ہوا تو جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا تھا وہی نئی تاریخ میں کونے کا پتھر بن گیا۔ جب مؤرخوں نے ثقافتی قومیّت کا دائرہ چھوڑ کر جلد از جلد باہر نکل جانے کی کوشش کی تو ثقافتی ماہرینِ بشریات نے ان کی جگہ سنبھال لی۔ انھوں نے کہا کہ اگر قومی کردار کوئی چیز نہیں تو کم از کم قومی خصوصیات تو موجود ہیں۔ جلد ہی قومی کردار —— خصوصاً امریکی کردار —— کے متعلق رائے عامہ کا جائزہ لینے والوں نے بے اندازہ اعداد کی بھرمار کر دی مثلاً بچوں کی تربیت، تعلیمی معمولات، طبقہ بندی، ذات پات، کھیل، عوامی ثقافت، عوامی تعصبات، زبان، محاورہ اور

---

۱ : یہ فرانس کا ایک ضلع ہے۔

۲ : مشہور امریکی مصنّف۔ (۱۸۰۳–۱۸۸۲ء)۔

اقتدار کے لیے کش مکش - ان چیزوں کے مطالعے سے جو نتیجہ نکلا ــــــــ اس طبقے کے ایک ترجمان نے کہا ــــــــ ایسے اعداد پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ایک سوامرکی ایک وضع کی خصوصیات بار بار پیش کریں گے۔ ایک سو انگریزوں کی خصوصیات ان سے مختلف ہوں گی۔ یہ خصوصیات عمر، جنسیات، مجلسی درجے اور پیشے سے تعلق رکھتی ہیں۔

ثقافتی بشریات نے تاریخ کو ایک مزید فائدہ پہنچایا ہے یعنی اسے جمہوری بنانے میں مدد دی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ تاریخ ہمیشہ سے خاص طبقات اور خاص قسم کے وقائع تک محدود رہی۔ اس نے ہمیشہ رعایا کے بجائے فرماں رواؤں کو ترجیح دی۔ دیہاتی علاقے کے پادریوں کے بجائے یہ ہمیشہ پوپوں کی طرف راغب رہی۔ نچلے سپاہیوں کے بجائے اس نے سالاروں سے سروکار رکھا۔ سول کے ملازموں کے بجائے یہ مدبّروں کو مقدم سمجھتی رہی۔ اسی طرح مزدوروں اور کلرکوں کی طرف توجہ کرنے کی جگہ یہ صنعت وحرفت اور مالیات کے بڑے بڑے کارفرماؤں کو پیشِ نظر لاتی رہی۔ اس نے ہمیشہ ڈرامائی مناظر میں دل چسپی لی اور انہی باتوں کو بیان کیا جو سنسنی پیدا کرنے والی تھیں مثلاً جنگیں، بحران، قحط، قومی حوادث، جوانمردی کے کارنامے نہایت مکروہ جرائم، غریبوں اور عوام کی داستانیں بہت مختصر اور سادہ سی ملیں گی۔ عموماً انھیں بے وجود ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔

جب تک تاریخ کا انحصار نوشتہ دستاویزوں پر رہا تو جو نوشتہ دستاویزیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی بنا پر جو کچھ پیش آیا وہ بالکل طبعی اور قریباً ناگزیر تھا کیونکہ انسانیت کی بہت بڑی اکثریت نے کوئی نوشتہ ریکارڈ نہیں چھوڑا۔ جو مؤرخ یہ جاننا چاہتا ہے کہ لوگوں کی بڑی تعداد نے کیونکر زندگی بسر کی تو وہ مجبور ہے کہ ان مصنوعات پر انحصار کرے جو اتفاقات سے باقی رہ گئیں۔ مثلاً اوزار، اسلحہ، لباس، عوامی فنون یا عوامی منظوم داستانیں، لوک گیت یا وہ ریکارڈ جو کلیسا کے کارکنوں یا سرکاری افسروں نے باقی رکھے یعنی پیدائش، شادی اور موت کے اندراجات یا فوجی خدمت کے ریکارڈ، عدالتوں کے فیصلے، تحصیل داروں کے اعداد وغیرہ۔ دورِ حاضر میں ان اعداد کے اندر اخباروں نے مزید اضافہ کر دیا۔ ہنر مند اور صاحبِ فکر و نظر مؤرخوں کے لیے ایسی ہی چیزوں نے وہ قابلِ قدر مواد مہیا کیا جس میں انھوں نے اپنے زورِ قلم سے جان ڈالی۔ مثلاً ٹرولس لُنڈ نے "ڈیلی لائف اِن دی نارتھ اِن دی سکسٹینتھ سینچری" تصنیف کی۔ اور فرڈی ننڈ گریگورو ویس نے "ہسٹری آف دی سٹی آف روم اِن دی مڈل ایجز" لکھی۔ لیکن اکثر مؤرخ ایسی باتوں سے تغافل برتتے رہے۔

ثقافتی ماہرِ بشریات کو تاریخی ماضی کے ازسرِ نو احیا سے عموماً دل چسپی نہیں ہوتی لیکن جو

معلومات مہیا کر کے وہ کام میں لاتا ہے، اس سے ماضی خود بخود روشن ہو جاتا ہے کیونکہ کیفیت کے اعتبار سے اس کی دل چسپیاں وہی ہوتی ہیں جو مجلسی مؤرخ کا اصل سرمایہ ہیں۔ ثقافتی مؤرخ کو بڑے بڑے اور طاقتور لوگوں کے کاموں سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی مثلاً مدبّروں کے ساز باز، سیاست دانوں کی خطابت، سالاروں کی مہارتِ فنِ حرب۔ ان چیزوں سے اس کی دل بستگی صرف اس حد تک ہوتی ہے کہ عوامی اوصاف و خصائص کی وضاحت میں مدد ملے۔ منطقی ضرورت کے مطابق اس کی دل چسپی ایسی چیزوں سے ہوتی ہے۔ کھیل اور مہر و محبت کے آداب، کام اور عبادت کے طریقے، خاندانی روابط، خوراک اور لباس میں عوام کی ترجیحات، نیک و بد کے متعلق عوامی افکار، ان عام چیزوں کی جڑیں ماضی میں بہت گہری ہوتی ہیں۔ جو معلومات ثقافتی ماہرِ بشریات ان متفرق ذریعہ سے احتیاط کے ساتھ جمع کرتا ہے وہی بہ اعتبارِ ردِّ عمل تاریخ کا سرمایہ بن جاتا ہے۔

تاریخ بطور سوانحِ افراد

تاریخ کی ایک شکل اور بھی ہے جو دوسری شکلوں کے متوازی ہے اور سب میں اس نے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے یعنی تاریخ بطور سوانحِ افراد کے۔ تاریخ کا ایک بہت بڑا حصہ ہمارے پاس سوانحِ افراد ہی کی شکل میں آیا ہے۔ عہد نامہ عتیق یعنی بائبل کی مقبولِ عام کہانیاں سوانحِ افراد ہی ہیں مثلاً حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی کہانیاں، داؤد اور نبوت[1] اور اس کے تاکستان کی کہانیاں یا حضرت ایوبؑ کی کہانی۔ پلوٹارک[2] نے یقیناً تاریخ زیادہ سے زیادہ سوانحِ افراد ہی کی شکل میں لکھی ہے اور اس کے یونانی اور رومی مشاہیر کی کہانیاں، ہمارے علم کی حد تک ایسی ہیں جنھوں نے ابتدائی دور کے کلیسائی پادریوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ٹامس کارلائل نے تاریخ کو سوانحِ افراد کی حیثیت میں بڑے زور کے ساتھ پیش کیا ہے:

> دنیا کی تاریخ دراصل ان افراد کی تاریخ ہے جنھوں نے دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا یعنی تاریخ کی تہ میں وہ جلیل القدر افراد ہیں جو کارفرما رہے۔ وہی انسانوں کے قائد تھے۔ وہی عظیم القدر تھے انھی نے ہمارے لیے اعلیٰ درجے کے نمونے مہیا کیے اور درحقیقت

---

[1]: ..بنو زعیل کا ایک شخص جس کا تاکستان سامریہ کے بادشاہ اخی اب کے محل سے ملحق تھا۔ بادشاہ اور اس کی بیوی نے اسے مروا کر اس کے تاکستان پر قبضہ کر لیا تھا۔

[2]: یونانی سوانح نگار (۴۸ - ۱۲۲ء)

> وہی ان سب باتوں کے انجام دینے والے تھے جو عام لوگ انجام دینا اور حاصل کرنا چاہتے تھے......... تاریخِ عالم کے ہر دَور میں ہمیں معلوم ہوگا کہ چند بڑے افراد ہر دور کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر تھے۔ انھی کی بجلی تھی جس کے بغیر ایندھن میں آگ لگ ہی نہیں سکتی تھی۔[1]

اگرچہ دورِ حاضر کے مؤرخوں میں سے صرف چند ہی اس انتہائی تعبیر کو قبول کرنے پر رضامند ہوئے جو تاریخ میں بڑے آدمیوں کے کردار کے متعلق پیش کی گئی ہے۔ لیکن بہت سے مؤرخوں کی کیفیت ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ انگریزی اور امریکی ادب میں سوانحِ افراد کا سرمایہ بہت زیادہ ہے مثلاً باسویل[2] کی حیاتِ ڈاکٹر جانسن[3]، لوک ہارٹ[4] کی حیاتِ سر والٹر سکاٹ[5] جو کئی جلدوں میں ہے یا جیمز اینتھنی فرُوڈ کی حیاتِ کارلائل جس کی چار جلدیں ہیں یا جان مارلے کی حیاتِ گلیڈسٹون[6] جو بڑے اونچے درجے کی کتاب ہے، پھر اس نے والٹیر اور رُوسو پر بھی نہایت عمدگی سے لکھا ہے۔ ونسٹن چرچل کی حیاتِ مارلبرو[7] جو چھ جلدوں میں ہے
25 اور ڈیوک آف مارلبرو چرچل کا جدِ اعلیٰ تھا۔ ٹریولین کی ولولہ انگیز داستانِ گیری بالڈی[8]۔ امریکی ادب
میں بھی ایسی کتابیں ہیں مثلاً:

بیورج کی حیاتِ جان مارشل[9]، فری مین کی حیاتِ رابرٹ لی آرتھر لنک کی حیاتِ ولسن[10]۔

---

[1]: "آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (۱۸۴۱ء) پہلا لیکچر۔

[2]: ڈاکٹر جانسن کا شہرہ آفاق سوانح نگار (۱۷۴۰ – ۱۷۹۵ء)

[3]: انگریزی کا مشہور ادیب اور لغت نگار (۱۷۰۹ – ۱۷۸۴ء)

[4]: سر والٹر سکاٹ کا داماد اور سوانح نگار (۱۷۹۴ – ۱۸۵۵ء)

[5]: انگلستان کا مشہور ناول نگار اور شاعر (۱۷۷۱ – ۱۸۳۲ء)

[6]: انگلستان کا مشہور مدبر اور وزیر اعظم (۱۸۰۹ء – ۱۸۹۸ء)

[7]: انگریز سپہ سالار جس کا نام جان چرچل تھا (۱۶۵۰ – ۱۷۲۲ء)

[8]: اطالوی محب وطن (۱۸۰۷ – ۱۸۸۲ء)

[9]: امریکی قانون دان (۱۷۵۵ – ۱۸۳۵ء)

[10]: (۱۸۵۶ – ۱۹۲۴ء) دو مرتبہ امریکہ کا صدر رہا (۱۹۱۲ سے ۱۹۲۰ء تک) اسی کے چودہ نکات پر جنگ ختم ہوئی تھی۔

لی اون ایڈل کی حیاتِ ہنری جیمز[1] - ان تمام سوانح افراد میں ایک چیز مشترک ہے - یہ تاریخ بھی ہیں اور سوانحِ افراد بھی - یہ اپنے موضوع کو نہایت اعلیٰ پس منظر اور تاریخی آئینے میں رکھ کر سجاتی ہیں - وقت کے تاریخی افکار و وقائع سے ان افراد کا رشتہ جوڑتی ہیں اور اس سے ایک عہد کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کا کام لیتی ہیں - یہ سب اس قسم کی کتابوں سے تعلق رکھتی ہیں جنھیں ہم حیات وزماں کے دبستان سے تعبیر کرتے ہیں - یہ اس ذاتی اور نفسیاتی دبستان سے بالکل الگ ہیں جن کا تعلق لٹن[2]، سٹریچی، آنڈرے ماروا[3] اور امریکی مصنّف گیملیل بریڈ فورڈ[4] -

تاریخ سوانحِ افراد سے دُور نہیں جاتی - قانون یا سائنس جیسے خشک مضامین بھی سوانحِ افراد کے نقطۂ نگاہ سے درخشاں بنائے جاتے ہیں - قطعاً شبہ نہیں کہ ہولڈز ورتھ نے تاریخِ قانونِ انگلستان پر جو پندرہ جلدیں لکھ دیں - اس کے برابر کوئی کتاب آسانی سے نہیں پہنچ سکتی لیکن انگریزی قانون کی تاریخ کو بھی سمجھنا ممکن نہیں جب تک ان افراد کا ذکر نہ کیا جائے جنھوں نے یہ قانون بنایا مثلاً لارڈ کوک[5]، بلیک سٹون[6]، مینس فیلڈ[7]، بینتھم[8]، بروگم[9] اور ایلڈن[10] - امریکہ کے قانونِ دستور کو سمجھنا اس وقت تک بے کار محض ہوگا، جب تک جان مارشل اور جوزف سٹوری[11]، جسٹس فیلڈ اور جسٹس ہومز کی شخصیتیں زیرِ غور نہ لائی جائیں - یہ کوئی اتفاقی سانحہ نہیں کہ امریکی ادب خصوصیت سے ان افراد کے سوانح کے ساتھ معمور ہے،

---

[1] : امریکی فلسفی (۱۸۱۱ – ۱۸۹۲ء)

[2] : (۱۸۰۳ – ۱۸۷۳ء)

[3] : پیدائش (۱۸۸۵ء)

[4] : (۱۸۶۳ – ۱۹۳۲ء)

[5] : (۱۵۵۳ – ۱۶۳۴ء)

[6] : (۱۷۲۳ – ۱۷۸۰ء)

[7] : (۱۷۰۵ – ۱۷۹۳ء)

[8] : (۱۷۴۵ – ۱۸۳۲ء)

[9] : (۱۷۷۸ – ۱۸۶۸ء)

[10] : (۱۷۵۱ – ۱۸۳۸ء)

[11] : (۱۷۹۵ – ۱۸۴۵ء)

جنھوں نے جوڈیشل دائرے میں کام کیا۔ مختصین سائنس کی تاریخ ٹیکنیکل ادب یا خاص سائنس کے ذریعے سے معلوم کر سکتے ہیں۔ عام آدمیوں کے لیے زیادہ فائدہ مند سوانحِ افراد ہی کا ذریعہ ہے۔ امریکی سائنس کی تاریخ ابھی تک لکھی نہیں گئی تاہم امریکہ اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ اس کے پاس اوّل درجے کے سوانحِ افراد کی چند کتابیں موجود ہیں، مثلاً وِلیر کی کتاب "وِلارڈ گبز[1]"، ہنٹر ڈپری کی کتاب "آسا گرے"[2]، بروک ہنڈل کی کتاب "ڈیوڈ رِٹن ہاؤس"[3]، ولیس سٹگنر کی کتاب" ویسٹ آف دی ون ہنڈرڈ تھ میریڈین" (میجر پاول کی سوانح عمری) ایڈون مارٹن کی کتاب" ٹامس جیفرسن، سائنٹسٹ"۔

تاریخ سوانحِ افراد کی شکل میں ہمیشہ دل پذیر رہی ہے۔ اور اس کے دلائل پیش کرنا بہت سہل ہے مثلاً یہ پڑھنے میں خوشگوار ہوتی ہے، اس میں بعض ڈرامائی واقعات آجاتے ہیں، یہ زیادہ رنگین ہوتی ہے، اس میں پیچیدہ مسائل کو شخصیتوں سے وابستہ کر کے سادہ بنا دیا جاتا ہے، اس سے لانگ فیلو[4] کی نظم" سام آف لائف" کے وعدے پر خاص روشنی پڑتی ہے :

جلیل القدر افراد کی زندگیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں
ہم بھی اپنی زندگیوں کو نہایت پاکیزہ بنا سکتے ہیں
اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے پیچھے چھوڑ سکتے ہیں
وقت کی ریت پر پاؤں کے نشان۔

سوانحِ افراد کی مضرتیں

ایسے ہی دلائل کی بنا پر بہت سے پیشہ ور مؤرخ خصوصاً جو ٹیکنیکل تاریخ لکھتے ہیں سوانحِ افراد کو گہرے شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لارڈ ایکٹن نے کہا تھا کہ انفرادی کرداروں سے جو دلچسپی پیدا ہوتی ہے اس سے زیادہ انسان کے تاریخی نظریے کو غیر منصفانہ اور غلط بنانے کا بڑا سبب کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیوئس نیمیر دورِ حاضر کے برطانوی مؤرخین میں

---

[1] : (۱۸۳۹ - ۱۹۰۳ء)۔
[2] : (۱۸۱۰ - ۱۸۸۸ء)۔
[3] : (۱۸۶۹ - ۱۹۴۶ء)۔
[4] : امریکی شاعر (۱۸۰۷ - ۱۸۸۲ء)۔

غالباً سب سے زیادہ با اثر ہے۔ اسے اصرار تھا کہ سوانحِ افراد ایک طرح کا تاریخی کنڈرگارٹن ہیں۔ مؤرخ کو فرد کے مطالعے سے الگ نہ ہونا چاہیے تاہم اس کا تعلق سیاسیات اور اقتصادیات کی ان بڑی قوتوں سے ہونا چاہیے۔ جن کی بنا پر تاریخ کی رفتار متعین ہوئی اور ان بڑے اداروں پر نظر جمائے رکھنا چاہیے جہاں افراد کا اثر محض برائے نام رہ جاتا ہے۔

تاریخ کا کوئی بڑا مسئلہ لے لیجیے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اسے الگ تھلگ رکھ کر سمجھا نہیں جاسکتا۔ یہی معلوم ہوگا کہ آپ سیاسیات، بین الاقوامی روابط، سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات، نفسیات اور اخلاق میں الجھے ہوئے ہوں۔ اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں کہ جیمز فینی مور کوپر[1] کے امریکہ کی کیفیت کیا تھی تو آپ لازماً تاریخِ رومانیت، امریکہ کے قدیم باشندوں یعنی انڈینز کے اوصاف وخصائص، جمہوریت کے متعلق بحث ونزاع، زمین کے متعلق قوانین اور پالیسیاں ایسے ہی بیسیوں دوسرے معاملوں سے مفر نہ ہوگا۔ سپریم کورٹ نے مُن اور ایلی نائے[2] کے مقدمے میں، جو فیصلہ کیا اسے سمجھنے کے لیے زراعت کی تاریخ، امریکہ میں ریلوے کی سرگزشت، سپریم کورٹ کے لیے ججوں کے تقرر کے سیاسیات نیز انگریزی اور امریکی قانون کو سمجھنا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورتیں خاص کمروں میں نہیں رہتے جن پر سیاسیات یا قانون یا مذہب یا اقتصادیات کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ وہ ان تمام دائروں میں بیک وقت زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے دستور لکھے اور قانون کے مسوّدے تیار کیے، انھوں نے مکان بھی بنائے، شادیاں بھی کیں، خاندانوں کی پرورش بھی کرتے رہے، مشینوں پر کام بھی کیا، کتابیں بھی لکھیں، گرجے بھی گئے اور جنگیں بھی لڑیں۔ تاریخ میں تنگ نظری اور محدودیت کا کوئی خطرہ نہیں۔ ٹھیک ٹھیک مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کا ہر باب نئے نئے ابواب کا افتتاح کرتا ہے۔ اچھی تاریخ پر کوئی محدود لیبل بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیرنگٹن کی کتاب "مین کرنٹس اِن امیریکن تھاٹ" تاریخ ہے یا ادبی انتقاد؟ اس کی کون پروا کرتا ہے۔ آپ لیسلی سٹیفن کی کتاب "انگلش تھاٹ اِن دی ایٹینتھ سینچری" کو کس صنف میں رکھیں گے۔ یہ ذہنی تاریخ ہے۔ ساتھ ہی فلسفہ اور دینیات بھی ہے۔ جان مارلے[3] نے والٹیر، دیدرو[4] اور رُوسو کے جو سوانح لکھے ہیں،

۱: (۱۷۸۳-۱۸۵۱ء)۔ ۲: امریکا کی ایک ریاست۔

۳: مشہور مصنف اور وزیرِ ہند (۱۸۳۸-۱۹۲۳ء)۔

۴: فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا کا ایک مصنف (۱۷۱۳-۱۷۸۴ء)۔

انھیں پڑھتے وقت انسان دورِ حاضر کے ہیجان انگیز ذہنی مناقشوں کے بھنور میں پڑ جاتا ہے۔

اگر آپ ٹامس جیفرسن کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم کیجیے جن سے اسے دلچسپی تھی، مثلاً سیاسیات، قانون، فلسفہ، مذہب، ادب، آرٹ، تعمیرات، زراعت، باغبانی، تاریخ، تاریخِ طبیعی، بشریات، تعلیم، کتب خانے اور درجنوں دوسری چیزیں۔ تاریخ زندگی کی تمام چیزوں اور ذہنِ انسانی کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔

تیسرا باب

تاریخ کا مُطالعہ

ولولہ افروز موضوع

کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ ہم کون سی تاریخ پڑھ رہے ہیں؟ جسٹس ہومز نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہر وہ موضوع اہم ہے جس کا مطالعہ پورے زور اور اہتمام سے کیا جائے۔ ایک غبی اور کند ذہن مطالعہ کرنے والا ہیملٹ[1] اور اعلانِ آزادی کو بھی بے لطف بنا سکتا ہے۔ لیکن جس شخص کا قلب و دماغ روشن ہو مثلاً جان لونگ سٹون لوئس[2]۔ وہ مسحور کن کتابیں لکھ سکتا ہے مثلاً لوئس نے کولرج[3] کی نظم کے مآخذ پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی جس کا نام ہے "روڈ ٹو زینا ڈو" والٹن ہملٹن جیسا ہمت ور اور روشن دماغ آدمی دستور کے ایک ابتدائی جملے "مختلف ریاستوں کے درمیان تجارت" پر ایک تخلیقی کتاب لکھ سکتا ہے جس سے صلاحیتِ حکومت پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ درست سہی پھر بھی اس معاملے کی کچھ نہ کچھ حیثیت ہے کہ صاحبِ علم کیا لکھتا ہے یا طالبِ علم کیا پڑھتا ہے۔ بلاشبہ تمام تاریخی موضوع یکساں ہیں لیکن بعض میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ یکسانی ہوتی ہے۔ تاریخ کے تمام دور بے شک دل چسپ ہیں لیکن احیائے علوم کا دور یا انگلستان میں الزبتھ کا دور یا انقلابِ فرانس کا دور معلومات کی بیش بہائی، تنوّع اور بہت سے ضروری معاملات کا حامل ہونے کے اعتبار سے طالبانِ علم کے لیے خاص طور پر جوش انگیز ہیں اور نسلوں سے یہی سلسلہ چلا آرہا ہے۔ یہی جوش اعلیٰ درجے کے ادب میں سرایت کر گیا ہے۔

یہ بہرحال ایک سیدھا سادا سا معاملہ ہے۔ یقیناً ماں کی نگاہوں میں اپنا بچہ خوبصورت

---

1 : شیکسپیر کا مشہور ڈراما۔

2 : امریکی ماہرِ تعلیم (۱۸۶۷ء — ۱۹۴۵ء)

3 : انگلستان کا مشہور شاعر (۱۷۷۲ - ۱۸۳۴ء)

ہوتا ہے۔ اور ایک سو سے زائد شعراء کی تصدیق کے مطابق ہر محبوبہ محب کی نظروں میں خوبصورت ہوتی ہے۔ لیکن دنیا ان فیصلوں کو لازماً تسلیم نہیں کرتی اور وہ اپنے ہی معیارِ حُسن یا معیارِ خیر یا دل چسپی کی پابند رہتی ہے۔ یقیناً ہمارے دوستوں جان ڈو اور رچرڈ روٹ[1] کی داستانِ حیات ویسی دل چسپ نہیں جیسے ابراہام لنکن یا رابرٹ لی کی ہوسکتی ہے اور دنیا بھر کی سحر کاری ان دوستوں
۲۸ کی داستان کو زیادہ دل چسپ نہیں بنا سکتی۔ ۱۸۴۸ء کے محاصل نامے کی تاریخ پر کوئی مؤرخ اپنی صلاحیتیں کتنی ہی خوبی سے صرف کرے وہ اس موضوع کو ویسا دل کش نہیں بنا سکتا جیسے امریکا کے وفاقی دستور کے لکھے جانے کی تاریخ ہے۔ لندن میں ہیرڈ[2] کے سٹور کی تاریخ کتنی ہی شاندار ہو لیکن وہ حملہ آور ہسپانوی بیڑے[3] کی تاریخ کے برابر نہیں آسکتی۔ یہ کوئی اتفاقی سانحہ نہیں کہ کاروباری آدمیوں کی تمام داستان ہائے حیات ناکام رہیں۔ اگرچہ ان پر کتنا ہی روپیہ صرف ہوا ہو۔ اس کے مقابلے میں جیفرسن یا ڈزرائیلی[4] یا ونسٹن چرچل پر تقریباً ہر کتاب دل چسپ ہوگی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیری کلیز[5] ایتھنز یا فلارنس کے دورِ احیائے علوم یا وفاقی دستور یا امریکی خانہ جنگی کا مطالعہ ہر حال میں قابلِ توجہ ہے۔ نسلوں سے بڑے بڑے مصنفوں کی توجہ انہی یا اسی قسم کے مضامین پر جمی رہی اور طالبِ علم کو یقین رکھنا چاہیے کہ ایسی کتابوں سے وہ کثیر مفید معلومات حاصل کرے گا۔ ٹھیک اسی طرح ہم آرٹ کے ان دوروں کا مطالعہ کرنے کی طرف مائل رہتے ہیں جس میں بڑے بڑے فن کار پیدا ہوئے، مثلاً لیونارڈو[6] رفائیل[7]، مائیکل انجلو[8] نیز تاریخِ موسیقی کے ان ابواب میں دل چسپی لیتے ہیں،

---

[1]: یہ فرضی نام ہیں۔

[2]: لندن کا ایک مشہور سٹور جہاں سب چیزیں ملتی تھیں۔

[3]: "آرمیڈا" جس نے ۱۵۸۸ء میں برطانیہ پر حملہ کیا لیکن ناکام رہا۔

[4]: انگلستان کا یہودی مدبّر، جو کئی مرتبہ وزیر اعظم رہا (۱۷۶۶ - ۱۸۴۸ء) ۱۸۱۷ء میں وہ عیسائی ہوگیا تھا۔

[5]: ایتھنز کا مدبّر (۴۹۹ قبل مسیح - ۴۲۹ قبل مسیح)۔

[6]: اٹلی کا مشہور فنکار مصوّر (۱۴۵۲ - ۱۵۱۹ء)۔

[7]: اٹلی کا مشہور مصوّر فنکار (۱۴۸۳ - ۱۵۲۰ء)۔

[8]: یہ بھی اٹلی کا مصوّر اور فنکار ہے (۱۴۷۵ - ۱۵۶۴ء)۔

جن میں باخ [1]، ہیڈن [2]، موزارٹ یا بیتھوون کے حالات اور کام کا ذکر آجائے۔ لہٰذا اگر ہم تاریخ کے ان ابواب کا مطالعہ کرنے کو ترجیح دیں جنھوں نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کیے یا بڑے بڑے مؤرخوں کے دلوں میں لکھنے کا جذبہ پیدا کیا تو ہمیں قابلِ معافی سمجھا جائے۔

غرض مطالعے کے لیے تاریخ کے بعض حصّوں کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تاریخ کے انہی حصّوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جنھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اوّل درجے کے قلوب کو اپنی طرف جذب کیا، اور جن کی توضیح کے لیے بہترین صلاحیتیں صرف کی گئیں۔ یونانِ قدیم کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے کیونکہ ہر دور کے عظیم ترین شاعروں، ڈرامانگاروں اور مؤرخوں نے یہ تاریخ لکھی ہے اور کم و بیش دو ہزار سال تک یونان تمام انسانوں کے قلوب پر سحرکارانہ طریقے سے اثرانداز رہا ہے۔ اطالوی احیائے علوم کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے کیونکہ یہ تاریخ آپ کو فلارنس، سینا [3]، روما، میلان اور وینس لے جائے گی اور بے شمار عالی دماغ انسان آپ سے پیشتر وہاں پہنچے اور جو کچھ انھوں نے دیکھا، اس کی یادگار محفوظ کردی مثلاً سیلینی [4]، میکیاولی، کیسٹگلیانی [5] اور گوٹی کی آرڈینی۔ ہمارے معاصرین میں سے جیکب برک ہارٹ جان سیمنڈز، فرڈی ننڈ شیول، برنارڈ، برنسن قابلِ ذکر ہیں۔ پیوریٹن تاریخ کا مطالعہ کیجیے یا وفاقی دستور کی ترتیب پیشِ نظر لائیے۔ یا جیفرسن کے عہدِ حکومت کے متعلق معلومات حاصل کیجیے، کیونکہ آپ اس طرح اونچے درجے کی صلاحیت کے انسانوں کی محبت سے فائدہ اٹھائیں گے جن کے کردار اعلیٰ تھے اور یہاں آپ کو ان مؤرخوں کی رہنمائی مل جائے گی جن کی ادبی اور علمی صلاحیتیں بہت بلند درجے کی تھیں۔ ہیز یا ہیری سن [6]، یا کُولج [7] کے عہدِ حکومت کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا۔

---

[1] : جرمن موسیقار (۱۶۸۵ — ۱۷۵۰ء)۔

[2] : آسٹروی موسیقار (۱۷۳۲ — ۱۸۰۹ء)۔

[3] : اٹلی کا شہر جو فلارنس کے جنوب میں ساٹھ میل دُور ہے۔

[4] : (۱۵۰۰ — ۱۵۷۱ء)۔

[5] : (۱۴۷۸ — ۱۵۲۹ء)۔

[6] : یہ دونوں امریکا کے صدر تھے ——— جن کے عہد کا کوئی واقعہ قابلِ ذکر نہیں۔

[7] : یہ بھی امریکا کا صدر تھا۔

ذوق اور ذہنی ارتقا

تاریخ کے مطالعے کا دُوسرا قاعدہ بھی ویسا ہی بنیادی ہے یعنی اپنے ذوق اور ذہنی ارتقا کے لیے پڑھنا چاہیے۔ تاریخ نئی دنیائیں سامنے لاتی ہے۔ جس طرح جغرافیائی انکشافات اور سائنس نئی دنیاؤں کا دروازہ کھولتی ہیں۔ یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ تاریخ دونوں باتوں کی حامل ہے۔ ہم تاریخ کے صفحات پر دریافت کے جوش و دلچسپی میں حصّہ دار بن سکتے ہیں۔ ہکلوٹ[1] سوسائٹی نے نیلی
جلدوں کی سحر انگیز کتابیں چھاپی ہیں۔ ہم انھیں پڑھیں تو فرانسس ڈریک[2]، مارٹن فروبشر[3]، اور ۲۹
کیپٹن کُک[4] کے ساتھ کرۂ ارض کے ان حصّوں میں سفر کرسکتے ہیں جہاں یہ لوگ گئے۔ بیزلے کی کتاب "ڈان آف ماڈرن جیاگرفی" کے صفحات پر ہم کرۂ ارض کے مختلف حصّوں کی دریافت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ جب نقشے بنانے کی ابتدا ہوئی۔ پرکار اور اسطرلاب دریافت ہوئے۔ یہ سب سے بڑے جغرافیہ دان مؤرخوں کا دور تھا۔ الیگزنڈر فان ہمبولٹ[5] کے ساتھ ہم نئی کائنات میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جغرافیائی دریافتوں کی سب سے پُرجوش کہانی امریکہ ہی میں ملتی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں برنارڈ ڈیووٹو کے ساتھ نیو فاؤنڈ لینڈ سے بحرالکاہل تک سلطنت کی راہ و روش کیا رہی۔ یا ہم اس باب کے کسی ایک حصّے کی کہانی پر توجہ جما سکتے ہیں اور کنکٹی کٹ[6] کے جان لیڈیارڈ[7] کی مھموں

---

۱ : رچرڈ ہکلوٹ (۱۵۵۲ — ۱۶۱۶ء) نے پرانی جغرافیائی دریافت کی کتابیں جمع کرکے چھاپنی شروع کی تھیں، پھر اس کے اعزاز میں ہکلوٹ سوسائٹی کی بنیاد پڑی (۱۸۴۶ء) جس نے بے شمار جغرافیائی کتابیں چھاپیں۔

۲ : الزبتھ کے عہد کا مشہور انگریز ملّاح اور مکتشف (۱۵۴۵ — ۱۵۹۶ء) اس نے ہسپانیہ پر سب سے بڑی ضرب لگائی۔

۳ : انگلستان کا مشہور ملّاح (۱۵۳۵ء — ۱۵۹۵ء)۔

۴ : انگلستان کا منچلا ملّاح (۱۸۰۸ — ۱۸۹۲ء) اس نے کئی نئی زمینیں دریافت کیں۔

۵ : جرمن مکتشف اور سائنس دان (۱۷۶۹ — ۱۸۶۹ء)۔

۶ : امریکہ کی ایک ریاست۔

۷ : (۱۷۸۹ — ۱۸۵۱ء)

سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں یا لیوئس اور کلارک[1] کی مہموں کے روز ناموں کے مطالعے میں غرق ہو سکتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ابھی بالکل ابتدائی دور میں ہے اور زیادہ جوش افزا نہیں۔ جوزف نیڈھم نے ایک کتاب کئی جلدوں میں لکھی ہے جس کا نام ہے" سائنس اینڈ سویلائزیشن اِن چائنا"۔ ہربرٹ بٹرفیلڈ نے کہا ہے کہ یہ ہمارے دور کی نہایت اہم تاریخی تصنیف ہے اور حد درجہ سوفسطائی وضع کے لوگوں کے لیے بھی نئی دنیاؤں کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہی کیفیت جارج سارٹن کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس" کی ہے۔ یہ پانچ جلدوں میں ہے۔ اگر یہ کتابیں بہت بوجھل محسوس ہوں تو یہاں ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں سب کچھ اختصار سے بیان کیا گیا ہے اور خاصی مسحور کن ہیں جیسے جیڈین کی کتاب" میکانائزیشن ٹیکس کمانڈ" یا لورن ایزلے کی نہایت عمدہ کتاب" ڈارونز سینچری" یا ڈینیل بورسٹن کی کتاب" لاسٹ ورلڈ آف ٹامس جیفرسن" یا لیوئس ممفورڈ کی انتقادی کتاب" ٹیکنکس اینڈ سویلائزیشن"۔

تاریخ میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور پہنائی بھی۔ اس کے ذریعے ہم زمانۂ ماضی کی عظیم القدر شخصیتوں کے افکار وکردار میں داخل ہوتے ہیں اور تعارف کا وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جو ہمارے دور میں یا ہمارے معاشرے کے اندر ناقابلِ تصوّر ہے۔ اس پہلو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خاندانی تاریخ کو ہزار گنا بڑھا دینے کا معاملہ ہے۔ اس طرح ہم ماضی کے دوسرے معاشروں سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ان میں ایسے معاشرے بھی شامل ہیں جنھیں وقت کی لہریں اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔ جیسے اٹرسکن[2]، ازٹک، اِنکا اور وائکنگ[3]۔

تاریخ ہمیں انسانی تجربے کے ایسے دوروں میں پہنچا دیتی ہے جو نہایت ولولہ افروز ہیں اور ہمیں اس کے عظیم ترین کرداروں سے آگاہی حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ایسی گہری آگاہی جیسے ان لوگوں کے احباب و رفقا کو حاصل تھی۔ ان عظیم کرداروں میں سے مثال کے طور پر لیونارڈو، جیفرسن، گوئٹے اور لنکن پیش کیے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کے ذریعے ہم ان بڑے

---

[1] : ان دونوں نے ۱۸۰۴ء سے ۱۸۰۶ء تک اکٹھے سفر کیا اور بحرالکاہل تک پوری کیفیت لکھ دی تھی۔

[2] : اٹلی کا ایک طبقۂ آبادی جو رومیوں سے پہلے وہاں موجود تھا۔ اب ناپید ہے۔

[3] : سکنڈے نیویا کے چند گروہ جنھوں نے یورپ کے شمالی ساحلوں پر قزاقانہ حملے کیے۔

لوگوں کے ہر فعل اور ہر عمل کی حقیقت جان سکتے ہیں۔ یہی کیفیت ہمارے لیے ان کے خطوط، ان کے روزنامچے اور ان کی یادداشتیں مہیا کرتی ہیں۔ یہ یادداشتیں ان کے عہد میں موجود نہ تھیں۔ غرض ہم ان کے ہر فکر میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تاریخ کا نہایت دل خوش کن پہلو ہے اور یہ ایسا پہلو ہے کہ عالی شان تخلیقی ادبیات میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔

تاریخ کا ہر طالب علم اپنے آپ سے وہی چیز کہہ سکتا ہے جو ورڈز ورتھ [1] نے ٹوسائیں لا اوورٹیور [2] سے کہا تھا:

"تیرے ساتھی بہت بڑے ہیں۔
تیرے دوست شادمانیاں ہیں، جاں کنیاں ہیں۔
محبت ہے اور انسان کا ناقابلِ تسخیر قلب"

تاریخ اور غالباً محض تاریخ ہمیں عظمت کے ساتھ زندہ رہنے کی اجازت دیتی ہے۔

٣٠ تاریخ کا طالب علم سٹیفن سپنسر کے الفاظ میں کہہ سکتا ہے:

"میں مسلسل ان لوگوں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں جو حقیقتہً بڑے تھے
.. ..
ان لوگوں کے نام جنھوں نے جیتے جی زندگی کے لیے جنگ کی
جن کے دلوں کے مرکز بھڑکتی ہوئی آگ کی بھٹیاں تھے
جو سورج سے پیدا ہوئے اور کچھ عرصے تک سورج ہی کی طرف مصروفِ سفر رہے
اور اپنی عزت کے نقش صاف فضا پر چھوڑ گئے۔"

غرض تاریخ کے مطالعے میں اہم چیز یہ ہے کہ ہم بڑے لوگوں کو رفاقت کے لیے چنیں۔ ہم بہ طیبِ خاطر ان لوگوں پر اپنی زندگیاں قربان کرنے پر آمادہ نہ تھے جو ہر جوہر سے خالی تھے۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اپنی دفاعی صلاحیتیں حقیر اور غیر دلچسپ لوگوں پر صرف کرتے۔ حقیر لوگوں پر توجہ جمانے سے نمود و نمائش اور سطحیت پیدا ہوتی ہے۔ یقین رکھنا چاہیے کہ مؤرخین غلطیوں اور خطاؤں سے پاک نہ تھے۔ قطعاً شبہ نہیں کہ جس قلب و ذہن میں تخلیقی جوہر ہو وہ ان وقائع میں

---

[1]: انگلستان کا مشہور شاعر (١٧٧٠-١٨٥٠ء)۔

[2]: یہ دراصل ایک نظم جزیرہ ہیٹی کے آزاد کنندہ کے متعلق ہے، جو ١٧٤٦ء میں پیدا ہوا اور ١٨٠٣ء میں مر گیا۔ اس کی داستان بڑی عجیب و غریب ہے۔

ڈرامائیت اور اہمیت تلاش کر لیتا ہے جن سے لمبی مدت تک تغافل برتا گیا اور انھیں کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ جب آپ تاریخ کے بعض بڑے دوروں اور بعض ممتاز مؤرخوں سے تعارف پیدا کر لیں گے تو آپ اپنے طور پر چھان بین اور غور و تحقیق شروع کر سکیں گے۔

منظم طریقِ مطالعہ

تاریخ کے پڑھنے کا تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے منظم طریق پر پڑھا جائے۔ متفرق طریق پر اور بلا امتیاز پڑھنے کے سوا وقت ضائع کرنے والی چیز کوئی نہیں اور ایسا مطالعہ آخر میں دلچسپی بھی زائل کر دیتا ہے۔ اس سے مراد ہے ایسا مطالعہ جو کسی فضائی سفر میں ایئر ہوسٹس کوئی میگزین دے دے اور اس میں کچھ پڑھ لیا جائے۔ دوسرے معاملات کی طرح تاریخ میں بھی ترتیب، نظم اور قواعد کی پابندی حد درجہ لازم ہے۔ جو شخص پیانو چھوڑ کر سارنگی، پھر بانسری اختیار کرے گا اور کسی ایک میں بھی کمال پیدا نہ کر سکے گا وہ موسیقار نہ بن سکے گا۔ جو شخص فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور ہسپانوی زبان یکے بعد دیگرے اختیار کرتا جائے گا اور کسی ایک میں بھی مہارت پیدا نہ کرے گا تو اس کے لیے ماہرِ لسانیات بننے کی نوبت کبھی نہ آئے گی۔ تاریخ کا مجموعہ بہت عظیم الشان ہے۔ کم و بیش بیس ہزار جلدیں صرف انقلاب فرانس سے متعلق ہیں اور تقریباً اتنی ہی کتابیں امریکی خانہ جنگی کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی شخص شیکسپیر اور اس کے عہد کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا چاہے تو اسے کم از کم اڑھائی لاکھ جلدیں پڑھنی پڑیں گی۔ تاریخ کے ہر دور کے متعلق معلومات حاصل کرنے یا ہر ملک کی تاریخ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دیوانہ بنا لے۔

اصل مطلوب شے یہ ہے کہ نظم و ترتیب اور سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ٹھوس کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کا نہیں جو خام اور سطحی سمجھی جاتی ہیں۔ تتلی کی طرح ہر جاذب شے پر جا بیٹھنا اور کچھ چوس لینا ایسا طریقہ ہے جو وقتی جذبوں پر مبنی ہوتا ہے اور انسان جلد ہی اس سے سیر ہو جاتا ہے۔ اگر آپ امریکی خانہ جنگی میں دلچسپی رکھتے ہیں تو سب سے پہلے ڈگلس فری مین کی وہ چار ضخیم جلدیں پڑھیے جو رابرٹ لی پر لکھی گئی ہیں۔ پھر ان تین جلدوں کا مطالعہ کیجیے جو رابرٹ لی کے نائبوں کے حالات پر ہیں۔ اس مطالعہ کے بعد آپ کے دل میں جنگ کے متعلق ایک گہرا اور گرم جوشانہ جذبہ پیدا ہو جائے گا اور آپ اس حقیقت سے بھی آگاہ ہو جائیں گے کہ ایک بڑے آدمی کے ساتھ وقت گزار چکے ہیں اور اس بڑے آدمی کو آپ نے دوسرے بڑے آدمی یعنی ڈگلس فری مین کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

پھر آپ ایک اور ٹھوس تصنیف پر توجہ فرمائیے یعنی ایلن نیونس کی عالی شان کتاب "آرڈیل آف دی یونین"۔ یہ کتاب آپ کو ۱۸۵۰ء کی مصالحت سے اپومیٹکس[1] تک پہنچا دے گی اور آٹھ جلدوں میں ہے۔ یا بروس کیٹن کی کتاب پڑھیے جو تین جلدوں میں ہے اور پوٹومیک[2] کی فوج کے متعلق ہے۔ اس میں یونین فوج کی زندگی کی ڈرامائی تفریحات پیش کی گئی ہیں یا سینڈ برگ کی وہ نظمیں پڑھیے جو لنکن کی خدمت میں خراجِ تحسین کے طور پر پیش کی گئیں۔ اس وقت تک آپ سٹیفن بینٹ کی رزمیہ نظم پڑھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یعنی جان براؤنس باڈی۔ اب بھی اسے جنگ کے متعلق بڑی اہم کتاب سمجھا جاتا ہے۔ تاریخی ناولوں کو بھی اس سلسلے میں ایک مقام حاصل ہے۔ ہماری تاریخ کا کوئی دور نہیں جس نے اس پیمانے پر اچھے ناول نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہو۔ یا جس پر پڑھنے کے قابل اتنے اچھے ناول لکھے گئے ہوں۔ آپ ایسے ناولوں میں منہمک ہو سکتے ہیں جیسے ڈی فارسٹ کا ناول "مس ریوینلس کنورشن" یا چرچل کی کتاب "دی کرائسس" یا ہمارے دور میں جنگ کی حقیقی تخلیقات جیسے ایولن سکاٹ کی کتاب "دی ویو" اور میکنلے کینٹر کی کتاب "اینڈرسن وِل"۔

اس وقت تک آپ ثانوی درجے کی خاصی تصانیف دیکھ کر سیر ہو گئے ہوں گے اور آرزو یہ ہوگی کہ موضوع کے اصل مآخذ کی طرف متوجہ ہوں یعنی مکاتیب، روزنامچوں، اور یادداشتوں کا وسیع ذخیرہ جو اصل موضوع کے سرکاروں نے وراثت میں چھوڑا۔ پھر اخبار نویسوں، اور سیاحوں کے دلچسپ بیانات، بہت سے فن کاروں کی روئدادیں ان کے علاوہ ہیں سرکاری کاغذوں، سیاسی، سفارتی اور فوجی ریکارڈوں کے زبردست انبار جو اتنے زیادہ ہیں کہ ایک مؤرخ ان پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اس بھول بھلیّاں میں سے جو مآخذ کے متعلق موجود ہے راستہ پیدا کرنے کا کام بڑا حوصلہ فرسا ہے لیکن مقامِ مسرت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے پیشتر دوسرے اصحاب ان سب کا جائزہ لے چکے ہیں۔ انھوں نے نقشے مرتب کر دیے ہیں، اور راستوں کی نشاندہی فرما دی ہے۔

آپ کو ڈپلومیسی کے بحرِ بیکراں میں ادھر ادھر پھرنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا جائے گا۔

---

[1] : یہ ورجینیا کے ایک دریا میز ایک شہر کا نام ہے جہاں اپریل ۱۸۶۵ء میں جنوبی ریاستوں کی فوجوں نے شمالی ریاستوں کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالے اور خانہ جنگی ختم ہوئی۔

[2] : ایک دریا کا نام جس کے نام سے فوج معروف ہوئی۔

آڈسلے وہاں موجود ہوگا۔ جو آپ کی رہنمائی کے لیے "کنگ کاٹن ڈپلومیسی" کے ساتھ موجود ہوگا ای۔ ڈی ایڈمز کے ہاتھ میں دو جلدوں کی کتاب ہوگی جس کا نام ہے "گریٹ برٹین اینڈ دی امیریکن سول وار"۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے فضلا ہوں گے جن کی تعداد کوڑیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ جنگِ گیٹس برگ[1] کے ریکارڈوں میں بے مقصد سرگرداں نہیں رہیں گے۔ ایک درجن سوانح نگار اور ایک کوڑی فوجی مؤرخ آپ کی رہنمائی کے لیے موجود ہوں گے۔ آپ کو خود کنفیڈریسی یا جنوبی ریاستوں کی شکست کے اسباب پر دماغ کھپانے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سیکڑوں کتابیں نہ محض نظریات اور توضیحات مہیا کر چکی ہیں بلکہ ان میں وہ نوٹ اور حوالے بھی درج ہیں جو آپ کو ماخذ تک پہنچا سکتے ہیں تاکہ آپ خود صحیح نتائج پر پہنچ جائیں۔

جیفرسن کی شخصیّت

یا فرض کیجیے کہ ٹامس جیفرسن کے متعلق مطالعے کا ذوق آپ کے دل میں پیدا ہو چکا ہے،
تو یقین رکھیں کہ اس ذوق سے آپ کو بہت حظ حاصل ہوگا اور کوئی دوسری شخصیت جیفرسن سے
بہتر نہ ملے گی جو تعارف کے وعدے کو بہتر طریق پر پورا کر سکے۔ اس باب میں بھی بے شمار کتابیں
موجود ہیں۔ آپ کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ بہت سی عمدہ سوانحی کتابوں میں سے ایک کتاب
لے کر شروع کریں۔ مثلاً فرانسیسی امریکی فاضل گلبرٹ شینارڈ کی کتاب یا ماری کنبل کی تین
مسحور کن جلدیں یا ڈیوماس میلون کے مرتّبہ سوانحِ حیات جو تا حال نامکمل ہیں۔ جب آپ کو
معلوم ہو جائے گا کہ آپ جیفرسن سے کس خصوصیت سے زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں، تو آپ
چاہیں گے کہ زیادہ ضخیم تحریرات آپ کے سامنے آ جائیں۔ ایسی تحریرات کے دو ذرا پرانے ایڈیشن ٣٢
ہیں۔ ایک شاندار ایڈیشن اب تیار ہو رہا ہے جس کی سترہ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ یہ کتاب
جیفرسن کے سب سے بڑے فاضل نے ایڈٹ کی ہے۔ یعنی جولین بائڈ نے۔ اب آپ کے
دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ اس ذوفنون نابغے کی زندگی کے خاص پہلوؤں کے متعلق مختلف
مقالے ملاحظہ فرمائیں۔ اس سلسلے میں آپ کے سامنے بہت سی کتابیں آ جاتی ہیں مثلاً کارل لہمن
کا مقالہ "ٹامس جیفرسن، امیریکن ہیومنسٹ" یا جیمز کونینٹ کے لیکچر "جیفرسن اینڈ دی
ڈیویلپمنٹ آف امیریکن ایجوکیشن" یا ایڈون مارٹن کی نہایت دل چسپ کتاب "ٹامس جیفرسن،
سائنٹسٹ" یا فِسکے کِمبل کی مستند کتاب "ٹامس جیفرسن آرکیٹیکٹ" یا ایڈورڈ ڈمبالڈ کی

---

[1]: امریکی خانہ جنگی کا فیصلہ کُن میدان جو اب قومی قبرستان ہے۔

دل چسپ کتاب "ٹامس جیفرسن امیریکن ٹورِسٹ"۔ اگر آپ کو سیاسیات سے دل چسپی ہے تو کئی جلدیں موجود ہیں جو بے مثال ہنری ایڈمز نے اپنی تاریخ میں جیفرسن کے لیے وقف کر دی یا ڈپلومیٹ مؤرخ کلاڈ باورز کی دو جلدیں "جیفرسن اینڈ ہملٹن" اور "جیفرسن، ان پاور" یا ولٹسے کی کتاب "جیفرسونین ٹریڈیشن ان امیریکن پالٹیکس"۔ چارلز اے بیرڈ نے "اکنامک اورجنز آف جیفرسونین ڈیموکریسی" کا سراغ لگایا ہے۔ لیونارڈ وائٹ نے جیفرسن کی انتظامی کارروائیاں بیان کی ہیں اور اس دور کو جیفرسن کا دور کہا جاتا ہے۔ میرل پیٹرسن نے "جیفرسونین امیج ان دی امیریکن مائینڈ" کا سراغ لگایا ہے۔

لیکن یہ ایک اعتبار سے مطالعے کا محض آغاز ہے۔ آپ جیفرسن کا اندازہ خلا میں نہیں کر سکتے۔ ضروری ہے کہ آپ اس کے رفقا، شرکائے کار اور شاگردوں سے تعارف پیدا کریں۔ ان لوگوں کو سمجھیں جو ذہنی اعتبار سے اس کے ساتھی تھے اور فلسفے میں اس کے پیشرو تھے۔ مقامِ مسرت ہے کہ یہ لوگ بھی تعارف کے اہل ہیں مثلاً جیمز میڈیسن پچاس سال تک جیفرسن کا شاگرد اور دوست رہا۔ اس دوستی کا پورا سراغ ایڈرین کوچ نے لگایا ہے جس نے دونوں شخصوں پر ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ کو یہ خواہش ہوگی کہ اروِنگ برانٹ کی چھ جلدوں کا مطالعہ کریں جو اس نے میڈیسن کے سوانح حیات پر لکھیں یا آپ خود میڈیسن کے مقالے اور خطوط پڑھنے کے خواہاں ہوں گے جو گیلارڈ ہنٹ نے ایک پرانی جلد میں جمع کر دیے تھے یا میڈیسن کے متعلق کاغذات کا نیا ایڈیشن دیکھنے کے خواہاں ہوں گے جو اس وقت زیرِ ترتیب ہے۔ ایلبرٹ گیلاٹن سوئٹزرلینڈ کا ایک فرد تھا جس نے اپنی تقدیر امریکہ سے وابستہ کر دی اور جیفرسن کے عہد میں خزانے کا سیکرٹری بن گیا۔ وہ جیفرسن کے حلقے کا خاص رکن تھا۔ ہنری ایڈمز نے اس کی بھی ایک فاضلانہ سوانح عمری لکھ دی ہے اور اس کی تحریرات دو ضخیم جلدوں میں ایڈمز ہی نے جمع کر دی ہیں۔ آپ جیفرسن کا تصوّر اس کے مدت العمر دوست کے بغیر بمشکل ہی کر سکیں گے جو کبھی اس کا مخالف بھی رہا یعنی جان ایڈمز۔ وہ دونوں پچاس سال تک اکٹھے کام کرتے رہے اور عجیب امر یہ ہے کہ دونوں ایک ہی دن مرے اور یہ واقعہ امریکہ کے اعلانِ آزادی سے ٹھیک پچاس سال بعد کا ہے۔ ایڈمز سے تعارف بھی خاصا بڑا کام ہے۔ یہ اتنا ہی بڑا اور ویسا ہی دلچسپ ہے جیسا کہ خود جیفرسن سے تعارف۔ گلبرٹ شینارڈ اور پیج سمتھ نے بڑے اچھے سوانح لکھے ہیں۔ ایڈمز کے سیاسی افکار کا ایک قابلِ قدر مطالعہ ایڈورڈ ہنڈلر نے کیا ہے۔ زولٹن ہراسٹی نے اس کا سلسلہ فرانسیسی فلسفیوں سے جوڑا ہے، اس کا نام ہے "جان ایڈمز اینڈ دی پرافٹس آف پراگریس"۔ لیکن آپ خود ایڈمز کو پڑھنا چاہیں گے یعنی

اس کی "ڈائری" اور "آٹو بایو گرافی" دوبارہ چار بڑی جلدوں میں چھپ چکی ہیں۔ اس کی خط و کتابت اور متفرق تحریرات کا ایک نیا ایڈیشن جلد تیار ہو جائے گا جو لائمن بٹر فیلڈ نے۔ تب کیا ہے لیکن جیفرسن سے تعارف مکمل کرنے کے لیے اس کے رفیقوں کے علاوہ یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ اس کے ذہنی اور فلسفی پیشرو کون ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو اس کے نادر کتب خانے کی فہرست پر متوجہ ہونا چاہیے جس کی پانچ جلدیں مس ملی سنٹ سوربی نے مرتب کی ہیں اور بانڈ نے اس کے کاغذات پر مفصل حواشی لکھے ہیں پھر جیفرسن کے فرانسیسی رفیقوں کے بہت سے مقالے ہیں جو گلبرٹ شینارڈ نے جمع کیے ہیں نیز جان مارلے، کارل بکر، ارنسٹ کیسیرر، پال ہیزرڈ، باسل ولی اور بیسیوں دوسرے ارباب تعبیر کی تحریریں ہیں۔ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جیفرسن کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا ایک سال نہیں بلکہ ایک زندگی کا کام ہے لیکن یہ ہر بڑے اور وسیع موضوع کے متعلق حقیقت" درست ہے۔

خاص سے عام کی طرف

تاریخ کے مطالعے کا چوتھا قاعدہ یہ ہے کہ ہمیشہ خاص سے عام کی طرف توجہ کی جائے۔ عام سے خاص کی طرف رخ کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ جن کتابوں میں عام چیزیں جمع کر دی جائیں یا کسی چیز کا خاکہ یا ہر چیز کا سرسری جائزہ ہو وہ دماغ کو یقیناً زنگ لگا رہی ہے۔ تاریخ کا طریقہ سائنس کا طریقہ ہے یعنی استنباطی اور تجربی۔ یہ قانون کا قاعدہ ہے یعنی ہر مقدمے کے حالات کا مطالعہ کیا جائے۔ آرٹ میں بھی اسی طریقے سے کام لیا جاتا ہے۔ یعنی تشریح الاعضا کے مطالعے سے آغاز کیا جاتا ہے۔ پھر رنگوں کے معاملے میں مہارت پیدا کی جاتی ہے یا پتھر کی وضع قطع ہیئت اور نوعیت دیکھی جاتی ہے۔ غرض آپ خاص سے شروع کریں یعنی کسی فرد یا کسی واقعے یا کسی ادارے کا مطالعہ پیش نظر رکھ لیں اور ان سے عمومی موضوعات پر توجہ کی جائے۔ کیا آپ ریاستہائے متحدہ کے دستور سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ تو صحیح صورت یہ ہے کہ اصل دستور کا مطالعہ کریں پھر وفاقی کنونشن میں اس پر جو بحثیں ہوئیں انھیں پڑھیں (یہ بحثیں میکس فیرنڈ نے بڑی خوش اسلوبی سے مرتّب کر دی ہیں) پھر ان بحثوں کو پیش نظر لائیں جو دستور کی توثیق کے کنونشن میں ہوئیں انھیں عموماً ایلیٹ کی بحثیں کہا جاتا ہے۔ وفاقیوں کے کاغذات بار بار پڑھیے۔ دستور سازی اور سیاسی فلسفے پر یہ نہایت گہرا انتقاد ہے جو ہمارے ملک میں لکھا گیا۔ ان کے کئی نہایت اچھے ایڈیشن ہیں۔ اب آپ وفاقی تاریخ کے مطالعے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ دستاویزوں کی ایک اچھی کتاب میں آپ کو بہت سے بنیادی قوانین، اعلانات، صدارتی خطبے اور عدالتی رائیں

مل جائیں گی۔ سپریم کورٹ کی ایک نہایت اچھی تاریخ چارلز وارن نے لکھی۔ اگرچہ وہ اب پرانی ہو چکی ہے تاہم بلاشبہ بہترین کتاب ہے۔ پھر چند شخصی سوانح کی کتابیں پڑھ لیجیے، مثلاً بیورج کی ضخیم کتاب مارشل پر یا چارلز فیربین کی کتاب "جسٹس ملر" یا ایلفس میسن کی کتاب "چیف جسٹس سٹون" یا میکس لرنر کی کتاب "مائینڈ اینڈ فیتھ آف جسٹس ہومز"۔ یہ کتابیں دستوری نظام کی پیچیدگیوں اور اُلجھنوں کو واضح کر دیں گی جو ہمارے دستوری قانون اور تاریخ کا جوہر اور ست ہیں۔ ان کتابوں کی جلدیں پونے چار سو کے قریب ہیں۔ یہاں آپ کو ماہر فن کی رہنمائی کی ضرورت ہو گی۔ خوش قسمتی سے مقدمات کی کم و بیش ایک کوڑی روداد یں ہیں جن میں اونچے درجے کے فیصلے آ گئے ہیں۔ جس وقت آپ دستور اور عدالتی فیصلوں کا مطالعہ اچھی طرح کر لیں گے تو آپ نہ محض امریکی دستوری نظام سے بخوبی آشنا ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی امریکی سیاسیات، اقتصادیات اور معاشرے کے بیشتر مسائل سے بھی شناسا ہو جائیں گے۔

افسانوں کی کتابیں

یہ بتا دینا مناسب ہے کہ عام خوانندۂ کتاب ماضی کے متعلق احساسات رسمی مؤرخوں کی تحریرات سے حاصل نہیں کرتا بلکہ افسانوں سے حاصل کرتا ہے یا دورِ حاضر میں ان احساسات کا خاص ذریعہ فلمیں اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے ہیں یہ طبعی معاملہ ہے۔ افراد کی زندگی کی طرح نسلوں کی زندگی میں بھی کہانی تاریخ سے پہلے آتی ہے۔ بائبل کی کہانیاں پہلے آئیں۔ جوزیفس[۱] نے "ہسٹری آف دی جیوز" بعد میں لکھی۔ اسی طرح ایلیڈ اور اوڈیسی، ہیروڈوٹس یا تھیوسی ڈائڈ سے پہلے موجود تھیں۔ محض "بچے" ہی نہیں جنھوں نے انگلستان کی تاریخ شاہ آرتھر، اور ان کی گول میز کے سرداروں کی کہانیوں سے سیکھی یا فراسارٹ[۲] یا چاسر[۳] یا ماں باپ سے سیکھی۔ ونسٹن چرچل جس نے خود ایک تاریخی ناول لکھا کہتا ہے کہ مَیں نے انگلستان کی تاریخ شیکسپیر کے ڈراموں سے سیکھی۔ فرانسس پارک مین اپنے آپ کو کوپر کی کتاب "لیدر سٹاکنگ ٹیلز" کا ممنون سمجھتا تھا۔ ٹریولین نے اپنی تاریخی تحریرات میں والٹر سکاٹ کے اثر کے متعلق نہایت حسین خراج پیش کیا ہے۔

---

۱ : یہودی مؤرخ (۳۷ ق م - ۱۰۰ عیسوی)۔

۲ : فرانسیسی مؤرخ (۱۳۳۳ - ۱۴۰۰ء)۔

۳ : مشہور انگریز شاعر (۱۳۴۰ - ۱۴۰۰ء)۔

رڈیارڈ کپلنگ[1] نے لکھا کہ "فسانہ حقیقت کی بڑی بہن ہے۔" یہ مبالغہ آمیز قول ہے، لیکن اس مبالغے کو قابلِ معافی سمجھنا چاہیے۔ دنیا میں کسی کو اس وقت سچائی اور حقیقت کا علم نہ تھا۔ جب تک کسی نہ کسی نے کوئی کہانی نہ سنائی۔ غرض یہ قدیم ترین فن ہے۔ تاریخ شخصی سوانح، فلسفہ اور سیاسیات کا سرچشمہ ہے۔

کوپر، سکاٹ اور کپلنگ یہ بھی ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ تاریخی ناول زیادہ تر انیسویں صدی کی ایجاد ہے۔ بلاشبہ پیشتر کچھ چیزیں موجود تھیں لیکن تاریخی ناول کی ابتدا والٹر سکاٹ اور جان گالٹ[2] سے سکاٹ لینڈ میں ہوئی۔ فینی مور کوپر[3] اور ولیم گل مور سمز نے امریکہ میں ابتدا کی، انجمان نے ڈنمارک میں، وکٹر ہیوگو[4] نے فرانس میں اور الیسنڈرو مینزونی نے اٹلی میں۔ دورِ حاضر کے مصنفوں میں سے مندرجہ بالا مصنفوں کی کتابیں ایک نسل سے بھی زیادہ عرصے تک وسیع پیمانے پر پڑھی گئیں اور مہذب دنیا کے لیے یہ ایک ہی وضع کے تاریخی کردار اور کہانیاں فراہم کرتے رہے۔ تاریخی ناول انگلستان سے نکل کر پورے یورپ میں پھیل گیا اور تاریخی قومیت کے اظہار کا ایک معیار بن گیا۔ قریباً ہر بڑے مصنف نے اس صنف میں کام کیا۔ تھیکرے[5]، بلور لٹن[6]، جارج ایلیٹ[7]، ڈزرائیلی اور ڈکنز انگلستان میں۔ وکٹر ہیوگو اور سٹنڈ ہال[8]، ڈیوما[9] اور فلابرٹ[10] فرانس میں گستاف فرے ٹیگ[11] جرمنی میں۔

---

[1] : مشہور انگریز مصنف (۱۸۶۵ — ۱۹۳۶ء)۔

[2] : (۱۷۷۹ — ۱۸۳۹ء)۔

[3] : (۱۷۸۹ — ۱۸۵۱ء)۔

[4] : (۱۸۰۲ — ۱۸۸۵ء)۔

[5] : (۱۸۱۱ — ۱۸۶۳ء)۔

[6] : (۱۸۰۳ — ۱۸۷۳ء)۔

[7] : (۱۸۱۹ — ۱۸۸۰ء) اصلاً ایک عورت تھی جس نے تصانیف کے لیے مردانہ قلمی نام رکھ لیا تھا۔

[8] : (۱۷۸۳ — ۱۸۴۲ء)۔

[9] : (۱۸۱۲ — ۱۸۷۰ء)۔

[10] : (۱۸۲۱ — ۱۸۸۰ء)۔

[11] : (۱۸۱۶ — ۱۸۹۵ء)۔

شنکے وچ[1] پولینڈ میں، مینزونی اٹلی میں، پشکن[2]، ٹرجی نیو[3] اورٹالسٹائی روس میں، پیریز گلڈوس ہسپانیہ میں جس کے تاریخی ناول چھیالیس جلدوں سے کم نہ ہوں گے۔

تاریخی ناول نے ویسا فروغ کہیں نہ پایا جیسا اسے امریکہ میں ملا۔ تمام بڑے بڑے مصنّف مواد کی خاطر تاریخ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ارونگ[4] جو مؤرخ بھی تھا اور ناول نگار بھی اور اس کا دوست جیمز کرکی پاڈنگ، کوپر، ہاتھورن اور بھولا بسرا ڈی فارسٹ کثیر التصانیف میر بن کرافورڈ اور جنوبی ریاستوں میں سے بیورلے ٹکر، جان کینیڈی، سمز بلکہ موٹلے اور
۳۵ پارک مین بھی جو مؤرخ تھے انھوں نے بھی ایک ایک ناول لکھا۔ ہیربٹ بینچر سٹو[5] نے ہمیں "منسٹرز وُوئنگ" اور بہت سے دوسرے تاریخی ناول دیے۔ ہاؤلز نے بھی اوہایو کی سرحد کا تصوّر ہمارے سامنے پیش کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ مارک ٹوین[6] بھی ہے جس کے متعلق ہمیں عموماً یاد نہ ہوگا کہ اس نے تاریخی ناول لکھے حالانکہ اس کی کئی کتابیں موجود ہیں۔ مثلاً "دی پرنس اینڈ دی پاپر" اور "اے کنیکٹی کٹ یانکی اِن کنگ آرتھرز کورٹ۔" ان سب میں ایک خصوصیّت مشترک تھی۔ یعنی ان سب نے بچّوں کے لیے لکھا یا ایسی کتابیں لکھیں جنھیں بچّوں نے اپنا لیا اور اپنی بنالیں۔ یہ خصوصیّت تھیکرے سے سٹیون سن[7] تک تمام انگریزی ناول نگاروں میں موجود ہے۔ استاد اور زیادہ پڑھے لکھے لوگ بھی عموماً بچّوں کی ضرورتیں نظر انداز کرجاتے ہیں اور یہ حقیقت بھول جاتے ہیں، کہ اگر انھیں تاریخ کے مطالعے کی طرف لانا ہے تو پہلے دل چسپی پیدا کرنی چاہیے اور ان کی ہمدردیاں بروئے کار لانی چاہییں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ بچّوں کو جوشِ عمل، ڈرامائی حالات، ہنگامہ جوئی، بہادرانہ کارنامے اور شیطانی سازباز مطلوب ہیں۔ یہ چیزیں صرف

---

۱ : (۱۷۴۶ – ۱۹۱۶ء)۔

۲ : (۱۷۹۰ – ۱۸۳۷ء)۔

۳ : (۱۸۱۸ – ۱۸۸۳ء)۔

۴ : (۱۸۳۸ – ۱۹۰۵ء)۔

۵ : امریکہ کی مشہور خاتون ناول نگار (۱۸۱۱ – ۱۸۹۶ء)

۶ : امریکا کا مشہور مزاح نگار (۱۸۳۵ – ۱۹۱۰ء) اس کا اصل نام کلیمنز تھا۔

۷ : (۱۸۵۰ – ۱۸۹۴ء)۔

تاریخی ناول ان کے لیے مہیا کرتا ہے۔

تاریخی ناول

حقیقتہً تاریخی ناول دو قسم کے ہیں۔ ایک جس میں ماضی کو از سرِ نو بروئے کار لایا جاتا ہے اور ڈرامائی شکل دی جاتی ہے۔ جیسے کوئی کھیل پیش کرنے والا الزبتھ کے زمانے کا کھیل پیش کرے۔ مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس دور کے پورے سرو سامان سے آگاہ ہو۔ مثلاً لباس کیا تھا۔ محاورے کون کون سے بولے جاتے تھے اور لب و لہجہ کا انداز کیا تھا۔ عام طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کے تاریخی ناول میں تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور خوانندۂ کتاب پر یہ اثر باقی رہتا ہے کہ زمانۂ ماضی رزم و پیکار کا کشکول تھا وہاں بڑے بڑے منچلے آدمی موجود تھے پھر سکاٹ، ڈیما، سٹیون سن، جان بوکن[1] نے طویل رومان لکھے لیکن اس قسم کے تاریخی ناول عین تاریخ کے مطابق ہوسکتے ہیں جیسے کہ بہت سی سنجیدہ نگارشات ساتھ ہی وہ ادبِ عالیہ کا نمونہ پیش کرسکتے ہیں جیسے تھیکرے کی کتاب "دی ورجینینز" ہاتھورن کی کتاب "سکارلٹ لیٹر"، سٹینڈ ہال کی "چارٹر ہاؤس آف پارما"، ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس"، سگرڈ انڈسٹ کی کتاب "کرسٹن لورنز ڈیٹر"، ٹامس مان کی کتاب "جوزف اینڈ ہز بریدرن" اور لائن فیوچٹ وینگر کی کتاب "جیو سوس"۔

تاریخی ناولوں کی ایک اور زیادہ قابلِ قدر قسم ہے یعنی وہ ناول جو دانستہ تاریخی نہیں لکھے جاتے لیکن زمانۂ حال کو اس خوبی سے معرضِ تحریر میں لے آتے ہیں جو آگے چل کر زمانۂ ماضی بن جائے گا۔ اور جو اس وجہ سے حقیقتہً "ایک تاریخی دستاویز" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ محاربات نپولین کے دوران میں انگلستان کے آرام طلب طبقۂ بالا کی زندگی کیسی تھی تو ہمارے لیے جین آسٹن[2] کے ناولوں سے بہتر ذریعۂ علم اور کوئی نہ ہوگا، مثلاً "پرائیڈ اینڈ پریجوڈس" یا "سینس اینڈ سینسیبلٹی" یا "مینس فیلڈ پارک"۔ کیا اسی دور کے متعلق سکاٹ لینڈ کی اس سے بہتر تصویر کوئی ہوسکتی ہے جو جون گالٹ نے "اینلز آف دی پیرشس" میں پیش کی ہے یا اپنی کتاب "دی انٹیل" میں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ گالٹ کی معاصر "سوسن فیریر" کی کتاب میں مل جائے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں لندن میں جس طرح

---

[1]: (۱۸۷۵ - ۱۹۴۰ء)۔

[2]: مشہور انگریز مصنفہ (۱۷۷۵ - ۱۸۱۷ء)۔

زندگی بسر ہو سکتی تھی۔ آیا اس کا حقیقی نقشہ ڈکنز[1] کے ناولوں میں ملتا ہے۔ مثلاً : "نکولس نکل بائی" یا "آلیور ٹوسٹ" یا "گریٹ ایکسپیکٹیشنز"۔ جو شہر "ہنسیاٹی لیگ[2]" میں شامل تھے، ان کے سرمایہ دار طبقے کو سمجھنے کے لیے ٹامس مان کی کتاب "بڈن بروکس" یا فرانس کے صوبائی شہروں کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے "مادام بواری" سے بہتر کتابیں کیا ہو سکتی ہیں؟ سلمہ لیجر لوف[3] نے اٹھارھویں صدی کے سویڈن کی جو نہایت عمدہ تصویریں "ساگا آف گوسٹا برلنگ" میں اور انیسویں صدی کے سویڈن کی تصویریں "یوروشلم" میں پیش کر
۳۶ دی ہیں۔ "بائی یورن سن[4]" نے یہی کام ناروے کے متعلق انجام دیا ہے۔ "لوئی کوپرس" سے ہمیں دورِ حاضر کے ہالینڈ کی کثیر آبادی والے شہروں کی زندگی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اگر ہم ڈنمارک کی طرف متوجہ ہوں تو مارٹن انڈرسن نیکسو کی کتابیں پڑھنی چاہییں۔ مثلاً : "پیلے دی کنکرز" اور "ڈٹے گرل الاٹیو" یہ دونوں کتابیں ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن کے نقشے اسی طرح ذہن میں تازہ کر دیتی ہیں جس طرح ڈکنز کے ناول لندن کے نقشے تازہ کر دیتے ہیں۔ عمرانیات کے متعلق کوئی کتاب صنعتی انگلستان کے صوبائی شہروں کی کیفیت زیادہ صحیح طریق پر نہیں پیش کر سکتی جس طرح آرنلڈ بینٹ[5] نے پانچ شہروں کی کہانیوں میں پیش کی ہے۔ مثلاً "کلے ہینگر" یا "اولڈ وائیوز ٹیل" یا بعض دوسری۔ طبقاتی نظام کا کوئی تاریخ نگار گالزورڈی[6] کی کتاب "فورسائٹ ساگا" یا فرینک سوینرٹن کی کتاب "شاپس اینڈ ہاؤسز" یا ورجینیا ولف کی کتاب "ڈے اینڈ نائٹ" سے بہتر نہیں۔

اہلِ امریکا بھی اپنی عمرانی تاریخ افسانوں کی کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ ولیم ہاولز کو بہرحال ہمارا کامل الفن اور جامع عمرانی مؤرخ سمجھنا چاہیے وہ بوسٹن کی مطمئن زندگی اور نیو انگلینڈ کے ساحلی کوائف یا ورمانٹ کے مفصلات، اوہایو کی سرحد، نیویارک کی ہنگامہ خیز

---

۱ : (۱۸۱۲ — ۱۸۷۰ء)۔

۲ : بارھویں صدی میں یورپ کے بعض شمالی شہروں کے درمیان تجارتی مقاصد کے لیے ایک نظام بنا تھا جو سی سالہ جنگ میں برباد ہوا۔

۳ : (۱۸۵۸ — ۱۹۴۰ء)۔

۴ : (۱۸۸۱ — ۱۹۵۲ء)۔

۵ : (۱۸۶۷ — ۱۹۳۱ء)۔

۶ : (۱۸۶۷ — ۱۹۳۳ء)۔

زندگی یا بیرونی ملکوں میں امریکہ کے حالات نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتا ہے اور اس کی کتاب "رائز آف سلاس لیپ ہم" مختلف صورتوں میں امریکا کے کاروباری آدمی کی بہترین تصویر ہے جو ادبیات میں پیش کی گئی ہے۔ یہی کیفیت بہت سے دوسرے مصنّفوں کی ہے۔ ہنری جیمز کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا جو امریکی اوضاع واطوار کا بہترین مؤرخ ہے جو امریکی دوسرے ملکوں میں پہنچ گئے ان کے حالات بھی بہت اچھے طریقے پر بیان کرتا ہے۔ امریکیوں کے اخلاقی کردار کا وہ بڑا بالغ نظر مبصّر ہے۔ ایڈتھ وارٹن[1] امریکیوں کے اخلاقی کردار کا حد درجہ احساس رکھتی ہے۔ خصوصاً نیویارک شہر وادی ہڈسن کے بالائی طبقے کی زندگی کے متعلق ایلن گلاسگو[2] ان مصنّفوں میں سے ہے جنھیں خوب معلوم تھا کہ جنگ کے بعد ورجینیا کی کیا حالت ہوئی چنانچہ اس نے کئی کتابوں میں ورجینیا کی تاریخ خانہ جنگی سے شروع کرکے بیسویں صدی تک بیان کی۔ ولا کیتھر[3] نے کئی کتابوں میں میدانی زندگی کی کیفیت سادگی سے پیش کی ہے۔ مثلاً: "مائی آنٹونیا"، "او پائیونیرس"، "دی سونگ آف دی لارک" اس کی بہترین تصنیف ہے۔ "اے لاسٹ لیڈی"۔ کیتھر کے تاریخی ناولوں کے مقابلے میں یہ کتابیں زیادہ حقیقت پسندانہ اور بصیرت افروز ہیں۔ خانہ جنگی کے بعد امریکہ میں مختلف مزرعوں کے اندر زندگی کی جو کیفیت شروع ہوئی اس کے لیے ہم پورے اعتماد کے ساتھ "ہیملن گارلینڈ[4]" کی کتاب "مین ٹریولڈ روڈز" کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اسی سے مزرعوں کے مسائل کی حقیقت بھی ذہن نشین ہو سکتی ہے یا فرینک نورس[5] کی کتاب "دی آکٹوپس" یا رول واٹغ[6] کی کتاب "جائنٹس ان دی ارتھ" ملاحظہ فرمائیے۔ رسمی تاریخوں سے ایسی معلومات حاصل نہ ہو سکیں گی۔ دیہات سے بغاوت کے متعلق زیادہ بصیرت افروز بیانات مطلوب ہوں تو آپ کو "شروڈ انڈرسن" کی کتاب "وائنز برگ، اوہائیو" یا ایڈگر لی ماسٹرز[7] کی کتاب "سپون ریور انتھالوجی"

---

[1] : (۱۸۶۲ — ۱۹۳۲ء)۔

[2] : (۱۸۷۴ — ۱۹۴۵ء)۔

[3] : (۱۸۷۶ — ۱۹۴۷ء)۔

[4] : (۱۸۶۰ — ۱۹۴۰ء)۔

[5] : (۱۸۷۰ — ۱۹۰۲ء)۔

[6] : (۱۸۷۶ — ۱۹۳۱ء)۔

[7] : (۱۸۶۹ — ۱۹۵۰ء)۔

یا "سنکلیر لیوئس[1]" کی کتاب "مین سٹریٹ" دیکھنی چاہیے۔

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ نظم اور ڈرامے پر بھی یکساں حاوی ہے۔ لارڈ ٹینی سن[2] کی کتاب آئیڈلز آف دی کنگ یا ہینڈرک ابسن[3] کے ڈرامے اعلےٰ درجے کی تاریخی دستاویزیں ہیں۔ انھیں غور و ہمدردی سے دیکھا جائے تو وکٹوریا کے عہد کی ذہنی کیفیت واضح ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ناروے کی عمرانی تاریخ ہمارے سامنے آسکتی ہے اور ان موضوعات کے متعلق کوئی رسمی تاریخی کتاب ایسی معلومات بہم نہیں پہنچا سکتی۔

---

[1] : (۱۸۸۸ — ۱۹۵۱ء)۔

[2] : (۱۸۰۹ — ۱۸۹۲ء)۔

[3] : (۱۸۲۸ — ۱۹۰۶ء)۔

چوتھا باب

تاریخ نگاری

مطالعۂ تاریخ کے متعلق جو کچھ ضروری تھا، عرض کر دیا گیا۔ اب تاریخ نگاری کا سوال سامنے ۳۷
آتا ہے۔

یہ شروع ہی میں بتا دینا چاہیے کہ تاریخ نگاری کے متعلق کوئی خاص بھید نہیں۔ کوئی ایسی چیز نہیں جو مخفی، پُر اسرار اور سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہو۔ کوئی خاص فارمولا بھی نہیں خاص تکنیک اور خاص مطلوبات بھی نہیں جو پیش کر دیے جائیں البتہ یہ کہہ دینا چاہیے کہ تحریر صاف اور واضح ہونی چاہیے۔ دیانت اور عقلِ سلیم ملحوظ رہنی چاہیے۔ خاص تربیت مفید ہے، اور ایسی تربیت ہر کام کے لیے مفید ہوتی ہے مثلاً موٹر چلانا، کھانا پکانا، تصویریں کھینچنا لیکن خاص تربیت لازم نہیں۔ اکثر بڑے بڑے مؤرّخ رسمی تربیت سے بالکل ناآشنا تھے۔ پیشہ ورانہ تاریخ نگاری زیادہ قریبی زمانے کا معاملہ ہے۔ یہ تاریخ نگاری ٹکنیکل تاریخ کے ساتھ انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور جرمنی کے سوا تاریخ نگاری مجالسِ فنون کے ارکان کا ادارہ زمانۂ حال میں بنی ہے۔ زمانۂ گزشتہ کے بڑے بڑے مؤرّخ قریباً سب کے سب کسی نہ کسی عوامی معاملے میں مصروف تھے مثلاً تھیوسی ڈائڈز، لوی، ٹیسی ٹس، پلوٹارک اور دورِ حاضر میں بالنگ بروک[1]، والٹیر، ہیوم، میکالے، بین کرافٹ[2]، گیزو[3] گرنٹ وگ۔ بہت سے غیر پیشہ ور تھے۔ کم از کم اس اعتبار سے کہ ان میں سے کوئی بھی پیشہ ور پروفیسر نہ تھا۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بین کرافٹ، پریسکاٹ، موٹلے، پارک مین ہنری ایڈمز، غیر پیشہ ور ہونے کی روایت اب ماضی کا ایک قصّہ ہے۔ ہاں، امریکہ کے بجائے یورپ میں یہ چیز چلی جا رہی ہے مثلاً آپ ان لوگوں کے کارنامے دیکھیں۔ کروچے، میڈریاگا[4]، مالرو، ڈیگال، جارج لوکس اور ونسٹن چرچل۔

---

[1] (۱۶۷۸–۱۷۵۱ء)
[2] امریکی مؤرخ (۱۸۰۰–۱۸۹۱ء)
[3] فرانسیسی مؤرخ (۱۷۸۷–۱۸۷۴ء)
[4] ہسپانوی مؤرخ

چار بنیادی چیزیں

دیانت، محنت، تخیل اور عقلِ سلیم، یہ تاریخ نگاری میں محض اہم بلکہ بنیادی مطلوبات ہیں۔ یہ متعارف خصوصیات نہیں۔ دیانت یقیناً ایسی چیز ہے جسے تاریخ میں ناگزیر سمجھنا چاہیے اور سائنس یا علم وفضل کے دوسرے دائروں میں بھی یہ حد درجہ ضروری ہے اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔ تاہم یہ بھی اعتراف کر لینا چاہیے کہ دیانت کا کوئی آفاقی معیار نہیں اور دیانتدار آدمی خود تاریخ میں حقیقت کی نوعیت کے متعلق اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ یہی کیفیت فکر وخیال کے دوسرے دائروں کی ہے، لہذا زیادہ مناسب شاید یہ کہنا ہو کہ مؤرخ کو اپنی بساط کے مطابق دیانتدار رہنا چاہیئے یعنی اسے دانستہ کسی شہادت کو توڑ مروڑ کر پیش نہ کرنا چاہیے۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی ہیر پھیر کی صورت پیدا نہ ہونے دینی چاہیے۔ ضروری ہے کہ مذہبی، نسلی، جماعتی یا قومی تصوّرات جو پہلے سے موجود ہیں، راستے میں حائل نہ ہوں اور ہر مسئلے کو ہر ممکن نقطۂ نگاہ سے جانچ پڑتال کر کے لکھا جائے۔ ہر ممکن شہادت کی تلاش پر خاص وقت صرف کیا جائے۔ جب تک تمام مہیا وسائل ختم نہ ہو جائیں، مؤرخ کو اس وقت تک دم نہ لینا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مؤرخ خدا نہیں اور آخری فیصلہ اس کے حوالے نہیں کیا گیا۔

محنت کے تقاضے بھی بنیادی اور خاصے سخت ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ آپ قدیم روما کے عظیم مؤرخ کی پیروی میں مصروف ہو جائیں جس کا نام تھیوڈور مومسن[1] تھا۔ وہ روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا اور اس نے شکایت کی کہ شادی کے دن اسے صرف بارہ گھنٹے کام کرنے کا موقع ملا۔ یہی صورت حال جرمن مؤرخ لیوپولڈ فان رانکے کی ہے جو اسّی سال کی عمر تک بھی برابر تصنیف وتالیف میں مصروف رہا۔ بلکہ پچاسی سال کی عمر میں "ہسٹری آف دی ورلڈ" لکھنے کا کام شروع کر دیا، اور زندگی کے آئندہ پانچ سال میں اس کی سات جلدیں مرتّب کر دیں۔ لیکن دوسری بہت سی ضروری چیزوں کی طرح تاریخ نگاری بھی صبر، انہماک اور اَن تھک محنت کی طلبگار ہے۔ محنت کا زیادہ تر حصّہ تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ آپ کو زیادہ گھنٹوں اور دنوں تک کام کرنے کا عادی بن جانا چاہیے۔ ایسے ماخذ سے بھی کام لینا پڑے گا جو آخر میں بالکل

---

[1] جرمن مؤرخ (۱۸۱۷ - ۱۹۱۳ء)

بے سود ثابت ہوں۔ ان اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا جن سے عموماً بہت کم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایسے بدخط مسوّدوں کو صبر و سکون سے دیکھنا ہوگا جن کا پڑھنا مشکل ہو لیکن امید ہوتی ہے کہ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے، شاید کوئی ایسا نکتہ میسّر آجائے جو آپ کا کوئی مسئلہ حل کر دے۔ رائل کمشنوں کی روئدادوں یا عدالتوں کے فیصلوں یا امریکی کانگریس کی رپورٹوں میں سے گزرنا جن کی حیثیت الفاظ کے گھنے جنگلوں کی ہے۔ آسان کام نہیں۔ اگر آپ کوئی چیز نئی، نادیدہ، تازہ اور قیمتی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ضرور یہ محنت برداشت کرنی پڑے گی۔ اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں تو بہتر یہ ہے کہ تاریخ کو چھوڑ کر زیادہ سہل کام سنبھال لیں۔

رہا تخیل تو ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے نشو و نما نہیں دی جا سکتی ہے، یا تو یہ قوّت آپ کی فطرت میں ودیعت ہوئی ہے یا نہیں ہوئی۔ اگر آپ میں یہ قوّت موجود نہیں تو آپ حقائق کے ایک اچھے جامع' ایک اچھے تجزیہ کار' اور ماضی کی بھول بھلیّوں میں سے گزارنے کے لیے ایک اچھے رہنما بن سکتے ہیں، لیکن ماضی کو تخلیق کرنے کی صلاحیّت نمایاں نہیں کر سکتے، آپ قارئین کی رگوں میں خون نہیں دوڑا سکتے، یا خیالات پے در پے ان کے سروں میں نہیں بھر سکتے۔ عقلِ سلیم ایسی سادہ چیز نہیں جتنی اس ترکیب سے معلوم ہوتی ہے یہ ایسی اصطلاح ہے جس میں بہت کچھ شامل ہے اور بعض خصوصیات متضاد ہیں مثلاً اعتدال، توازن، معاملہ فہمی' نقاد ذہانت، کشادہ دلی' رواداری، تناسب اور خوش طبعی اور ان کے سوا بھی بعض خصوصیّات ضروری ہیں اس کے بغیر علم و فضل کے زیادہ تر دلچسپ کارنامے بے اثر رہ جاتے ہیں مثلاً ولیم کراسکے[1] نے دو فاضلانہ جلدیں لکھّیں جن میں یہ ثابت کیا کہ بانی پادری جو کچھ کہتے اور لکھتے رہے ان کا مقصد اس کے بالکل خلاف تھا۔ یا آٹو آئسن شمل نے بڑی محنت سے ثبوت مہیّا کیا کہ لنکن کو قتل کرنے کی سازش میں وزیر جنگ سٹانٹن[2] کا سب سے بڑا حصّہ تھا۔ یا چارلز ٹینسل نے دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ ثابت کر دیا کہ فرینکلن روزویلٹ نے دوسری عالمی جنگ کی آگ بھڑکائی یا زیادہ دُور افتادہ مثال یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں کہ جو ڈرامے شیکسپیئر سے منسوب کیے جاتے ہیں وہ لارڈ بیکن[3] یا ارل آف آکسفورڈ، یا کسی دوسرے شخص کے لکھے ہوئے ہیں۔

بعض عملی پہلو

اب آئیے تاریخ نگاری کے بعض عملی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوں سب سے پہلی بات موضوع کا انتخاب

---

[1] (۱۸۲۶–۱۸۹۳ء) [2] (۱۸۱۴–۱۸۶۹ء) یہ شخص لنکن کا سخت مخالف تھا لیکن خانہ جنگی میں لنکن نے اسے وزیر جنگ بنا لیا تاہم یہ برابر مخالفت کرتا رہا۔ جھگڑالو آدمی تھا۔ [3] (۱۵۶۱–۱۶۲۶ء)

ہے۔ یہ ایک ایسا واضح معاملہ ہے جس پر تبصرے کا کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں۔ بار بار خاصے فہیم نوواردِ تاریخ نگار اس مرحلے سے دوچار ہوئے ہیں اور تحقیق کے لیے کوئی موضوع انتخاب کر لیتے ہیں۔ یہی مقام ہے جہاں عقلِ سلیم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آپ کا موضوع نہ تو بہت بڑا ہونا چاہیے، نہ بہت معمولی۔ یہ نہ زیادہ فرسودہ ہونا چاہیے اور نہ زیادہ غیر معروف۔ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ کے پیشِ نظر جتنا وقت اور جتنی گنجائش ہے اسے پورا کیا جا سکے۔ یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ مؤرخوں کے گروہ پے در پے اسے چھوڑ چھوڑ کر نہ چھوڑ چکے ہوں۔ ساتھ ہی وہ اتنا نادر اور عجیب و غریب بھی نہ ہونا چاہیے جس کے ساتھ آپ کے سوا کسی کو دلچسپی نہ ہو۔ ایک پہلو یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق مآخذ نہ محض دسترس میں ہوں بلکہ آپ کی دسترس میں ہوں۔ ایسا کوئی موضوع انتخاب نہ کیجیے جس کے مآخذ کم اور ناقابلِ اعتماد ہوں یا جس کے متعلق بنیادی دستاویزیں استعمال نہ کی جا سکیں مثلاً خفیہ خفیہ کام کرنے والے صیغوں کے متعلق، تاریخ میں کوئی باب لکھنا ہو مثلاً "سی۔ آئی۔ اے"[1] کے متعلق۔ یا مآخذ کسی ایسے خاندان کے قبضے میں ہوں جو انھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا خواہاں ہو۔ یا وہ مآخذ ہسپانیہ یا آسٹریلیا کے محافظ خانوں میں ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ خود کسی وجہ سے ہسپانیہ یا آسٹریلیا جا رہے ہوں۔ اگر آپ ریاست مونٹانا[2] میں رہتے ہیں تو کوئی ایسا موضوع انتخاب نہ کیجیے جس کے مطالعے کے لیے ریاستہائے متحدہ کی مشرقی جانب کے اخبار دیکھنے لازم ہوں، اگر آپ نیویارک شہر میں رہتے ہیں تو کوئی ایسا موضوع انتخاب نہ کیجیے جس کے مآخذ مغربی جانب کی کم و بیش نصف درجن تاریخی انجمنوں میں بکھرے ہوئے ہوں۔ اگر آپ کی معلومات زبان کے متعلق پختہ نہیں تو ایسے موضوعات کا انتخاب نظرانداز کر دیجیے جن پر غور و بحث کے لیے کم از کم نصف درجن غیر ملکی زبانوں کا علم ضروری ہے۔ اگر آپ کی نظر کمزور ہے تو ایسا موضوع انتخاب نہ کیجیے جس کے مطالعے کے لیے سترھویں یا اٹھارھویں صدی کے مخطوطات کا مطالعہ کرنا پڑے۔ اسی طرح ہارلیس گریلے[3] اور چارلز سمنر[4] یا ایسے ہی دوسرے لوگوں کی لکھی ہوئی دستاویزوں سے احتراز کیجیے جن کے خط بہت ہی برے تھے اور انھیں پڑھا نہیں جا سکتا۔

موضوع کا انتخاب

اب تک جو کچھ کہا گیا اس کی حیثیت خالصتہً سلبی تھی یعنی ایسے موضوعات کو نظرانداز کر دینا جن کی ترتیب بس کی بات نہ ہو لیکن ایک ایجابی مصلحت بھی قابلِ توجہ ہے جس کی حیثیت بنیادی اور لازمی ہے۔ موضوع کا

---

[1] امریکہ کا خفیہ محکمہ اطلاعات، جس کی شاخیں ہر ملک میں بتائی جاتی ہیں۔

[2] امریکہ کی ایک مغربی ریاست جو کینیڈا سے ملی ہوئی ہے۔

[3] (۱۸۴۴ – ۱۹۳۵ء)

[4] (۱۸۱۱ – ۱۸۷۴ء)

انتخاب اسی انداز میں کیجیے جس انداز میں آپ ایک دوست یا مثلاً بیوی کا انتخاب کرتے ہیں[1]۔ یہ ایسا ہی موضوع ہوگا جس کے ساتھ خاصی مدت تک آپ کو زندگی بسر کرنی ہوگی۔ ممکن ہے کئی سال لگ جائیں لہٰذا اپنے سفر کے لیے آپ کو اچھے رفیق کا انتخاب کرنا چاہیے۔ حقیقتاً آپ ایسا موضوع منتخب کریں گے جس کے ساتھ دلچسپی سے آپ باز نہیں رہ سکتے اور جو آپ کے دل میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے بہ حیثیتِ مجموعی مناسب یہ ہے کہ ایسا موضوع منتخب کریں جس کے ساتھ آپ کو ہمدردی ہو۔ اگرچہ یہ کوئی بنیادی ضروری چیز نہیں۔ آپ سینٹ بارتھولومیو[2] کے قتل کا واقعہ نہایت مؤثر انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ مذہبی ناروا داری کے اصول پر آپ اسے پسند نہ کریں۔ آپ ہٹلر کے متعلق لکھ سکتے ہیں اگرچہ اس کی نازیت سے آپ کو اتفاق نہ ہو۔ غالباً بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ سینٹ بارتھولومیو کے ہنگامۂ قتل سے احتراز کریں بشرطیکہ آپ کسی پروٹسٹنٹ کی اولاد ہوں۔ ہٹلر کے متعلق احتراز اس وجہ سے مناسب ہوگا کہ آپ یہودی ہوں۔

سوانحی موضوعات کے لیے آپ کو وہ شخصیت منتخب کرنی چاہیے جس کے ساتھ آپ کو دلچسپی بھی ہو، اور ہمدردی بھی، کیونکہ آپ اس شخصیت کے ساتھ گہری رفاقت نہ چاہیں گے جو آپ کو دل سے ناپسند ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا تاریخی کردار ہو۔ ایسے شخصی سوانح نگاروں کی مثالیں ملتی ہیں جنھیں اپنے موضوع پر ناپسندیدگی
۴۰ تھی یا وہ رفتہ رفتہ ناپسندیدگی پر آگئے۔ فروڈ کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کارلائل کو ناپسند کرتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی۔ لٹن سٹریچی[3] نے عہدِ وکٹوریا کے مشاہیر کے سوانح لکھے حالانکہ انھیں بیکار سمجھتا تھا اسی طرح ہیکسٹن ہین نے ولیم جیننگز برائن[4] کے متعلق حقارت چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی لیکن ایسی مثالیں مستثنیٰ ہیں۔ بہترین سوانح نگار ہمیشہ اپنے موضوع کے متعلق قدر و منزلت اور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ بعض کو ان شخصیتوں سے دلی محبت تھی جن کے سوانح انھوں نے لکھے مثلاً ڈاکٹر جانسن کے سوانح حیات باسویل کے قلم سے یا ولیم ڈین ہاولز کی کتاب "مائی مارک ٹوین" یا اُٹو ٹریویلین کے قلم سے لارڈ میکالے کے محبت بھرے سوانح جو ٹریویلین کا ماموں تھا۔ جب آپ کو ایک ایسا موضوع مل جائے گا اور آپ اس کے متعلق دریافت کر لیں گے کہ نئی باتیں کہنے کے لیے موجود ہیں اور معلومات آپ کی دسترس میں ہیں نیز ذخیرہ اچھا ہے تو آپ لکھنا شروع کر سکتے ہیں۔ یہاں سے معاملہ عقلِ سلیم کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔

---

[1] یہ مغربی نقطۂ نظر ہے۔

[2] یہ ایک مسیحی بزرگ ہے جس کی تاریخِ وفات پر میلہ لگتا تھا ۲۴-اگست ۱۵۷۲ء کو فرانسیسی کیتھولکوں نے پروٹسٹنٹوں پر حملہ کیا جنھیں فرانسیسی زبان میں ہوجے ناٹ کہتے تھے اور کم و بیش تیس ہزار پروٹسٹنٹ مارے گئے اس میں ملکۂ فرانس کی انگیخت شامل تھی۔

[3] (۱۸۸۰-۱۹۳۲ء) [4] (۱۸۶۰-۱۹۲۵ء)

چند عملی مصالح

لیکن یہاں بھی چند عملی مصلحتوں کا ذکر ضروری ہے جن کا اس معاملے سے تعلق ہے سب سے پہلی بات یہ ہے، کہ آپ کو وقت اور قوّت موضوع کے گرد وپیش کے متعلق مطالعے میں ضائع نہ کرنی چاہیے۔ گرد وپیش یا پس منظر کا مطالعہ عموماً اصل موضوع پہ نہ پہنچنے کا ایک عذر ہوتا ہے۔ یہ خوشگوار بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اچھا بھی سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا ذخیرہ لامتناہی ہے۔ ایک کیمیا داں کبھی مطلوب شے کے گرد وپیش سے نہیں الجھتا۔ ایک قانون داں کو جب کسی خاص مقدمے سے بحث ہو تو قانون کے گرد وپیش میں نہیں گھومتا۔ آپ کو چاہیے کہ سیدھے موضوع میں ڈوب جائیں۔ مسئلے کو گردن سے پکڑ لیں اور اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ آپ جتنا قریب آتے جائیں گے اور آپ کی سمجھ جتنی گہرائی میں چلی جائے گی۔ موضوع کے گرد وپیش سے بہتر شناسائی حاصل کرتے جائیں گے رفتہ رفتہ ہر چیز اپنے مقام پر آ جائے گی۔ یہی طبعی طریقہ ہے آپ اپنے دوست کے پس منظر کا علم رفتہ رفتہ ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچے بہر حال والدین یا ان کے بڑوں کے متعلق اس وقت تک پس منظر کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جب تک وہ خود بچوں کے والدین نہ بن جائیں۔ غرض آپ کو عام کے بجائے خاص پر توجہ رکھنی چاہیے۔ اس خاص شخص کے متعلق جو کچھ مل سکے، بڑے غور وخوض سے پڑھیں۔ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ عام حالات خود بخود سامنے آ جائیں گے۔

دوسرا عملی قاعدہ یہ ہے کہ اپنے مضمون یا مقالے کے لیے بنیادی معلومات فراہم کرنا فوراً شروع کر دیں اور ان کا کوئی نہ کوئی نقشہ ترتیب دیتے جائیں۔ فرض کیجیے کہ آپ کو "بنیادی" کی اہمیت یا نقشے کی ترتیب کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں۔ جب آپ موضوع کے متعلق کام شروع کریں گے ان سوالوں کا جواب آپ کو خود بخود مل جائے گا۔ یہ نہ سمجھیے کہ آپ کے لیے ہر چیز پڑھنی ضروری ہے یا ہر چیز کے نوٹ لینے چاہئیں یا تمام مآخذ پر نظر رکھنی لازم ہے یا تحریر و نگارش شروع کرنے سے پیشتر مخطوطات کے ہر صفحے پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ جتنی جلدی آپ اصل تحریر شروع کر سکتے ہیں اتنا ہی اچھا ہے جب آپ لکھنا شروع کر دیں گے تو واضح ہوتا جائے گا کہ آپ کے علم میں کہاں کہاں خلا ہے انھیں بھرتے جائیں۔

ایک تیسرا عملی معاملہ بھی ہے جسے ذخیرۂ معلومات کی ترتیب سے تعلق ہے اس کا مطلب ہے ہر چیز کے نوٹ لیتے جانا۔ یہ سخت اور لامتناہی عمل رفتہ رفتہ اصل موضوع کے متعلق فکر و نظر یا تحریر کے لیے ایک خوشگوار بدل بن جائے گا۔ اگر آپ نے احتیاط سے کام نہ لیا تو اس کی حیثیت افیون کی سی ہو جائے گی۔ زیادہ مدت نہیں گزری جب نوٹ لیتے رہنے کا مطلب یہ تھا کہ مختلف کتابوں سے تحریرات کے بڑے بڑے
۱۸ ذخیرے اس بنا پر محنت ومشقت سے نقل کر لیے جائیں کہ کبھی وقت کام آئیں گے یا کسی شخص کو یہ کام سونپ

دیا جائے۔ یہ صورتِ حال اب بالکل بدل گئی ہے۔ نوٹ لینے کا معاملہ بھی بہت سی دوسری چیزوں کی طرح میکانکی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اب تحقیق کرنے والا مصنف اپنے پورے ذخیرے کے فوٹو یا مائکرو فلمیں لے سکتا ہے۔ زمانۂ ماضی سے یہ طریقہ بدرجہا بہتر ہے۔ اب آپ پہلے کے مقابلے میں دس گنا بلکہ سو گنا زیادہ معلومات بڑی صحت و درستی سے نقل کرا سکتے ہیں۔ آپ کا وقت بچ جائے گا چونکہ ہر جگہ جا کر ہر چیز کو دیکھنا ضروری نہ رہے گا۔ اہلِ قلم کی خوش نصیبی ہے کہ اب وہ پہلی نسل کے مقابلے میں دگنا لکھ سکتے ہیں یا ان سے ایسی امید رکھی جا سکتی ہے لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ وہ گزرے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں نصف بھی نہیں لکھ سکتے۔

ہم سب کتابیں مرتّب کرنے کی موجودہ میکانکی ٹیکنیک کے بیحد زیرِ احسان ہیں لیکن اس معاملے کو اس حد پر نہ لے جائیے کہ آپ کے دل میں خیال پیدا ہو جائے کہ تاریخ بھی کوئی میکانکی چیز ہے۔ یہ بہت اچھا ہے کہ مشینیں آپ کے لیے نقل و کتابت کی خدمت انجام دیتی ہیں لیکن یاد رکھیے وہ آپ کے لیے سوچ نہیں سکتیں۔ جو کچھ آپ کو کرنا ہے اس کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ کہہ دینا چاہیے اور اس سے دستاویزوں کی نقل بھی مستثنیٰ نہیں۔ وین واٹک بروکس بہت بڑا مورّخ ہے۔ امریکہ کی زیادہ تر دلچسپ ادبی تاریخوں کا مصنّف ہے۔ اس نے سب کچھ خود نقل کیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنے ہاتھ سے نقل کیا۔ وہ لکھنے والوں کو ملازم رکھ سکتا تھا، یا نقل کرنے والی مشین خرید سکتا تھا لیکن اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنا کام خود کرے اور وہ جانتا تھا کہ ہر صاحبِ علم کو کیا کچھ جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اگر آپ کوئی چیز اپنے ہاتھ سے نقل کریں گے تو اسے یاد رکھیں گے۔ ایک اور نہایت اہم سبق سے بھی وہ آگاہ تھا۔ یعنی نقل سے ضمناً جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ اصل شے سے زیادہ اہم ہوتی ہیں یعنی وہ افکار جو نقل کے دوران میں پیدا ہوں گے کوئی مشین یہ افکار آپ کے لیے مہیا نہیں کر سکتی اور اس روح کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا، جو اپنے موضوع کے متعلق مواد سے براہِ راست تازہ اور غیر پیچیدہ ربط و تعلق کی بنا پر پیدا ہو سکتی ہے۔

تاریخ نگاری

سب سے آخر میں تاریخ نگاری کا معاملہ آتا ہے۔ یاد رکھیے کہ تاریخ نگاری کے بھی اتنے ہی طریقے ہیں جتنے مورّخ۔ اس باب میں کوئی فارمولا پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو خود اپنا فارمولا دریافت کرنا چاہیے۔ کوئی خاص نمونہ بھی سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ آپ کو خود اپنے نمونے کے لیے غور و فکر اور محنت کرنی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی نمونہ موجود ہی نہیں۔ بیسیوں نمونے

موجود ہیں۔ آپ یقیناً ان سے متاثر ہوں گے جس طرح مصور وسلر یا پکاسو، ریمبرانٹ یا گویا کی تصویروں سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنے لیے گبن کا شاندار اسلوب، کارلائل کا خطیبانہ اسلوب، میکالے کا متوازن زیر و بم کا اسلوب، ماہن کا پُرزور مردانہ اسلوب، پیرنگٹن کا روشن اسلوب، فلپ گوڈیلا[1] کا پرلطف اسلوب، ڈینس بروگن کا تلمیحی اسلوب یا پال ہیزرڈ کا استعارتی اسلوب اختیار کر سکتے ہیں۔ ہر قسم کے اسلوب موجود ہیں لیکن لکھنے میں نیز تمام دوسرے معاملات میں اسلوب شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ آپ کا اسلوب بھی ایسا ہونا چاہیے جس میں آپ کی شخصیت جھلکتی نظر آئے۔

تاہم اسلوب نہ تو الگ تھلگ چیز ہے اور نہ اسے ساکن قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ کا اسلوب موضوع کی مناسبت پر مبنی ہونا چاہیے۔ آپ یقیناً ترتیب کا وہی نمونہ یا پیشکش کا وہی اسلوب ہر قسم کے موضوع کے لیے اختیار نہیں کریں گے اور ظاہر ہے کہ تمام مردوں اور عورتوں کو تمام اوقات میں ایک ہی قسم کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔ ہم کہہ ۴۲
سکتے ہیں کہ جو اسلوب ۱۸۹۰ء کے ٹیرف کی تاریخ کے لیے اختیار کیا جائے گا۔ وہ پیرو کی تسخیر کی تاریخ یا ہرمن میلول[2] کے سوانح کے لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا اور موزوں نہیں ہوگا۔ ہر موضوع آپ سے جداگانہ تقاضے کرتا ہے اور ہر ایک کے لیے جداگانہ طریق بیان ناگزیر ہے۔ مشاق مؤرخ یہ نکتہ وجداناً سمجھ لیتے ہیں اور اپنا اسلوب بدل لیتے ہیں جس طرح کہ پیشہ ور درزی یا فوٹوگرافر بدل لیتے ہیں۔ مثلاً ٹامس بیئر ناول نگار بھی تھا اور مؤرخ بھی۔ اس نے سٹیفن کرین کے سوانح اور "دی ماوو ڈیکیڈ" پر مقالے کے لیے الگ الگ انداز اختیار کیے۔ مارلے نے "والٹیئر" اور "گلیڈسٹون" کے مختلف تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے اسلوب اختیار کیے جو مناسب تھے۔ ہنری ایڈمز نے "ہسٹری" کے لیے الگ انداز اختیار کیا اور "ایجوکیشن" کے لیے اس کا انداز جداگانہ تھا جو زیادہ تلمیحی اور زیادہ سبک و لطیف تھا اگرچہ زیادہ پائیدار نہ تھا۔

✣

---

[1] انگریز مؤرخ (۱۸۸۹ - ۱۹۷۷ء)

[2] (۱۸۱۹ - ۱۸۹۱ء)

پانچواں باب

تاریخ کے بعض مسائل

مؤرّخ کے لیے پابندیاں

ویرونیکا ویج ووڈ لکھتی ہے ۔ مؤرخ کو نہایت ہی منکسر اور نیاز مند ہونا چاہیے ۔ ہر روز اس کے سامنے ۸۳ اس کی لاعلمی کی درجنوں شہادتیں پیش ہوتی ہیں ۔ ہر وقت وہ اپنی فراہم کردہ معلومات کے ذخیرے کی صحیح تعبیر میں ناکام ثابت ہوتا ہے اور یہ ناکامی اس کے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ۔ وہ ایک لحاظ سے اپنی فراہم کردہ معلومات کا غلام ہوتا ہے ۔ دوسرا کوئی مصنف اس غلامی کی مثال پیش نہیں کر سکتا ۔ بڑے بڑے مؤرخ اس رائے سے پورا پورا اتفاق کریں گے ۔ وہ ہمیشہ اپنی پابندیوں اور مشکلوں سے آگاہ ہوتے ہیں جن میں رہ کر کام کرتے ہیں اور ان ترغیبات و خطرات سے بھی ناواقف نہیں ہوتے جن سے دوچار رہتے ہیں لیکن عوام ان پابندیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض مؤرخین ان سے آگاہ ہی نہیں ہوتے یا اپنے پیشے میں مضمر مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے ۔

تاریخ درحقیقت اس سے زیادہ پیچیدہ اور غیر منظم ہوتی ہے جس کا صحیح اندازہ نوآموز نہیں کر سکتا ۔ جن لوگوں کا تاریخ سے واسطہ نہیں، ان میں سے اکثر اسے سادہ اور صاف و ہموار سمجھتے ہیں ۔ سوال کیا جاتا ہے آپ کیا جاننا چاہتے ہیں ۔ کیا آپ انگلستان کے منشور اعظم[1] یا بسمارک کے ماتحت جرمنی کے اتحاد یا چین میں کمیونزم کی کامیابی پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں ۔ حقائق فراہم کیجیے انھیں کسی نہ کسی معقول نظم و ترتیب کے مطابق اکٹھے کر لیجیے ۔ یہ آپ کی تاریخ ہو گی ۔ ہنری ایڈمز ایک بہت بڑا مؤرخ تھا اس نے تاریخ کے اس تصوّر کے متعلق کلاسیکی انداز میں رائے زنی کی ہے ۔ وہ لکھتا ہے ۔ میں نے امریکہ کی تاریخ کی بارہ جلدیں شائع کر دیں ۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے دل کی تسلی کر لوں ۔ آیا کسی محنت سے سخت معیار کے مطابق وہ حقائق ایسی صورت میں مرتب ہو گئے ہیں ، کہ میں انسانی تحریک کی ضروری ترتیب کے بارے میں مطمئن ہو جاؤں ؛ نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ تھا ۔ میں اعتراف کرتا ہوں

---

[1] میگنا کارٹا ۔ یعنی حقوق کا وہ منشور جو انگلستان کے بادشاہ جان سے اُمرا اور آرچ بشپ کینٹربری نے ۱۵ جون ۱۲۱۵ء کو لیا اور جو انگلستان میں عوام کی آزادی کا آغاز ہے ۔

۴۴ جسے میں نتیجہ سمجھتا تھا دوسرے لوگ اس کے متعلق کچھ اور ہی رائے رکھتے تھے اور کوئی بھی ایسا سامنے نہ آیا جس نے معیار کے متعلق ایک رائے دی ہو۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسانوں کی ترتیب کسی نتیجہ پر نہ پہنچا سکی، اور ان کے معاشرے کی ترتیب بھی کسی منزل پر نہیں پہنچا سکتی جب تک وقت کا معاملہ مصنوعی ہے اور فکر کا معاملہ انتشار کے سوا کچھ نہیں[1] لہٰذا اس نے تاریخ بالکل چھوڑ دی اور لکھا کہ میرے ناول ''السیتھر'' کے کوئی نو صفحے میری ''ہسٹری'' کی نو جلدوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ بعد کا دور اس فیصلے سے متفق نہیں لیکن یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ پابندیاں کیا ہیں جو بہت سے مؤرخین کے لیے حوصلہ فرسا ثابت ہوئیں اور جن کی بنا پر مس ویج وڈ نے ہمیں انتباہ کیا کہ عجز و انکسار کی طرف مائل ہو جاؤ۔

اوّل تاریخی معلومات کے متعلق بہت سی تحدیدات ہیں جو انسان کے جوشش و خروشش کو سلب کر لیتی ہیں مثلاً ایک معاملہ اتفاقات کا ہے۔ ماہر کیمیا یا ماہر حیاتیات جس چیز کا ضرورت مند ہو اپنے تجربات کے لیے لے سکتا ہے لیکن مؤرخ پورا کام ان معلومات کی بنا پر کرتا ہے جو اتفاقات سے دستیاب ہو جائیں، جو کچھ ہم جان سکتے ہیں۔ وہ حقیقتاً اس کا بہت چھوٹا حصّہ ہے جو تاریخ میں پیش آیا محض یہی نہیں بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے آیا وہ سراسر متفرق معلومات ہیں جو اتفاق سے ہاتھ آگئیں۔ ہم نے جان بوجھ کر انھیں مہیّا نہیں کیا تھا ہمیں تاریخ کے متعلق جو معلومات ملتی ہیں وہ ویسی ہی ہوتی ہیں جیسا برف کے تودے کو سمندر میں دیکھا جائے کہ اس کا جو حصّہ پانی سے اوپر اٹھا ہوتا ہے اس سے زیادہ حصّہ پانی کے اندر ہوتا ہے ہم سے۔ جو معلومات گم ہوئیں وہ اس لیے ہوئیں کہ کبھی انھیں مرتّب ہی نہیں کیا گیا، زمانہ انھیں کھا گیا۔ آگ اور پانی اور موسم اور بے اعتنائی کی بنا پر وہ گم ہوگئیں یا عمداً انھیں فنا کر دیا گیا۔ ہم کس طرح جان سکتے ہیں، کہ جو کچھ ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ تاریخِ ماضی کے کسی باب کے متعلق سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ درست تعبیر وہی ہے۔

دوسری پابندی تحریف کی ہے۔ ماضی کے متعلق جو ریکارڈ ہمیں ملا ہے وہ حد درجہ ناہموار اور یک طرفہ ہے۔ ہم بعض یورپی اقوام کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں کیونکہ ریکارڈ ہمارے پاس مہیّا ہے لیکن ہم خواہ مخواہ اسے تاریخ سمجھ رہے ہیں اور لکھتے وقت ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ پورے ماضی پر حاوی ہے۔ محض یہی نہیں کہ اکثر غیر یورپی معاشروں کے ریکارڈ ناپید ہیں یا گم ہو گئے ہیں مثلاً اہل افریقہ کے متعلق یا امریکہ کے اصل باشندوں کے متعلق یا اہل قرطاجنہ کے متعلق۔ لیکن جہاں ریکارڈ موجود ہیں مثلاً چین اور ہندوستان کے متعلق۔ مغربی مؤرخ ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ ہمیں یہ نہ کرنا چاہیے کہ جو چیز ہمیں پسند آئی ہے اسے تاریخ قرار دے لیں پھر اس کی

---

[1] ''دی ایجوکیشن آف ہنری ایڈمز'' مطبوعہ بوسٹن ص ۳۸۲

بنا پر وسیع اور ہمہ گیر تعمیمات شروع کر دیں اور ان کی بنیاد سراسر ناقص یا ہماری اپنی تیار کردہ ہو۔

محض یہ حقیقت کہ تاریخ زیادہ تر مکتوب ریکارڈ پر مبنی ہے۔ ہمارے معاملے میں عدم توازن پیدا کر دیتی ہے اور ہمارا نظریہ بگڑ جاتا ہے کیونکہ اس کا مطلب بہرحال یہ ہے کہ ہم مکتوب ریکارڈ کے باب میں مبالغے سے کام لیتے ہیں، سمجھ لیتے ہیں کہ جن لوگوں نے ریکارڈ محفوظ رکھے انھوں نے ان لوگوں کا نقطۂ نگاہ سامنے لانے پر توجہ نہ کی جن کے ریکارڈ موجود نہیں یا جن کے ریکارڈ متفرق اور اتفاقی ہیں اور ان سے معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ قریباً ہر مؤرخ بلاارادہ مغربی یورپ کی تاریخ کا اندازہ سامنے رکھتا ہے اور دوسروں کے وہ خلاف ہے۔ مثلاً وہ یہودیوں کے حق میں ۸۵
ہوگا لیکن اہلِ بابل کے خلاف۔ یونانیوں کا حامی ثابت ہوگا اور ایرانیوں کا دشمن۔ رومیوں سے اسے الفت ہوگی لیکن بربریوں کو وہ اچھا نہ سمجھے گا۔ ہمارا معاشرہ اعلیٰ پیمانے پر پہنچا ہوا ہے لیکن ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہمارے ہاں بھی مکتوب ریکارڈ کی سحرانگیزی کی بنا پر تحریفات ہوئی ہیں۔ امریکہ کی تاریخ پر یہ رنگ کیونکہ چڑھ گیا کہ نیو انگلینڈ میں بسنے والے لوگ اپنے ریکارڈ رکھنے میں بڑے باقاعدہ اور سرگرم تھے اور ورجینیا یا کیرولینا میں بسنے والے ویسے نہ تھے۔ جیمز ٹاؤن[1]، پلائی ماؤتھ سے پیشتر وجود میں آیا تھا لیکن امریکہ کے سکولوں میں پڑھنے والے تمام بچے نہ محض نظم، افسانوں یا تصویروں سے بلکہ تاریخ سے بھی جانتے ہیں کہ سب سے پہلے امریکہ آنے والے اور پیوری ٹنوں کی کہانی کیا تھی۔ غلاموں کا آقا پڑھا لکھا تھا اور بول سکتا تھا۔ ریکارڈ رکھ سکتا تھا لیکن حبشی غلام ان پڑھ اور بے زبان تھے۔ حال ہی میں غلاموں کے آقاؤں کی داستانِ غلامی ہمارے ہاتھ آ گئی اور اسے وسیع پیمانے پر تاریخ سمجھ لیا گیا۔

مکتوب ریکارڈ کی کشش یا دباؤ کی وجہ سے تحریف کا ایک اور عنصر بروئے کار آیا۔ جو چیز ریکارڈ مرتب کرنے والے کو نیز مؤرخ کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ڈرامائی اور خوش منظر ہوتی ہے یا وہ اوٹ پٹانگ اور حوادث سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ پہلے بھی درست تھا اور آج بھی درست ہے اگر شک ہو تو کسی بھی روزانہ اخبار کو دیکھ کر اس حقیقت کی توثیق کر سکتے ہیں۔ راہب وقائع نگاروں نے بہت سے ریکارڈ ہمارے حوالے کیے لیکن ان میں وہ روزانہ زندگی کے وقائع نہیں لکھتے۔ صرف وہی وقائع لکھتے ہیں جنھیں وہ غیر معمولی یا معجز نما سمجھتے تھے۔ مثلاً دمدار ستاروں کی نمود، زلزلے، طاعون کا پھیلنا اور جنگیں۔ لاکھوں کنبوں نے تاریخ کے اس نظریئے کی تصدیق یوں کر دی کہ اپنے کنبوں کی بائبلوں میں صرف پیدائش اموات یا شادی کے واقعات لکھے۔ مؤرخ نے بھی صرف

---

[1] سب سے پہلا قصبہ جس کی بنیاد انگریزوں نے امریکہ میں رکھی۔

ڈرامائی، غیر معمولی اور رومانی واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ بڑے آدمیوں اور دولت مندوں کے واقعات لکھتا ہے کیونکہ غریب آدمیوں کے واقعات بہت معمولی اور مختصر ہوتے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ایسے ہی ریکارڈوں کو تاریخ سے تعبیر کر لیتے ہیں یعنی صرف ڈرامائی اور تحیّر انگیز واقعات کے ریکارڈ کو۔ ہم کہتے ہیں کہ بڑے بڑے مدبّر یا سالار یا مکتشف تاریخ بناتے ہیں یا خاص قوموں نے خاص عہدوں میں تاریخ سازی کا کام انجام دیا۔ مثلاً ایتھنز والوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اہلِ فرانس نے انقلاب کے دوران میں۔ ظاہر ہے کہ یہ سراسر لغویت ہے۔ ہر فرد ہر دور میں تاریخ بناتا ہے غلام بھی اور آقا بھی۔ نیوزی لینڈ کے رہنے والے بھی اور پیرس والے بھی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شئے کو ہم تاریخ سازی کہتے ہیں دراصل وہ چیز ہے جو ہمیں اپیل کرتی ہے یا جس سے ہم آگاہ ہوتے ہیں یا جن کے بارے میں ہمیں لکھنا پسند ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو کچھ ہم پسند کرتے ہیں اور لکھتے ہیں وہی تاریخ ہے۔

ڈرامائی کی سحر کاری کے ساتھ ہی تعارف کا جادو بھی کارفرما ہے۔ ہم تاریخ میں جن رسمی خاکوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ یاد دلانا بہت ہی ہنگامہ خیز کوشش کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ تاریخ کے خاکے نہیں بلکہ ہمارے پیدا کردہ خاکے ہیں۔ ہم پہلے غور کر چکے ہیں کہ متعارف تاریخی ترتیبات یا علاقائی خاکوں میں کتنے خطرے چھپے ہوئے ہیں۔ ہماری یہ عادت ہو چکی ہے کہ تاریخ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ مثلاً قدیم، دورِ متوسط اور دورِ حاضر۔ حالانکہ اس کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں۔ اسی طرح ہم نے امریکہ کی تاریخ کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ مثلاً ابتدائی دور استعمار کا ہے۔ پھر انقلابات شروع ہوئے، اس کے بعد دورِ متوسط وغیرہ۔ پھر ہم نے ان تقسیمات میں مزید اصلاحات کیں جو سراسر مصنوعی تھیں۔ مثلاً" تاریخ کو زبردستی بادشاہی دَور اور صدارتی دور میں تقسیم کیا۔ اسی وجہ سے ہم لوئی چہاردہم یا نپولین کے دور اور جیفرسن یا فرینکلن روز ویلیٹ کے دوروں کا ذکر کرتے ہیں۔

ہم نے تاریخ پر جتنے نمونے چسپاں کیے ان میں سے قومی نمونہ سب سے زیادہ قوی اور سب پر حاوی ہے اور غالباً یہی سب سے زیادہ پُرشر ہے۔ قومیت تاریخ پر جتنے قیود لگاتی ہے وہ سہولت مہیّا کرنے سے بہت آگے نکل جاتی ہیں بلکہ شدید غلط فہمی پیدا کرتی ہیں۔ ہم ان قیود پر تفصیل سے آگے چل کر بحث کریں گے۔

قومیت یا نسل کی تنگ نظری سے سب آگاہ ہیں اور ہم میں سے اکثر اس بارے میں احتیاط کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہم تنگ نظری کی ایک اور شکل سے زیادہ آگاہ نہیں اور اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ وقت کے متعلق "تنگ نظری" ہے۔

"تاریخ پر جو پابندیاں عائد ہیں ان میں سے شعورِ حال غالباً سب سے بڑھ کر دِقّت خیز ہے۔ ہم فطرۃً ماضی پر اپنے نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں۔ اپنے معیاروں سے اسے پرکھتے ہیں، اپنے لفظوں میں اسے تازہ کرتے ہیں یا جب زمانۂ ماضی کی زبان میں کوئی چیز پڑھتے ہیں تو اسے اپنے عہد کے معنی کا لباس پہناتے ہیں، اور یہ فرض

کر لیتے ہیں کہ جو کچھ پیش آیا وہ ماضی کے کسی دور میں پیش آیا۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر "ماضی" کسی نہ کسی زمانے میں "حال" تھا۔ فریڈرک میٹ لینڈ ایک دانش مند مشیر کی طرح ہمیں یاد دلاتا ہے:

"اگر ہم بولتے ہیں تو لفظوں کا سہارا لیے بغیر نہیں بول سکتے۔ اگر ہم سوچتے ہیں تو فکر و خیال کے بغیر نہیں سوچ سکتے۔ ہم دورِ حاضر کے آدمی ہیں۔ ہمارے الفاظ اور ہمارے خیالات بھی دورِ حاضر کے ہیں۔ غالباً .... ہمارے لیے ابتدائی دور کے انگریز بننا مشکل ہے۔ ہمارا ہر خیال بہت تیز ہو گا۔ ہمارے ہر لفظ میں کئی اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ اندیشہ ہے کہ ہم بہت سے الفاظ استعمال کریں گے اور اپنے ہر بیان پر قیود لگائیں گے — یہاں تک کہ ان کے نقص کا انتظام کر دیں گے۔"[1]

غالباً ہم اس معاملے میں بڑی حد تک بے دست و پا ہیں۔ ہم کتنی ہی کوشش کر دیکھیں۔ میٹ لینڈ کی معجز نما تعبیر کے مطابق اپنے آپ کو ماضی کے دھندلکے میں نہیں پہنچا سکتے۔ ہم حقیقتاً سائرس[2] یا بروٹس[3] یا جون آف آرک یا امریکہ کے قدیم قبیلے کے سردار پونٹیاک کے دلوں اور جلدوں میں نہیں اتر سکتے۔ ہم کوشش ضرور کرتے ہیں، اور یہ ہمارے تاریخی ضمیر کی سختیوں کے لیے ایک خراج ہے اور چند بڑی بڑی تاریخیں اور سوانح حیات اس حقیقت کی زندہ یادگاریں ہیں کہ ہم ہمیشہ ناکام نہیں رہتے اگرچہ معاملے کی صورت ایسی ہے کہ ہمیں یہ جان لینے کی بھی اجازت نہیں لیکن شعورِ حال کی مشکل حقیقتہً زیادہ گہری ہے۔ اس کی حقیقی حیثیت یہ ہے کہ ہم وجداناً فرض کر لیتے ہیں کہ ماضی ہمارے لیے بنایا گیا تھا اور ہمارے نزدیک یہ اسی حد تک دلچسپ ہے جس حد تک ہمارے موجودہ مفاد کو پورا کرے اور یہ اسی وقت تک اہم ہے جب تک اس سے ہمارے لیے واضح نتائج مترتب ہوں۔ دیکھیے ہم کیونکر آسانی سے اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جسے عجیب و غریب مغالطہ کہا جاتا ہے یعنی یہ مغالطہ کہ ہم فرض کر لیتے ہیں، قرونِ وسطیٰ کے لوگ بھی اپنی نگاہوں میں قرونِ وسطیٰ ہی کے تھے یا دورِ احیائے علوم کا آدمی اگر ان تصورات کے مطابق زندگی بسر نہ کرے جو ہم نے اس کے لیے قائم کر رکھے ہیں تو وہ اپنی حقیقی حیثیت کھو بیٹھے گا، یا ہمارے آبا و اجداد جانتے تھے کہ وہ آبا و اجداد ہوں گے۔ ہمارے لیے یہ احساس پیدا کرنا کتنا مشکل ہے کہ زمانۂ ماضی ان لوگوں کے لیے بھی اسی طرح زمانۂ ماضی تھا۔ جس طرح ہمارے لیے زمانۂ حال ہے اور وہ اسی ماضی میں زندگی بسر

---

[1] "ماڈرن شپ اینڈ برا" [2] ایران کا مشہور حکمران جو شاہنشاہی کا بانی تھا (وفات ۵۲۹ ق م)

[3] جولیس سیزر کا دوست اور قاتل

کر رہے تھے، اور وہ ہماری روحانی اصلاح کے لیے نہیں جیتے تھے جس طرح ہم بعد میں آنے والی نسلوں کی روحانی اصلاح کے لیے نہیں جیتے۔

شعورِ حال میں ایک اور خطرہ مضمر ہے جس سے ہم کسی بھی طور بچ نہیں سکتے تاہم اس کے خلاف ہمیں ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہ خطرہ کسی چیز کے حقیقی موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ میں کیا کچھ پیش آچکا ہے اس لیے کہ جانتے ہیں لیکن ہم اس پہ معصومی کی نگاہِ بازگشت نہیں ڈال سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایتھنز نے سائراکیوز[1] کے خلاف جو مہم تیار کی تھی وہ ناکام رہے گی۔ جانتے ہیں کہ روما قرطاجنہ کو سر جھکانے پر مجبور کر دے گا۔ جانتے ہیں کہ رومی جمہوریت سلطنت میں تبدیل ہوئی۔ جانتے ہیں کہ مسلمان مغربی یورپ سے آخرکار نکالے جائیں گے اور مسیحیت کامیاب ہوگی اور انگریز بر اعظم امریکہ کے لیے کشمکش میں فتح پائیں گے اور یہ بھی جانتے ہیں، کہ واشنگٹن کی حالت اگرچہ کتنی ہی مایوسی کی تھی لیکن وہ اپنی خستہ حال فوج کے ساتھ یارک ٹاؤن[2] میں مظفر و منصور ہوگا۔ سب سے آخر میں یہ بھی جانتے ہیں کہ اگرچہ رابرٹ لی کے لیے حالات بڑے سازگار تھے لیکن وہ اپوماٹکس[3] پہنچے گا اور وہاں ہتھیار ڈال دے گا۔ ہم سب پُراسرار کہانیاں پڑھنے والے ہیں جو آخری باب سب سے پہلے پڑھتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری تاریخ کیونکر بروئے کار آئے گی اور ہمارے پیشتر کی نسلوں کے افراد بھی اپنی تاریخ کے متعلق آگاہ نہ تھے۔

ہم تاریخ میں جو کچھ پڑھ چکے ہیں اس سے اپنے دلوں اور حافظوں کو پاک نہیں کر سکتے لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ ماضی کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ "لاماسکی" ہے یعنی ہماری آنکھوں کی ساخت کا نقص پیدا ہو جانے کے باعث سب شعاعیں شبکیہ کے مرکز پہ نہیں پڑتیں بلکہ بکھری رہتی ہیں چنانچہ ہم ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے جو کچھ اس کے متعلق پڑھ چکے ہیں اور تاریخ کے متعلق وہ روش اختیار کر لیتے ہیں جس کے مطابق کسی واقعے کو دوسرے کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ حقیقۃً ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً روما بربریوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا لہٰذا اس بات کی تشریح ہم یوں کرتے ہیں کہ لوگوں کے اخلاق بگڑ گئے تھے اور ان میں رشوت عام ہو گئی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھوں سے امریکی نوآبادیاں یقیناً نکل گئیں اور ہم ٹام پین[4] کے اس تبصرہ کو قبول کر لیتے ہیں کہ ایک جزیرے کے لیے بر اعظم کا مالک ہونا بالکل لغو ہے چونکہ کنفیڈریسی (امریکہ کی جنوبی ریاستوں کا

---

[1] سسلی کے مشرقی ساحل کا مشہور مقام۔

[2] امریکہ کی ریاست ورجینیا کا ایک شہر، جہاں انگریز سپہ سالار نے ۱۷۸۱ء میں واشنگٹن کے آگے ہتھیار ڈالے۔

[3] جہاں رابرٹ لی نے ہتھیار ڈالے اور امریکہ میں خانہ جنگی ختم ہوئی۔

[4] پیدائشی انگریز۔ امریکہ کی آزادی کا سرگرم کارکن (۱۷۳۷ - ۱۸۰۹ء)

اتحاد) کی شکست یقینی تھی۔ ہم پورے وثوق سے اس شکست کے اسباب دریافت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم یہ روش اختیار کرلیں تو ماضی کو جیسا بھی وہ ہے سمجھنے کے قابل کبھی نہیں ہو سکتے۔ ڈیوڈ ڈونلڈ نے کہا ہے کہ مؤرخین درحقیقت فتحمند فوجوں کے بہیر ہوتے ہیں۔ انھیں علم ہوتا ہے کہ کون سا فریق کامیاب ہوگا۔ یعنی رومی، مسیحیت، یونین (امریکہ کی شمالی ریاستوں کا اتحاد) یا اوتیانوس کی طاقتیں۔ وہ لوگ وجداناً فتحمند فریق کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور صرف اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ فتح و کامیابی کے اسباب کیا تھے۔ اور شکست خوردہ فریق کی شہادت بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف فریقوں کی فتح و شکست میں خدا کا ہاتھ تصور کر لیتے ہیں یا سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کسی فریق کی ترقی یا ارتقا کا نتیجہ تھا۔

تاریخی تحقیق کے سلسلے میں دیانت کے لیے اس سے بڑھ کر مہلک چیز کوئی نہیں جسے ناگزیر نظریہ کہنا چاہیے اور یہ نظریہ اس روش میں مضمر ہوتا ہے۔ تاریخ میں جو کچھ پیش آیا اگر وہ ناگزیر تھا خواہ یہ خدا کی مرضی کا اظہار ہو یا ارتقا اور ترقی کی قوت کا کرشمہ ہو تو اسباب و نتائج اشیا کے سلسلے میں کسی قسم کی چھان بین کرنا بالکل بے معنی ہوگا۔ مثال چلی آتی ہے کہ خوش نصیب وہ آدمی ہے جس پر مخلوق کے اسباب آشکارا ہو جائیں۔ اگر یہ اسباب پہلے سے طے ہو چکے ہیں تو چھان بین میں نہ کوئی مسرت ہو سکتی ہے نہ اس کے لیے کوئی قدر و قیمت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ چارلز اے بیرڈ نے ہمیں آگاہ کر دیا ہے: [۱]

"اگر تمام انسانی معاملات کو قانون یا ارضی میکانیات کا درجہ دے دیا جائے تو چھان بین کا اصل مقصد بالکل بے معنی رہ جائے گا۔ کیونکہ تمام انسانی وقائع اور اعمال انسان کے ضبط و نظم سے باہر نکل جائیں گے۔ اگر عالمِ انسانیت تمام تاریخی اکتشافات کا قانون دریافت کرے تو یہ اپنی تقدیر کی زنجیروں میں جکڑا جائے گا اور ان تقدیروں کو بدلنے کی کوئی قوت اسے حاصل نہ رہے گی۔ ماضی، حال یا مستقبل بندھی بندھائی شکل میں ہمارے سامنے نمودار ہوں گے۔ انسانی انتخاب یا ارادے

---

[۱] "دی اوپن ڈور ایٹ ہوم" (نیویارک) ص ۱۴۱۔

کو ان پر کوئی قدرت نہ ہوگی۔ مرد اور عورتیں
اسی طرح اپنی تقدیروں کے ساتھ وابستہ ہو
جائیں گی جس طرح ستارے یا سمندر کی لہریں
ایک پروگرام میں بندھی چلی آتی ہیں۔"

لیکن جس حد تک ہمیں علم ہے تاریخ کی رفتار کا معاملہ پہلے سے مقدر نہیں ہو چکا۔ زندگی جیسی پہلے سے چلی آرہی تھی ویسی ہی اب ہے۔ یہ سودے اور جنگ کی گرم بازاری ہے اور زمانۂ ماضی کو سمجھنے کے لیے جو ذہنی چیلنج پیش آتا ہے وہ حال اور مستقبل کو سمجھنے کے لیے پیش آنے والے چیلنج کے مقابلے میں کم مجبور کن نہیں۔ البتہ اس سلسلے میں ایک فرق ہے اگر ہم حال کو سمجھ لیں تو اس پر قابو پا سکتے ہیں لیکن ماضی پر قابو پانا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔

٭

چھٹا باب

حقائق کے سلسلے میں مشکلات

حقائق کی حیثیت

اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا اس میں مؤرخوں کی بعض پابندیوں کا ذکر تھا لیکن تاریخی حقائق کے سلسلے میں بھی بعض حد بندیاں مضمر ہیں۔

غریب حقارت زدہ حقائق پر بڑی مشکلات کا وقت آچکا ہے۔ ان پر کسی کو یقین نہیں آتا۔ ان پر کوئی اعتماد نہیں رکھتا۔ مؤرخین بہ یک آہنگ اعلان کرتے ہیں کہ حقائق کا کوئی وجود نہیں یا ایسے حقائق موجود ہی نہیں جن پر اعتماد کیا جا سکے۔ البتہ کچھ متفق علیہ مفروضات ہیں جنھیں ہم نے حقائق کہنا شروع کر دیا ہے تاکہ ہمارا کام جاری رہ سکے۔ تاہم ان کی بنا پر غلط راستہ اختیار نہ کر لیجیے، انھیں سنجیدگی سے قبول نہ کر لیجیے ورنہ وہ تمھارا بھرم کھول کر رکھ دیں گے۔ حقائق کی حیثیت موضوعی ہے۔ ان کا وجود مؤرخ کے دل میں ہے اور ہر مؤرخ کے تعلق میں ان کا کردار بدلتا جاتا ہے مثلاً فرانسیسی مؤرخ کے نزدیک فرانس و پروشیا کی جنگ کے سلسلے میں حقائق ایک حیثیت رکھتے ہیں اور جرمن مؤرخ کے دل میں ان کی حیثیت بالکل دوسری ہے اسرائیلی ریاست کی تخلیق کے سلسلے میں یہودیوں اور عربوں کا نقطۂ نگاہ متضاد ہے گویا حقائق کی حیثیت وہی ہے جو "ایلس ان ونڈرلینڈ"[1] میں چشائر کی بلّی کی ہے۔ جب ہماری نظر حقائق پر پڑتی ہے تو وہ خود غائب ہو جاتے ہیں، اور ان کی کھسیانی ہنسی باقی رہ جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حقائق کے سلسلے میں مشکل کیا ہے؟

تناقض

سب سے اوّل ان کا تناقض ہے۔ ایک نقطۂ نگاہ سے حقائق محدود ہیں۔ دوسرے نقطۂ نگاہ سے یہ بے شمار ہیں۔ ماضی کے سلسلے میں وسیع علاقے موجود ہیں جن کے متعلق بہت کم حقائق ہمیں معلوم ہیں، انسانیت کے بہت بڑے حصّے کے متعلق ہمیں کتنا تھوڑا علم ہے۔ مثلاً ایشیا، افریقہ یا کولمبس سے

---

[1] انگریزی کی مشہور کتاب۔

پیشتر کے امریکہ کے متعلق۔ ہمیں ان قوموں کے متعلق بہت کم آگاہی ہے مثلاً اہلِ قرطاجنہ یا ایٹرسکوں
یا کلٹوں یا باسک کے متعلق۔ ماضی قدیم کے متعلق ہم بہت کم جانتے ہیں۔ ماضی قریب کے بارے میں ۷۹
زیادہ علم ہے۔ ان حالات میں ہم دنیائے قدیم کو یقین کی بنا پر کیونکر تعمیر کر سکتے ہیں۔ ہمارا علم زیادہ تر ان
چھوٹے علاقوں کے متعلق ہے جو بحیرۂ روم کے ارد گرد واقع ہیں۔ ان کے متعلق معلومات کو ہم اعتماد کے ساتھ
تاریخِ قدیم قرار دیتے ہیں۔ ہم امریکی براعظموں کی تاریخ یقین کی بنا پر کیونکر لکھ سکتے ہیں۔ پس ہماری
معلومات کا انحصار کچھ پرانی کہانیوں اور کچھ آثارِ قدیمہ پر ہے۔ پچیس ہزار سال میں سے ہمارا علم زیادہ سے
زیادہ پانچ صدیوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت کم علم ہے۔ دورِ حاضر میں بھی ہمیں غریبوں کی زندگیوں
کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور ہر نسل کی بہت بڑی اکثریتیں ہیں جن کے بارے میں ہم لائقِ اعتماد حقائق
سے تہی دامن ہیں۔

ایک اہم حقیقت

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ زمانے کا تلوّن اور اتفاق تاریخی ریکارڈ پر کیا عمل کرتا ہے اور شعورِ حال
نیز موضوعیت نے اس پر کیا اثر ڈالا ہے۔ حقائق پر اور بھی حد بندیاں ہیں مثلاً ایک ابتدائی حقیقت ہے
اور وہ یہ کہ ہم ماضی کے متعلق حقائق کی بنا پر صحت و درستی شاذ ہی حاصل کر سکتے ہیں اور یہ معاملہ
ماضی قریب سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ جو لوگ حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں، وہ تاریخ میں ہر شئے کو حقیقتہً
درست سمجھ لیتے ہیں جیسے علم کیمیا اور طبیعات میں ہر شئے کو درست مانا جاتا ہے لیکن جب وہ تاریخ ماضی کا
کوئی باب خود مرتب کرنا چاہتے ہیں تو انھیں جلد سے جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ صحت کا معاملہ ناقابلِ حصول
ہے۔ اعداد و شمار کا علم نو ایجاد ہے اور ایسے حقائق بھی ہم شاذ ہی قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں۔ ہمیں کچھ معلوم
نہیں کہ زمانۂ ماضی کے لوگوں کے ہاں پیدائش و مرگ کا حساب کیونکر رکھا جاتا تھا اور آبادیوں کی گنتی
کس بنا پر ہوتی تھی۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کی فوجوں کی کیا کیفیت تھی، جنگیں کیونکر ہوتی تھیں اور
جنگوں کے مقتولین و مجروحین کے اعداد و شمار کیا تھے۔ ہمیں پیداوار کی مقدار، جنسوں کی قیمت، دیہی
صنعتوں اور تجارت کے متعلق بھی کچھ معلوم نہیں۔ دورِ حاضر کی تاریخ میں بھی اعداد اکثر ہماری اعانت نہیں
کرتے۔ مثلاً ہم غالباً نہیں جانتے اور نہیں جان سکتے کہ شمالی امریکی ریاستوں اور جنوبی امریکی ریاستوں کے
سپاہیوں کی ٹھیک تعداد کیا تھی۔ خانہ جنگی میں کتنا نقصان ہوا، اور اس جنگ پر کیا خرچ آیا جو حقائق
دریافت طلب ہیں۔ وہ ان اسباب کی دریافت میں ہماری زیادہ مدد نہیں کر سکتے کہ برطانیہ نے کیوں جنوبی
ریاستوں کی امداد نہ کی۔ ایسا معمولی سا معاملہ بھی بحث و قیاس کا موضوع بنا ہوا ہے کہ امریکی ریل کی سڑکوں
کے لئے ریاستوں اور وفاقی حکومت نے کل کتنے ایکڑ زمین وقف کی۔ اس معاملے نیز سیکڑوں دوسرے

اہم معاملات تاریخ میں ہم صرف تعلیم یافتہ آدمیوں کے قیاسات سے مدد لیتے ہیں۔ ۵۰

ایک عجیب معاملہ

یقیناً بعض مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم زیادہ سے زیادہ صحت و یقین کے ساتھ بات کر سکتے ہیں مگر افسوس کہ ایسے مسائل چنداں اہمیت نہیں رکھتے مثلاً ہم یکے بعد دیگرے آنے والے امریکی صدروں یا انگلستان و فرانس کے بادشاہوں کی ترتیب ٹھیک ٹھیک بتا سکتے ہیں۔ ہم اس مؤرخ کو ترجیح دیتے ہیں جو بتاتا ہے کہ لِنکن کے بعد پیئرس جانشین ہوا، نہ کہ اس کے برعکس۔ اور ہم اس مؤرخ کو ترجیح دیتے ہیں جو رچرڈ نام، ہنری نام، فلپ نام اور لوئی نام کے بادشاہوں کی صحیح ترتیب بتا سکے۔ یہ بالکل معمولی مسئلہ ہے ہم لنکان کے نظم و نسق کی تاریخیں صحیح بتا سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ خانہ جنگی میں لنکان نے کیا کردار ادا کیا۔ ہم لوئی شانز دہم کے متعلق تاریخیں صحیح صحیح بتا سکتے ہیں لیکن اس امر پر قطعاً اتفاق نہیں کہ سلطنتِ قدیمہ کو برباد کرنے میں اس نے کیا کردار ادا کیا۔

دستاویزوں کی حیثیت

سب سے آخر میں یہ کہ تاریخی حقائق ٹھوس اور معروضی نہیں بلکہ لچلچے اور موضوعی ہوتے ہیں۔ رانکے اور اس کے جانشینوں نے ہمیں تاریخ کے سلسلے میں دستاویزوں پر اعتماد کا سبق دیا ہے۔ لیکن یہ دستاویزیں جس درجہ اعتماد کے لائق ہیں اس کی کیفیت خود ان کی زبان سے سن لیجیے حقیقت یہ ہے کہ انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے یہ اپنی زبان سے کچھ کہہ نہیں سکتیں۔ یہ ہماری زبانوں سے سب کچھ سناتی ہیں اور ان کی سیکڑوں مختلف تعبیریں ہیں۔ بعض کی حیثیت سرمہ در گلو کی ہے اور بعض باہم متصادم ہیں۔ ان دستاویزوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کیا کچھ حقیقۃً پیش آیا۔ بلکہ عموماً وہی سناتی ہیں جو ہم سننا چاہتے ہیں مثال کے طور پر امریکی تاریخ کی دو نہایت اہم دستاویزیں لے لیجیے ایک اعلانِ آزادی، دوسری وفاقی دستور۔ اعلانِ آزادی کا متن بھی ایک پُر پیچ معاملہ ہے لیکن اس سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اعلان کے سیاسی اور فلسفیانہ پہلو پیشِ نظر رکھ لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ غیر فانی الفاظ ہیں لیکن ان کا غیر فانی ہونا اصل الفاظ میں مضمر نہیں بلکہ بعد کی نسلوں نے انھیں یہ حیثیت دے دی۔ ان کا مطلب کیا ہے۔ جیفرسن اور اس کی برائے عظمی کانگرس کے ارکان کا مطلب کیا تھا۔ جب جیفرسن کے قلم سے یہ لفظ لکھے گئے۔ تمام انسان برابر پیدا کیے گئے اور تمام ممبروں نے اس کی تصدیق کر دی۔ جیفرسن کا مطلب کیا تھا جب اس نے لکھا تھا کہ راحت حاصل کرنے کی کوشش

ہر فرد کا ناقابلِ تبدیل حق ہے اور ممبروں نے اس کی تصدیق کردی تھی۔

فہم و تصوّر کا اختلاف

ان الفاظ سے کوئی دو آدمی ایک معنی نہیں لیتے یقیناً" ٹامس جیفرسن کی نسل (یہ اصطلاح نسل بذاتِ خود ایک مصنوعی شے ہے اگر ہم نسل کے متعلق جیفرسن کا اندازہ تسلیم کرلیں یعنی بیس سال تو وہ خود اسی سال زندہ رہا) اور ہماری نسل "مساوات" اور "راحت" کے معنی مختلف لیتی ہے۔ ہمارے دور میں بھی راحت کے معنی مرد اور عورتیں مختلف لیتی ہیں۔ یہی کیفیت شمالی اور جنوبی ریاستوں سفید فام باشندوں اور حبشیوں کی ہے۔ اصطلاح مساوات کے معنی بھی دونوں مختلف لیتے ہیں۔ ان الفاظ کے سینہ بہ سینہ معنی سمجھنے کے لیے زندگی بھر کا مطالعہ درکار ہے اور مختلف مؤرخین زندگی بھر کے مطالعے کے بعد ان کی مختلف توضیحات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شہرۂ آفاق دستاویز اپنی ترجمانی آپ نہیں کرتی۔

مختلف مثالیں

اب آپ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دستور پر غور فرمائیے یہ دستاویز کم و بیش چھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے جو بڑی احتیاط سے منتخب کیے گئے تھے۔ وہ سادہ، عام فہم اور منطقی حیثیت رکھتے ہیں
۵۱ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دستور اپنا ترجمان آپ ہے یقیناً" اس کا جواب نفی میں ہے۔ اگر یہ اپنی ترجمانی کرسکتا تو اس کی توضیح و تعبیر کے لیے سپریم کورٹ کی رودادوں کی پونے چار سو جلدوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ نہ سپریم کورٹ کے فاضل اور راست باز جج ایسے جملوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے جیسا مثلاً "مختلف ریاستوں کے درمیان تجارت" یا "قوتِ تنفیذ" یا معاہدوں کے لزوم گھٹانا یا مشترکہ دفاع اور بہبودِ عامہ یا ضروری اور خاص یا قانون کا واجب عمل۔ ان جملوں کی تعبیر میں شدید اختلاف ہے۔

یا دستاویز کی ایک اور قسم لے لیجیے یعنی "مصوّری"۔ کیا مصوری کے معنی تصویر میں خود مضمر ہوتے ہیں سب کے سب نہیں آپ اس پر ایک نظر ڈالیں آپ بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں لیکن بہت کچھ نہیں بھی دیکھتے۔ مؤرخِ فن یا نقادِ تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے بہت سی چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جو ہم سب کی نگاہوں سے چھپی رہتی ہیں۔ شاید بعض ایسی چیزیں بھی جو تصویر بناتے وقت خود فن کار کے ذہن میں بھی نہ تھی۔

مثال کے طور پر آپ آرکیڈیا[1] کے متعلق پوسن[2] کی مختلف تصویریں پیشِ نظر رکھ لیں۔ ایڈون پینوفسکائی نے اس موضوع پر ایک سحر انگیز مقالہ لکھا ہے۔ عامی شخص کے لیے یہ ایک سادہ سا معاملہ ہے۔ تصویروں میں ریوڑ چرانے والے مرد و زن ملتے ہیں جو ہر قبر پہ دوزانو ہو جاتے ہیں اور ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم سے پہلے بھی آرکیڈیا میں لوگ رہ چکے ہیں، لیکن وہ مر کر ماضی کی داستان بن گئے۔ لیکن کیا ان تصویروں کا مطلب محض یہی ہے، کیا مصوّر کے ابتدائی تصوّر کا مطلب یہی تھا۔ پینوفسکائی کہتا ہے کہ ہرگز نہیں۔ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میں بھی آرکیڈیا میں رہ چکا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ آرکیڈیا بھی موت سے محفوظ نہیں۔ اس تعبیر کے مطابق تصویروں کا مرکزی موضوع بالکل بدل گیا۔ یہ امر یاد نہیں دلایا جاتا کہ ہر نسل راحت سے ہمکنار ہو چکی ہے بلکہ یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ موت ہر لحظہ سامنے ہے اور آرکیڈیا بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں مگر آگاہ رہیے معاملہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے مصوّروں نے ابتدائی معنی بالکل بدل دیے۔ انھوں نے پوری تصویر کو آرکیڈیا میں موت کے وجود سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اسے ایک دیہاتی منظر بنا دیا جس کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ راحت میں متصل ہے نہ کہ موت میں۔

دریائے ڈلوئیر کے عبور کی تصویر

ایک اور قیمتی دستاویز پر غور کیجیے جو زیادہ متعارف ہے یعنی عمانوئیل لیوٹسے[3] کی تصویر "واشنگٹن کا عبور ڈلوئیر" — یہ کوئی معاصر ریکارڈ نہیں۔ ڈلوئیر[4] کو عبور کرتے وقت کوئی فن کار مصوّر موجود نہ تھا۔ یہ تصویر اصل عبور سے پچھتّر سال بعد بنائی گئی۔ دریا ڈلوئیر نہیں رائین تھا۔ واشنگٹن نہ تھا بلکہ ورتھنگٹن وٹرج تھا یعنی ایک نوجوان امریکی فن کار جو ڈسلڈارف (جرمنی) میں تعلیم پا رہا تھا۔ یہ منظر بھی لیوٹسے کے رومانی تخیل کی پیداوار تھا۔ اگر واشنگٹن اس کشتی میں کھڑا ہوتا تو یقیناً

---

[1] یونان کا ایک ضلع — یہ پہاڑی علاقہ ہے، یہاں عموماً سادہ وضع کے لوگ رہتے ہیں۔

[2] فرانسیسی فن کار (۱۵۹۴ - ۱۶۵۶ء)

[3] جرمن نژاد مصور (۱۸۱۶ - ۱۸۶۲ء)

[4] امریکہ کا ایک دریا — جو ریاست نیویارک سے نکلتا اور اوقیانوس میں گرتا ہے۔ جنگِ آزادی میں واشنگٹن نے یہ دریا عبور کرنے کے بعد کامیابی حاصل کی تھی۔

دریا میں گر جاتا - پرچم بھی نادرست تھا - چونکہ دریا سردی کی رات میں صبح سے پہلے عبور کیا گیا تھا اس لیے واشنگٹن یا کشتی کے ملاح تاریکی میں نظر نہیں آ سکتے تھے لیکن یہ سب حقیقتیں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دی گئیں - تصویر نے اپنے لیے ایک نئی زندگی پیدا کر لی - لوگوں نے اس جوش سے اس کا خیر مقدم کیا - گویا دریائے ڈلویئر کو عبور کرنے کی یہ زیادہ سے زیادہ صحیح تصویر ہے - یوں یہ تصویر امریکیوں کے دلوں اور ذہنوں میں اتر گئی اور عملی نقطۂ نگاہ سے یہ سب کے نزدیک تاریخی واقعے کی صحیح نمائندگی کر رہی ہے - اگر یہ صحیح تاریخی واقعے کی نمائندگی نہیں کرتی تو سمجھ لیجیے کہ یہ خود ایک تاریخی واقعہ ہے -

غرض دستاویز کے کئی معنی ہو سکتے ہیں - اس کے معنی کا تعین معاصرانہ تاریخ کی روشنی میں ۵۲
کیا جا سکتا ہے - یہ اس عقل، مزاج اور رجحانات کے ماتحت سمجھی جا سکتی ہے جو مؤرخ پیدا کرتا ہے اور اسے ان علامتوں کے ذریعے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جن پر یہ مبنی ہوتی ہے - معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا کیونکہ مؤرخ کو ہر چیز ایک ایک خوانندہ تک پہنچانی ہوتی ہے اس لیے ہر شخص دستاویز کو پڑھے گا - اپنے طریق پر اس کا تجزیہ کرے گا جس طرح ہر شخص وسلر[۱] کی تصویر یا موزارٹ کی موسیقی کو اپنے رنگ میں تعبیر کر لیتا ہے -

حقائق کی نوعیت

تاریخی حقائق جزوی اور موضوعی ہوتے ہیں اور بخوبی گرفت میں نہیں آتے لیکن یہ حقیقت ان میں سے اکثر علوم کے متعلق درست ہے جن میں انسان مصروف ہوتے ہیں اور جن کے لیے انسانوں کے دل میں خاص جذبہ موجود ہوتا ہے - مثلاً فن، مکاتیب، اخلاق، اخلاقیات بلکہ قانون اور سیاسیات بھی - جیسا کہ ہر عدالت کے جج اور ہر مدبّر کو علم ہے - ہمیں یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ بہت سے دوسرے علوم سے تعلق رکھنے والوں کے مقابلے میں مؤرخ کے لیے یہ منزل آسان ہو جائے گی جو لوگ ماضی کی میراث یعنی اس کے قوانین، اصول اور یادگاروں کو فکر، جذبے اور جذبات کے ذریعے سے اپنے عہد کے حقائق کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے میں مصروف رہتے ہیں - ان سب کی صورت یہی ہے - یہ چیز صرف تاریخ کے لیے نہیں بلکہ خیال، کردار اور عادات کے پورے سر و سامان کی کیفیت ملحوظ رکھتے ہوئے ولیم وان موڈی[۲] نے یہ دل ہلا دینے والے شعر کہے تھے:

" زمین کوئی چھپی ہوئی شے نہیں
جس پر ہم اہل زمین تعمیرات کرتے ہیں -

---

۱ امریکی فن کار (۱۸۳۴ - ۱۹۰۳ء)

۲ امریکی شاعر (۱۸۶۹ - ۱۹۱۰ء)

وہ زیادہ سے زیادہ رفتار بدلتی رہتی ہے
ادھر سے آتی ہے، اُدھر نکل جاتی ہے
مَیں اپنے پاؤں کے نیچے محسوس کرتا ہوں
اس کی نرم نرم جسامت ہانپتی اور کانپتی محسوس ہوتی ہے
جیسے مخمل میں پاؤں دھنس جائے۔
لیکن وہ ڈولتی ہے پھر اپنے پیندے پر مستقیم ہو جاتی ہے
جیسے طوفان کی آزمائش گاہ سے بچ کر نکلا ہُوا جہاز[1]

اگر ہم تاریخ کی حد بندیوں اور مشکلات کا اعتراف جزواً جزواً کر لیں اور انھیں بہت سخت سمجھ لیں تو معاملہ ختم ہے۔ اگر حد بندیاں واقعی شدید ہیں اور حقائق واقعی گرفت میں نہیں آتے تو ہم تاریخ کو بالکل ترک کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر ہم اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں تو حقائق کی کسی نہ کسی بنیاد پر ہمیں اتفاق کر لینا چاہیے یا تاریخوں کے عام ڈھانچے کو منظور کیے بغیر چارہ نہیں جیسے یہ حقیقتیں کہ واشنگٹن ریاستہائے متحدہ کا پہلا صدر تھا، یا ریاستہائے متحدہ نے میکسیکو سے لڑائی کی، جس کی بدولت ٹکساس اور کیلیفورنیا کی ریاستیں اسے ملیں، یا لنکن واقعی قتل کیا گیا تھا۔ غرض حقائق اگرچہ خاصے دغاباز ہیں لیکن ان کی حیثیت نحو اور گرامر کی سی ہے۔ ہمیں ڈھانچے اور میکانکیت کے لیے حقائق کی ضرورت ہے۔ گرامر کے تعلق میں تقدس کا کوئی پہلو نہیں۔ اس کے استعمال میں خاصی وسعت دے دی گئی ہے۔ اگر ہم قدم قدم پر ایک ایک معاملے کے لیے گرامر کی سند تلاش کریں گے تو اپنا لکھنا یا کہنا کہیں ختم نہ کر سکیں گے۔ ۵۳

مؤرخین بہر حال ان مشکلات پر قابو پاتے ہوئے آگے بڑھے ہیں جو ان کے گرد و پیش منڈلا رہی تھیں اور ہمیں اعلیٰ درجے کی تاریخیں انھوں نے دی ہیں۔ گبن کو مشکلات کا احساس تھا۔ اسی طرح میکالے، رانکے مومسن، میٹ لینڈ، ہولڈزورتھ، پارکمین اور ہنری ایڈمز سب کچھ جانتے تھے لیکن ان سب نے تاریخیں مرتّب کیں، جن کی وجہ سے خلقِ خدا کے فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور نسلوں کی روحوں میں تازگی آئی۔

نوجوان مؤرخ کو یونانی ادب کے مندرجہ ذیل شعر دل نشین کر لینے چاہئیں:

"تباہ شدہ جہاز کا ملّاح جو اس ساحل پر دفن ہوا،
تمھیں ندا دیتا ہے کہ بادبان کھول دو۔
بیشک ہم تباہ ہو گئے لیکن بہت سی کشتیاں کنارے
پر پہنچ گئیں طوفانوں سے گزرتی ہوئی۔"

---

[1] گلوسٹر مُورز

ساتواں باب

تعبیر اور تعصّب

ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ تاریخ نہ سائنٹیفک ہے نہ میکانکی۔ مؤرخ انسان ہوتا ہے لہٰذا اُس سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ معیاری تاریخ جو کامل معروضی ہو اور ہر جذبے سے پاک ہو کر لکھی جائے، محض ایک وہم ہے۔ خود موضوع کے انتخاب میں بھی ایک گونہ تعصّب ہوتا ہے۔ مواد فراہم کرنے میں بھی تعصّب کارفرما رہتا ہے۔ ترتیب و پیشکش میں بھی اس سے چھٹکارا نہیں ملتا اور لازماً تعبیر میں بھی اُس کی جھلک نمایاں رہتی ہے۔ دانستہ یا نادانستہ مؤرخ تعصّب سے پاک نہیں ہوتے۔ وہ اپنے وقت، نسل، عقیدے، طبقے اور ملک کی مخلوق ہوتے ہیں بلکہ قیدی۔

بہت سے مؤرخ مردانگی سے کام لے کر تعصّب سے الگ رہتے ہیں اور معروضیت کے درجے پر پہنچ جاتے ہیں لیکن اس وقت جب وہ تاریخ پڑھاتے ہیں یا تاریخ لکھتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ ایسے بھی ہیں جو محض مخالفت یا تسلیم کو ناگزیر سمجھ کر تعصّب قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اسے انھوں نے ایک بہت بڑی نیکی سمجھ لیا۔ مشہور جرمن مؤرخ ٹریٹکے پہلی روش کا نمائندہ ہے۔ یعنی اس نے جوشِ مخالفت میں لکھا ۱۸۶۵ء میں لکھتا ہوا کہتا ہے۔ جوشِ خون سے بالکل خالی معروضیت جس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ بیان کرنے والے کا دل کس طرف ہے، صحیح تاریخی حس کا تضاد ہے خود اس نے "ہسٹری آف جرمنی اِن دی نائن ٹینتھ سینچری" لکھی جو کئی جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک باقی نہ رکھا کہ اس کا دل، اس کا ذہن اور اس کا مزاج کس فریق کا حامی تھا۔ امریکی مؤرخ چارلز بیرڈ دوسری روش کا نمائندہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حقائق کا انتخاب اور ترتیب خواہ اس کا تعلق تاریخ کے کسی بڑے دور سے ہو یا مقامی معاملے سے یا دُنیا، نسل اور طبقے سے، وہ لازماً انتخاب کرنے والے یا ترتیب دینے والے کے ذہن کی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب تک یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے، عزت اور شرف کا تقاضا یہی ہے کہ مؤرخ اس کا اعتراف کر لے یعنی مان لے کہ اس نے تعصّب کی بنا پر کام کیا۔ بیرڈ مزید کہتا ہے کہ تاریخ پروپیگنڈے کا ایک آلہ ہے۔ لہٰذا ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ پروپیگنڈا اچھے مقاصد کے لیے کیا جائے مثلاً امن اور ترقی کے لیے، انصاف اور سچائی کے لیے۔ برائی کی پرچھائیں بھی اس پر نہ پڑنی چاہئیں۔

مؤرخ مستحق ہمدردی ہے

آپ کو غریب مؤرخ سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے۔ وہ قدرت اور فطرتِ انسانی کے حالات کا قیدی اور شکار ہے۔ سینٹ انیٹنی[1] بھی اتنی زیادہ ترغیبات کا شکار نہیں ہوا تھا اگر وہ دورِ حاضر کا آدمی ہے تو قرونِ وسطیٰ کے آدمیوں کو سمجھنے کے قابل کیونکر ہوگا۔ اگر وہ یورپ کا رہنے والا ہے تو کیا کبھی ایشیا، افریقہ یا امریکہ کی دُنیاؤں کو سمجھ سکتا ہے اور ان سے انصاف کرسکتا ہے؟ اگر وہ سفید فام ہے تو سانولے یا سیاہ رنگ کے لوگوں کو حقیقتہً سمجھ سکتا ہے جو انسانیت کا تین چوتھائی ہیں۔ اگر وہ عیسائی ہے تو کیا ان لوگوں کے ساتھ اس سے انصاف کی توقع رکھی جاسکتی ہے جنھیں اس نے کافر اور بُت پرست قرار دینا سیکھا۔ اگر وہ کیتھولک ہے تو کیا اس صورت میں پروٹسٹنٹوں کے ساتھ انصاف برت سکتا ہے۔ اگر وہ پروٹسٹنٹ ہے تو کیا پاپائیت اور محکمہ تحزیرات مذہبی کے ساتھ اس سے انصاف کی توقع رکھی جاسکتی ہے پھر کیا وہ متوسط طبقے یا بالائی طبقے سے تعلق رکھتا ہے؛ کسی نہ کسی سے اس کا تعلق ضرور ہوگا نیز کیا وہ خواندہ اور تعلیم یافتہ ہے؛ اس صورت میں مزدوروں اور دہقانوں کے نقطۂ نگاہ کو ٹھیک ٹھیک کیونکر سمجھ سکتا ہے؛ کیا میکالے جیسا لبرل خاندان سٹورٹ سے انصاف کرسکتا ہے؟ کیا البرٹ میتھیز جیسا مارکسی قدیم نظامِ حکومت کے تعلق میں متوازن طرزِ عمل اختیار کرسکتا ہے؟ یا جیرونڈ[2] کے متعلق اس سے صحیح رائے کی توقع ہو سکتی ہے؟ کیا البرٹ بیورج جیسا ری پبلکن جیفرسن کو یا کلاڈ باورس جیسا ڈیموکریٹ ہملٹن کو یا آرتھر شلیسنگر جونیر جیسا نئے نظام کا حامی ہربرٹ ہوور کے متعلق صحیح رائے دے سکتا ہے؛ کیا جارجیا کا کوئی معزز آدمی مثلاً الرچ بی فلپس غلامی کی حقیقت سمجھ سکتا ہے؛ یا کیا ڈوبوائس جیسا حبشی مارکسی غلامی کے حامیوں اور جنوبی ریاستوں کے بوربونوں کے بارے میں جذبات سے الگ رہ کر رائے دے سکتا ہے؛ سب سے آخر میں کیا کوئی انگریز یا آئرستانی یا جرمن یا فرانسیسی اپنے (مخصوص) قومی رجحانات سے آزاد رہ کر ایسی تاریخ لکھ سکتا ہے جس میں قومی علاقوں اور وفاداریوں کے بارے میں کوئی اشارہ موجود نہ ہو؟

---

[1] مسیحی بزرگ (۱۱۹۵-۱۲۳۱ء)۔

[2] فرانس کا ایک ضلع۔ نیز دورِ انقلاب کی ایک پارٹی جس کے زیادہ تر رکن اس ضلع کے تھے۔ یہ انقلابی پارٹی سیاسیات میں اعتدال پسند تھی۔ ۱۷۹۳ء میں اس کا زور ٹوٹ گیا۔

لارڈ ایکٹن کا تصور

لارڈ ایکٹن کو توقع تھی کہ نئی نسل کے مؤرخ ان سوالوں کے جواب اثبات میں دے سکیں گے۔
۱۸۹۶ء میں اس نے تعاون کے اصول پر "کیمبرج ماڈرن ہسٹری" کی ترتیب کی تحریک چلائی تو جن لوگوں سے مضمون حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا انھیں لکھا:

"ہم کسی معاملے کے متعلق غیر ضروری
اظہارِ رائے سے احتراز کریں گے مختلف حصّے
لکھنے والوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی
چاہیے کہ ہماری لکھی ہوئی جنگ واٹرلو
فرانسیسیوں، انگریزوں، جرمنوں اور
ولندیزیوں کے نزدیک یکساں اطمینان بخش
ہونی چاہیے اور مصنفین کی فہرست کا جائزہ
لیے بغیر کسی کو معلوم نہ ہونا چاہیے کہ بشپ
آکسفورڈ نے کہاں قلم رکھا اور اس کے بعد
فیربیرن نے اٹھایا، یا گیس کوئے نے۔
لائبر مین نے اٹھایا، یا ہیری سن نے۔"

لیکن چند ہی مؤرخ اس سخت معیار پر پورے اُتر سکے۔ اس سلسلے میں خود ایکٹن کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے معیار پورا کیا۔

تاریخ میں کسی رجحان کا دریافت کر لینا سہل ہے۔ یہ جان لینا مشکل ہی نہیں کہ تاریخ میں جو کچھ پروپیگنڈے کے نام سے جاری ہے اس کی حیثیت کیا ہے۔ بیشتر پروپیگنڈا تاریخ یا تاریخوں کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچتا۔ مثلاً نازی مؤرخوں نے آریائی نسل کی برتری اور ہٹلر کے جرمنی کی معصومیت ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کیا وہ قابل توجہ نہیں۔ اسی طرح کمیونسٹ مؤرخ کمیونسٹ پالیسی کو ہر موڑ پر حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جو کچھ لکھتے ہیں وہ قابلِ توجہ نہیں۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں جو تاریخیں سب سے بڑھ کر اثر و رسوخ کی حامل مانی جاتی ہیں وہ محض پروپیگنڈا تھیں مثلاً کلارینڈن کی کلاسیکی کتاب "ہسٹری آف دی ریبیلین" یا
۵۵ اینی رینال کی کتاب "فلوسوفیکل ہسٹری آف دی انڈیز" جو کلیسیا کے خلاف حربۂ جنگ تھی۔ یا فریڈرک میسن کی کتاب "بائیوگرافی آف نپولین" جو مداحانہ کتاب تھی۔ یا ہنری ولسن کی کتاب

"رائز اینڈ فال آف دی سلیو پاور اِن امیریکا" ۔ ہمارے زمانے میں پروپیگنڈے یا طرفداری کے اجزا بہ آسانی دریافت کیے جا سکتے ہیں ۔ یہ ایسی بڑی کتابوں میں بھی موجود ہیں جیسے مثلاً بیرڈ کی کتاب "امیریکن فارن پالیسی بیٹوین دی وارز" یا پیرنگٹن کی نہایت عمدہ کتاب "مین کرنٹس آف امیریکن تھاٹ" یا چرچل کی کتاب "ورلڈ کرائسیس" ۔ لیکن ہم اس وجہ سے انھیں بُری کتابیں نہیں سمجھتے ۔

طرفداری

حقیقت یہ ہے کہ طرفداری بعض اوقات تاریخ نگاری میں ایک کیف پیدا کر دیتی ہے کیونکہ طرفداری موضوع سے دلچسپی جوش اور جذبے کا اظہار ہوتی ہے اور ان سے قارئین میں جوش پیدا ہوتا ہے ، جو محتاط نگاری سے پیدا نہیں ہو سکتا ۔ یقیناً میکالے اب تک زندہ ہے ۔ سٹبز اور گارڈنر کو صرف خاص آدمی ہی پڑھتے ہیں ۔ موٹلے نے "رائز آف دی ڈچ ری پبلک" کی تاریخ بڑے ولولہ انگیز انداز میں لکھی ۔ قارئین کی نسلیں اس سے متاثر ہوئیں ۔ ان میں آزادی کا جوش پیدا ہوا ، اور وہ استبداد سے نفرت کرنے لگے ۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سراسر گمراہ کن تھی ۔ پیرنگٹن میں خامیاں یقیناً ہیں لیکن وہ امریکی ادب کے لیے ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جس کی برابری کوئی مؤرخ اور نقاد نہیں کر سکتا ۔ چرچل نے انگریزوں کے حوصلے کو جو شاندار خراج پیش کیا ۔ اس نے تاریخ میں ایسے نتائج پیدا کیے جن کی برابری موجودہ صدی کی کوئی تاریخ نہیں کر سکتی ۔ لارڈ ایکٹن خود ایک بے داغ مؤرخ تھا ۔

وہ لکھتا ہے :

> "زبردست اور حد درجہ اثر پیدا کرنے والی
> شخصیتیں ...... خود اپنے لمبے چوڑے
> سائے صفحات پر ڈال دیتی ہیں ۔ یہ بڑے آدمیوں
> کا خاص طریقہ ہے اور بڑا آدمی متعدد بے داغ
> مؤرخوں کے برابر قیمتی ہوتا ہے ۔"

لہٰذا ہمیں تاریخ کے غیر سائنٹیفک ہونے پر گھبرانا نہ چاہیے ۔ ہم نے مانا کہ اس میں طرفداری کی جاتی ہے ۔ مؤرخوں کا نقطۂ نگاہ انتہائی حد تک موضوعی ہوتا ہے ۔ اس میں کسی چیز کو غلط طریقے پر پیش کرنے کا رجحان بہ آسانی پیدا ہو جاتا ہے ۔ بعض اوقات اس کی حیثیت پروپیگنڈے کی بن جاتی ہے اس میں بھی شبہ نہیں کہ تاریخ میں مؤرخین کی شخصیت رجحانات اور خاص افکار منعکس ہوتے رہتے ہیں خواہ انھیں اچھا سمجھا جائے یا بُرا ۔ لیکن اس کے فائدے بھی ہیں ۔ پروپیگنڈے کا معاملہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور مؤرخ کے خاص افکار و خیالات عموماً دلچسپ ہوتے ہیں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ

انسانوں کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس کی حیثیت سائنٹیفک اور موضوعی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں نہ کاملاً غیر جانبدار انصاف ہے، نہ کاملاً غیر جانبدار سیاسی، اقتصادی اور مجلسی نظریہ ہے، نہ غیر جانبدار تعلیم ہے۔

یہاں ایک تعصب، ایک رجحان ایک فکر ہے جو بہت قوی اور چھایا ہوا ہے کہ اس پر بطور خاص غور کر لینا چاہیے۔ یہ نیشنلزم ہے۔ تاریخ کو ہر درجہ آفاقی مطالعہ ہونا چاہیے جس کی ہمدردیاں ہمہ گیر ہوں، دلچسپی ہمہ گیر ہو۔ وہ تاریخ گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں نیشنلزم کا آلہ کار بن گئی ہے۔

نیشنلزم

بلاشبہ نیشنلزم دورِ حاضر کی تاریخ میں نہایت زبردست قوت ہے اور یہ امر ہرگز تعجب انگیز نہیں کہ اس نے تاریخ نگاری پہ تصرف حاصل کر لیا نیز تاریخ نگاروں کو غلام بنا لیا۔ اب تاریخ نگار آفاقی زبان میں نہیں لکھتا مثلاً لاطینی میں۔ یا اٹھارھویں صدی کی فرانسیسی میں، بلکہ تاریخ کے لیے اپنی قومی زبان استعمال کرتا ہے اور تاریخی وقائع کو قومی ڈھانچے کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا انحصار تاریخی ذخیروں یا ایسے ہی دوسرے مصادر و مواد پر ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ ناگزیر قومی ہوتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں قوم پرستی کی سرگرمیوں کو اقلیت اور آفاقیت قدرے اعتدال پر لے آئی۔ اگر ہیئوم کی کتاب "انگلینڈ" یا رابرٹسن کی "سکاٹ لینڈ" یا میولر کی "سوئٹزرلینڈ" نے تاریخ کو نقطۂ ماسکہ سے کسی قدر ہٹا دیا تو تاریخی حقیقت کو کچھ زیادہ نقصان نہ پہنچا یا لیکن قوم پرستی کے دور کی وہ تاریخیں بالکل مختلف تھیں جو انقلاب فرانس اور نپولین کی طوفانی لہروں کے ساتھ آئی۔ اور اس نے دورِ حاضر کی جارحانہ اور جنگ جویانہ قوم پرستی کی شکل اختیار کی۔ نئی تاریخ میں قومی مفاد، تعصبات، جذبات یا اس سے بھی زیادہ بری چیزوں کا عکس نمودار ہوا۔ یہ قومیت اس سے بالکل مختلف ہے جو رابرٹسن کی تصنیف "سکاٹ لینڈ" میں نمودار ہوئی یا جس نے مچلے کی کتاب "فرانس" کی رومانیت کا لباس پہنا، یا ٹریٹسکے کی "جرمنی" کی جارحانہ قومیت میں نمودار ہوئی بلکہ بیلیکے کی "ہسٹری آف دی بوہیمین پیپل" کا جذبۂ حبِّ وطن یا جارج بین کرافٹ کی "ہسٹری آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس" کا سرگرم جوش و خروش نمایاں ہوا۔

جس نیشنلزم سے ہم آگاہ ہیں وہ ماضی قریب کی پیداوار ہے اور اس کا دائرہ بہت تنگ ہے ایسے مغربی یورپی ملکوں نے ایجاد کیا یعنی برطانیہ، فرانس اور جرمنی نے، اور اسے فروغ حاصل کیے ہوئے دو سو سال سے بھی کم مدت گزری ہے۔ مؤرخوں کا اسے عالمی تاریخ سے ملانا، یا اس کا رشتہ آفاقی نظام سے جوڑنا جیسا کہ بعض کرتے ہیں یا اس میں مطلق قدریں اور مطلق خوبیاں دیکھنے کی کوشش کرنا، یا حقیقت کو

صرف ایک قوم کا جذبہ خاص بنانا تاریخ سے صریح غدّاری ہے۔ یہ اس حقیقت کی بھی خلاف ورزی ہے جسے ہم تاریخ میں ضمیر کی آواز کہہ سکتے ہیں۔ کُل کو جزو کے تابع رکھنا یا دوامی کو عارضی سے گھٹانا یا مقصد کو ذرائع پہ قربان کرنا ہرگز درست نہیں۔

نمایاں تعصّب جو نیشنلزم کا خاصہ ہے بہ آسانی دریافت کیا جا سکتا ہے اور اسے الگ کر لینا مشکل نہیں لیکن تعصّب کی ایک زیادہ پُرپیچ شکل بھی ہے جو تاریخ میں اس طرح ضم ہو جاتی ہے کہ شعورِ حال جس پہ ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اسے الگ نہیں کر سکتا۔ یہی شے ہے جسے ہم تب کی جگہ اب کا مسئلہ کہتے ہیں، یعنی ماضی کی جگہ حال کا۔ سوال یہ ہے کہ مؤرخ ماضی کے متعلق بحث کرتا ہوا کیا نظریہ اختیار کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ماضی کے معاشرے اور تہذیبیں ہمارے اپنے دور کے معاشروں اور تہذیبوں سے بالکل مختلف تھیں۔ کیا وہ اپنے معیاروں اور قدروں پر قائم رہے گا۔ یا ان معیاروں اور قدروں سے کام لینے کی کوشش کرے گا جو ان لوگوں اور ان کے دور کی تھیں جن سے وہ بحث کر رہا ہے۔

بادی النظر میں یہ مسئلہ بہت سہل معلوم ہوتا ہے۔ صحیح اور مناسب طرزِ عمل یہ ہے کہ اسی دور اور اسی قوم کے پیمانے اور معیار اختیار کیے جائیں جن کے احوال کو سمجھنے اور واضح کرنے کے لیے ہم کوشاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایرانیوں یا مصریوں یا یونانیوں کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے دورِ حاضر کے انگلستان کے معیار استعمال کرنا سراسر لغو ہوگا۔ اسی طرح امریکہ کے اصلی باشندوں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اٹھارھویں صدی کے یورپ کے پیمانے استعمال کرنا ہرگز مناسب نہ ہوگا۔ اسی طرح قدیم چینی یا قدیم ہندوستان
کے لیے اپنے فنی معیاروں سے کام لینا یکقلم گمراہ کن ہے۔ ہمارے ذہنی اور سائنٹفک معیار بھی قرونِ وسطیٰ ۵۷
کے متعلق استعمال نہیں ہو سکتے۔ ہم جن لوگوں کا مطالعہ کر رہے ہیں ان کے دلوں اور رُوحوں میں گھسنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ رانکے کا یہی قول ہے اور اس کے بعد تمام لوگوں نے اسی پر عمل کیا جسے ہم تاریخ نگاری کہتے ہیں۔ گویا ہمیں ماضی کے اندر اس طرح گم ہو جانا چاہیے تاکہ ان کی آنکھوں سے دیکھ سکیں، ان کے کانوں سے سن سکیں اور ان کے اسلوبِ فکر کے مطابق سوچ سکیں۔ انھی کے احساسات اپنے اندر پیدا کر سکیں۔ ہم اسی وقت تاریخ نگاری کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ اپنے حال سے آزاد ہو کر ماضی میں ازسرِنو داخل ہو جائیں گویا اپنی شخصیتوں کو کاملاً ترک کر کے ہم زمانۂ ماضی کا کردار دریافت کر لینے کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔

یہ نصب العین حال کی ایک سوانحی کتاب میں پیش کیا گیا ہے جو امریکہ کے مشہور مبلّغ تھیوڈور پارکر کے متعلق ہے۔

نیا نصب العین

"میں نے وہ سب کچھ جاننے اور محسوس کرنے کی

کوشش کی ہے جو پارکر اور اس کے دوست جانتے
اور محسوس کرتے تھے۔ ان کے ذہن و قلب، بلکہ ان کے
کردار کی حد بندیاں بھی قبول کی ہیں۔ میں نے کوشش
کی ہے کہ آدمیوں اور تدبیروں کو پارکر کی آنکھوں
سے دیکھوں، اس کے دور میں جو واقعات پیش آئے
ان سے ویسا ہی ردِّ عمل قبول کروں جو خود پارکر کا
تھا، یا کہہ لیجیے کہ میں سمجھتا ہوں جو پارکر کا تھا۔ میں نے
پارکر کو اسی طرح عمل کرنے کی اجازت دی، جیسا
اسے پسند آیا۔ وہی فیصلہ کیا جس کا وہ خواہاں تھا،
ان دوستوں سے محبّت کی جن سے اسے محبت تھی
ان کو گرایا جنھیں وہ ناپسند کرتا تھا۔ خواہ وہ اس
سلسلے میں سب کے متعلق عقلمندی سے کام لیتا رہا یا
نادانی سے۔ جہاں اس نے خود نمائی سے کام لیا میں
نے اس خود نمائی کو دبانے کی کوشش نہیں کی۔
جہاں اس سے بے اصولی سرزد ہوئی۔ اس پر بے اصولی
کی رائے دینا ضروری نہیں سمجھا جہاں وہ تنگ ظرف
ثابت ہوا میں نے اسے مذمّت کا تختۂ مشق نہیں
بنایا، جہاں اس نے شدّت سے کام لیا میں نے اس
کی شدت کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جہاں اس
سے غلطی سرزد ہوئی میں نے صحیح راستے پر لگانا نہیں
چاہا۔ یہ سب کچھ اس نے خود تسلیم کر لیا اس کے
الفاظ اور اس کے اعمال اس پر گواہ ہیں اور میری
مداخلت کے بغیر خود بخود ظاہر ہو رہے ہیں۔"[1]

ڈگلس فری مین، رابرٹ لی کا ممتاز سوانح نگار تھا۔ اس نے بھی اپنے لیے حد بندی کے میکانکی طریقے سے
اصل مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوا یعنی وہی جاننا چاہا جو لی جانتا تھا اور علم یا

---

[1] "گریٹ امیریکن پریچر"

اس کی ضد کو اسی ڈھانچے کے اندر محدود رکھا اور لکھا۔ ماضی کی تخلیق کے دو اور طریقے ہیں جن سے ذہنی تاریخ کے دو ممتاز استادوں نے کام لیا۔ اوّل امریکی مؤرخ وین بروکس دوسرا فرانسیسی مؤرخ پال ہیزرڈ۔ یہ ادبی اعتبار سے نہایت گہرے تعلق کی ٹکنیک ہے۔ ہیزرڈ اٹھارھویں صدی کی مہمیں بیان کرتا ہوا لکھتا ہے :

"اس زمانے میں کوئی بھی کسی ایک جگہ ٹھہرنے پر آمادہ نہ تھا۔ مونٹسکیو کو دیکھیے وہ سیاسی دستوروں کی تلاش میں تھا۔ دیدرو نے خاصی دیر تک انتظار کیا اور آخر روس کا سفر اختیار کر لیا پھر ایک روز نوجوان گولڈسمتھ نے ارادہ کر لیا کہ براعظم کی سیر کرے اور اس کے لیے نکل پڑا۔ ایک حبہ بھی اس کی جیب میں نہ تھا۔ کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس پر ضرورت کے وقت انحصار کر سکتا اور سفر کا بھی کوئی خاص پروگرام پیش نظر نہ تھا۔ بہ ایں ہمہ وہ چل پڑا، اور بانسری اس امید پر ہر مکان کے آگے بجاتا تھا کہ شاید شوربے کا کوئی پیالہ یا رین بسیرے کی کوئی جگہ مل جائے۔ ہال برگ نے ڈنمارک کو خیرباد کہی اور سفر اختیار کر لیا۔ اسے صرف اپنی خوش آہنگی پر بھروسا تھا جیسے گولڈسمتھ کو بانسری بجانے پر انحصار تھا۔ وہ چلتا گیا۔ ملک بہ ملک پھرا پیرس میں فرانسیسی زبان سیکھی اور آکسفورڈ میں استاد بن گیا لیکن اسے چھوٹی چھوٹی چیزیں مطمئن نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ نئی نئی چیزیں دریافت کرنے والے لوگ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے اور مطمئن نہیں ہوتے تھے سمجھتے تھے کہ ابھی انھوں نے دنیا کا زیادہ حصہ نہیں دیکھا۔ جلاوطنی ان کے لیے ملال کا باعث نہ تھی اجنبیوں کے دروازے کھٹکھٹانے میں انھیں کوئی باک نہ تھا اور اجنبیوں کی روٹی منہ میں ڈالنا ان کے لیے تلخی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ تقدیر انھیں وطن سے دور لے گئی۔ انھوں نے اس موقع کو فروغ علم کے لیے

استعمال کیا اور اپنے ذہنوں کو از سر نو ترتیب
دے لیا۔ والٹیر لندن آ گیا لیکن یہ آمد اس کے لیے
کچھ باعث نقصان نہ ہوئی ..... نہ ایبی پری ووسٹ
ہالینڈ میں ناخوش رہا۔ بہر حال دہ دن اس نے خوشی
سے گزارے اور خوب کھایا پیا ..... بالنگ برک
فرانس میں ایک بڑے امیر کی طرح رہنے لگا۔ اس کے
قبضے میں ایک بہت بڑا محل تھا جس کے ارد گرد
عمدہ باغات تھے اس نے ایک گروہ اپنے گرد جمع
کر لیا اور ذہنی عصا سے سب پر حکومت کرتا رہا۔
ونکل مین نے اٹلی کو اپنا روحانی گھر بنا لیا ــــ ان
آزار رسیدہ فلسفیوں پر نظر ڈالیے جو برلن میں
فریڈرک کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ ایسے
فراری نہ تھے جو کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہوں۔ وہاں
پہنچ کر وہ جلا وطن نہ رہے۔ ہم انھیں آفاقی قرار
دیتے ہیں"۔[1]

یہ سب کچھ قابل قدر ہے لیکن کیا اس سے ہم ماضی کو حقیقتہً گرفت میں لے سکتے ہیں۔ ہم سمجھ سکتے رہیں کہ اسی طرح سوچ رہے ہیں جس طرح تھیوڈور پارکر نے سوچا تھا اور وہی کچھ جانتے ہیں جو جنرل لی جانتا تھا نیز فلسفیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہم حساس ہیں مگر ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

جب ہم ماضی پر متوجہ ہوتے ہیں اور اس عہد کے ادب، اور یادگاروں کو اس کے قلب و روح میں داخل ہو جانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ صحیح راہ عمل اختیار کر لی ہے جن فلسفیوں کی ستائش ہیزرڈ نے کی ہے۔ انھوں نے وسیع ادب کا ذخیرہ چھوڑا ہے جو سحر انگیز ہے لیکن کیا وہ لوگ اٹھارھویں صدی کے جرمنی اور فرانس کے متعلق گفتگو کرنے کے حقدار تھے؟ نیو انگلینڈ[2] کے جو لوگ غلامی ختم کرنے کے حامی تھے وہ یقیناً بڑی بلند آہنگی سے بولتے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی اور اثر بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ یقیناً وہ اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے لیکن کیا وہ نیو انگلینڈ کے بھی ترجمان تھے؟ یقیناً ہم اپنے آپ کو افراد تک محدود رکھ سکتے ہیں۔ ہم جیفرسن، ایڈمنڈ برک اور نپولین کی تحریرات میں عمر بھر ڈوبے رہ سکتے ہیں یہاں تک

---

[1] "یورپین تھاٹ ان دی اٹینتھ سینچری"۔ [2] امریکہ کی ایک ریاست۔

کہ ہم اس منزل پر پہنچ جائیں کہ اسی طرح سوچنے لگیں جس طرح یہ لوگ سوچتے تھے مگر افسوس یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہم کیونکر تصور کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں ان شخصیتوں کے ساتھ گزاریں وہ اتنی مختلف رودادیں ہمارے پاس پہنچائیں گے۔

ماضی کو سمجھنے کی صلاحیت

ہم بے شک و شبہ ماضی کو سمجھ سکتے ہیں لیکن اسی صورت میں جب ہمارے پاس ادبیات کا ذخیرہ خاصا وسیع ہو۔ ہم معاشرے سے ایک حد تک آشنا ہوں اور ماضی کا تعلق قریب سے ہو۔ مگر ہم بہت پرانے اور غیر متعارف ماضی کے افکار و احساسات میں داخل ہونے کی کوشش کیونکر کر سکتے ہیں مثلاً سپارٹا والوں کے تعلق میں جو اہل ایتھنز سے بالکل مختلف تھے یا ازٹکوں یا انکاؤں کے متعلق کیا سمجھ سکتے ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات کا ریکارڈ جزوی حیثیت رکھتا ہے یا ان ڈینوں کے متعلق ہمیں ٹھیک ٹھیک کیا معلوم ہو سکتا ہے جنھوں نے نویں صدی مسیحی میں انگلستان کے ساحل پر حملہ کیا اور لوٹ مار کرتے رہے۔ غالباً ہم جیفرسن اور برک کے سمجھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ایران کے سائرس یا "ایرک دی ریڈ" کو سمجھنے کا انتظام کیونکر کر سکتے ہیں۔

حال کی آنکھوں سے ماضی پر نظر ڈالنے کی پابندیوں کے متعلق اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بات 59
سب سے بڑھ کر دل میں گھر کر جانے والی ہے خواہ ہم کتنی ہی کوشش کر دیکھیں یعنی ہمارے بس میں جو کچھ ہے اس میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ ہم ماضی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان کو اپنا لباس پہناتے ہیں ان چیزوں کو پسندیدہ سمجھتے ہیں جو ہمارے نزدیک پسندیدہ ہیں اور انھی واقعات کو اہمیت دیتے ہیں جو ہمارے نزدیک اہم ہیں۔ اس سے یہ توضیح ہوتی ہے کہ کیوں ہر نسل ماضی کی تاریخ از سر نو لکھتی ہے۔ یہ نظریہ نقطۂ نگاہ پر مبنی ہے۔

مثلاً آپ سوچیں کہ امریکی مؤرخوں نے تاریخ کی نئی ترتیب کے لیے کن کن تعبیرات کے چکر کھائے۔

ایک صدی پیشتر تقریباً تمام تاریخ خوانوں کو یہ علم تھا کہ جب جنوبی ریاستوں نے اپوماٹکس میں ہتھیار ڈال دیے تو شمالی ریاستوں نے مفتوحہ جنوبی ریاستوں پر ایک ایسی صلح عائد کی جو تعزیر پر مبنی تھی اور جنوبی ریاستوں کو یہ سبق ملا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ حقیقت میں تعمیر نو کے گناہوں کا نتیجہ تھا۔ ہماری آنکھوں سے ہمدردی کے آنسو بہ رہے تھے، اسی وقت ہم نے یہ پڑھا کہ وفاقی حکومت نے غلاموں کی جائداد ضبط کر لی جس کی قیمت دو ارب ڈالر تھی اور بے دست و پا جنوبی ریاستوں پر فوجی حکومت نافذ کر دی اور بزور یہ منوایا، یا منوانے کی کوشش کی کہ حبشیوں کو وہاں کے مغرور لوگوں کے برابر رکھا جائے حالانکہ اس وقت تک حبشی مساوات یا اس سے ملتے جلتے کسی درجے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر وفاقی حکومت نے رشوت اور بدنظمی کا ایک ایسا دور برداشت کیا جس کی مثال پہلے کی امریکی تاریخ میں نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مؤرخوں کی وہ نسل جو بیسویں صدی کے ابتدائی تہائی حصے میں مقبول مانی جاتی تھی۔ اپنی قوم کے اس فعل پر حد درجہ شرمندہ تھی جو جنوبی ریاستوں کے

تعلق میں روا رکھا گیا اور جنگ کرنے یا خانہ جنگی میں فتح پانے کے بارے میں ایسے الفاظ کہتی رہی جو معذرت پر مبنی تھے۔ لی کو ہیرو مانا جاتا تھا نہ کہ گرانٹ کو۔ جنوبی ریاستوں کی بادامی وردی نمونے کی وردی سمجھی جاتی تھی نہ کہ شمالی ریاستوں کی نیلی وردی۔ اور ہر شخص کی زبان پر وہ ترانہ تھا جو "ڈکسی لینڈ[1]" کے نام سے مشہور ہے مگر اب ہم تعمیرِ نو کو بالکل مختلف نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہماری آنکھوں پر بالکل مختلف تاریخی عینکیں لگی ہوئی ہیں اب ہمارے سامنے اس نسل کا نقطۂ نگاہ ہے جو خانہ جنگی سے بدرجہا زیادہ وحشیانہ اور زیادہ تباہ کن جنگ میں سے گزر چکی ہے اور ۱۸۶۵ء میں صلح کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ مشکل مصالحت میں سے گزری ہے دورِ وکٹوریا میں ہم جس درجہ معصوم تھے، اس درجہ اب نہیں رہے۔ انتہائی ظلم و تشدد، شدید سختیوں اور تحکم آرائیوں پر حیران ہونے کی صلاحیت کند ہو چکی ہے۔ اب ہم امریکی خانہ جنگی اور تعمیرِ نو پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے سے یہ منظر گزر چکا ہے کہ جب بالشویک کامیاب ہوئے تھے تو ان کے مخالف روسیوں کو کیا کچھ پیش آیا تھا جب فرینکو کامیاب ہوا تھا تو ہسپانیہ کے وفاداروں کو کیسے دور میں سے گزرنا پڑا تھا۔ کیوبا میں باغیوں کو پہلے "بٹسٹا" پھر "کیسٹرو[2]" کے ہاتھوں کن مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۴۴ء میں جن فوجی افسروں نے جان پر کھیل کر ہٹلر کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی۔ ان پر کیا آفتیں آئی تھیں۔ ہم تعمیرِ نو کو امریکی صوبائی نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ عالمی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو دورِ حاضر کی کوئی خانہ جنگی اتنی تھوڑی خونریزی اور اتنے کم انتقام و تحکم کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔ دورِ حاضر کی تاریخ میں فیاضی اور فراخدلی کی کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس کا مظاہرہ لنکن اور قومی حکومت نے شکست خوردہ باغیوں کے تعلق میں کیا[3]۔ ہم تعمیرِ نو تاریخ انتقامی جنگوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ صلح بڑی فیاضانہ تھی۔ ہم مالکانِ غلاماں کے نقصان کے بجائے حبشی غلاموں کی فتح پر زور دیتے ہیں۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ قانونی تحکم جنوبی ریاستوں میں جلد از جلد بحال کر دیا گیا۔ وہاں کوئی فوجی حکومت قائم نہ کی گئی اور جنوبی ریاستیں یونین میں آ گئیں۔ اس پورے کام میں صرف چند سال لگے۔ ہمیں جیفرسن ڈیوس[4] کی تقدیر کا ماتم کرنے کے بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال سے کسی قدر زائد قید میں رہا اور انیسویں صدی کی سب سے

---

[1] یہ ایک ترانہ تھا جو خانہ جنگی میں عام ہو گیا تھا۔

[2] دونوں کیوبا کے ہیں۔ بیٹسٹا کو نکال کر کیسٹرو قابض ہو گیا۔

[3] حیرت اس بات پر ہے کہ بے شمار روپیہ ضائع ہوا۔ ساڑھے سات لاکھ سے دس لاکھ تک آدمی مارے گئے لیکن فاضل مؤلف کتاب اس پر تاسف کے بجائے عالمی جنگوں کے خوفناک نقصان کی طرف مائل ہو گیا اور خانہ جنگی کے نقصانات معمولی ظاہر کیے۔

[4] (۱۸۰۹-۱۸۸۹ء) جنوبی ریاستوں نے علیحدگی اختیار کر کے ڈیوس کو صدر بنا لیا تھا۔ گویا وہ باغیوں کا صدر رہا۔

بڑی خانہ جنگی ختم ہوئی تو ایک بھی باغی کی زندگی کو نقصان نہ پہنچا۔ کسی پر کوئی پابندی نہ لگی، لگی تو محض تھوڑی دیر کے لیے۔ اب ہمیں صدر انڈریو جانسن[1] کے کردار پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ ابتدا میں ہم نے اس کے خلاف غصے کا اظہار کیا تھا پھر ہمارے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ شروع میں ہم انتہا پسندوں کے احترام پر آمادہ ہو گئے تھے، پھر ہم نے ان کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ اب ہمیں امریکی زندگی میں حبشیوں کی حیثیت کے سلسلے میں نئے حالات سامنے رکھ کر پورے مسئلے کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیے۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ آیا انتہا پسندوں کے پروگرام نے حبشیوں کے مسئلے کو حل کی راہ پر نہیں لگا دیا تھا، یا اسے چھوڑ دیا تھا کہ ہم ایک صدی بعد اس کے حل کی کوشش کریں۔ یہ کہنا بڑا "تحکّم" ہوگا کہ ان میں سے کون سا نقطۂ نگاہ صحیح ہے کیونکہ "صحیح" نقطۂ نگاہ واضح نہیں۔ واضح یہ ہے کہ مؤرخین کتنی ہی کوشش کریں وہ ماضی کو حال کی آنکھوں سے دیکھے بغیر رہ نہیں سکتے۔

جس شے کو تاریخیت کہا جاتا ہے اس پر آخری تبصرہ بھی ضروری ہے۔ جو لوگ ماضی پر اپنے معیار نافذ نہ کرنے کے لیے بہ طورِ خاص مضطرب ہیں وہ بھی ایک معاملے میں استثنا پر آ جاتے ہیں یعنی اخلاقی فیصلے کے دائرے میں وہ کہتے ہیں۔ ہمیں ماضی کو جبراً حال کی تنگ کرتی نہ پہنانی چاہیے تاہم ساتھ ہی یہ بھی درست نہیں کہ حق و باطل کے دائمی اصول اس بارے میں معطّل کر دیے جائیں۔ اس بنا پر ہم تاریخ میں اخلاقی فیصلے کے مشکل مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں۔

✣

---

[1] (۱۸۰۸ - ۱۸۷۵ء) لنکن کے زمانے میں یہ نائب صدر تھا، لنکن کے قتل پر صدر بن گیا۔

آٹھواں باب

تاریخ میں فیصلے کا مقام

ابتدائی دور

مسئلہ یہ ہے کہ تاریخی امور کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ آیا مؤرخوں کو ماضی کے بہت بڑے ڈرامے کے بارے میں فیصلے کی عدالت قائم کرنی چاہیے، یا نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ڈراما جس کے وسیع سٹیج پر مرد و زن نے اپنے اپنے کردار پیش کیے، بُرائی کا پردہ چاک کیا، اچھائی کا جشن منایا، مشہور آدمیوں کی مذمت کی یا مدح سرائی میں حصہ لیا۔ دوسرے لفظوں میں آیا مؤرخوں کو تاریخی عملیات کے بارے میں سائنٹفک تجرید کے ساتھ مشاہدہ کرنے، خود کسی فیصلے پر پہنچنے، ذاتی قومی یا مذہبی مصلحتوں کو سختی سے نظر انداز کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ کیا مؤرخین کی یہ حیثیت ہے کہ ان فرائض کو بجا لائیں یعنی جج یا غیر جانبدار روداد نگار کے فرائض۔

یہ مسئلہ بہت مشکل ہے اور شاید اسے لاینحل سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں تاریخ کے مقصد، تاریخ نگار کے فرائض اور ذمہ داریوں اور تاریخی فیصلے کی نوعیّت کے سخت سوال سامنے آجاتے ہیں نیز امتیاز نہیں کیا جاسکتا کہ آیا فیصلے کی حیثیت اخلاقی ہوگی یا سیکولر۔ اس میں یہ سوال بھی پیدا ہوتے ہیں کہ آیا مؤرخ ماضی کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے کا حقدار ہے اور ایسا فیصلہ صادر کرنے کے پیچھے تحفّظات موجُود ہیں؟ پھر ہمیں ان خطرات کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے جو اخلاقی غیر جانبداری میں مضمر ہیں۔ اسی طرح ان خطرات کا موازنہ بھی ضروری ہے جو اخلاقی خود رائی اور ذہنی تنگی سے صادر ہوتے ہیں۔

مؤرخین کی ابتدائی نسلیں فیصلے کے معاملے میں زیادہ پریشان نہ تھیں۔ یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائڈس فیصلہ صادر کرنے کے تقاضے سے حیرت انگیز حد تک آزاد تھے۔ لیکن دنیائے قدیم میں ان کے جانشینوں نے یہ فرض کر لیا کہ کسی چیز کی تعریف کرنا، سراہنا اور اس پر فیصلے صادر کرنا لازم ہے۔ لوی بار بار اپنے پڑھنے والوں کو دعوت دیتا ہے کہ تاریخ روما

سے جو اخلاقی سبق پیدا ہوتے ہیں ان پر غور کریں اور دیکھیں کہ روما کس طرح اپنی خوبیوں کی بدولت عظمت کی منزل پر پہنچا اور کس طرح ان خوبیوں کو زوال آیا تو خود روما تباہ ہو گیا۔ ٹیسی ٹس کی رائے تھی کہ تاریخ کا سب سے بڑا وظیفہ یہ ہے کہ خوبی کو فراموشگاری سے محفوظ رکھا جائے اور ہر برے عمل کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ آنے والی نسلیں اس کی مذمت کرتی رہیں۔ پلوٹارک نے کوئی ساٹھ اخلاقی مقالے لکھے یعنی مشاہیر کے سوانح کی کتاب مرتّب کی اس کے پیشِ نظر ایک اخلاقی سبق تھا اور اس میں وہ توقع سے زیادہ کامیاب ہُوا۔

قرونِ وسطیٰ

قرونِ وسطیٰ کے مؤرخین بخوبی آگاہ تھے کہ ایسے اخلاقی معیار موجود ہیں جن کی پابندی تاریخ کو کرنی چاہیے۔ وہ اس پابندی سے اختلاف کی سزاؤں کا علم بھی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک تاریخ انسانوں کے تعلق میں خدا کی رضا کے مطابق کام کرنے کی سرگزشت تھی۔ گبن، ہیوم، رابرٹسن، رولن، والٹیر، رینال اٹھارھویں صدی کے بڑے بڑے مؤرخ ہیں۔ ان سب نے بالنگ بروک کا یہ مقولہ حرفاً حرفاً قبول کر لیا کہ تاریخ فلسفہ ہے جو مثالوں کے ذریعے سے سکھایا جاتا ہے۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ تاریخ کے سبق اخلاقی ہیں اور مؤرخ کا فرض ہے کہ ان کی نشاندہی کرتا جائے۔ انیسویں صدی میں "تاریخیت" کا آغاز ہُوا ——— اس سے پیشتر بھی کچھ مثالیں میکیاولی اور ویکو کے ذریعے پیش آئی ہوں گی ——— پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا اخلاقی فیصلے صادر کرنے کے لیے کوئی جواز یا مناسبت موجود ہے۔ رانکے اور اس کے جانشین یا ہر ملک میں اس کے شاگرد، خواہ کسی ملک میں تھے، اخلاقی فیصلے ترک کرتے رہے یا وہ کہتے تھے کہ ہم نے ترک کر دیے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جو کچھ پیش آیا اسے بیان کر دیں اور اس پر کم سے کم رائے زنی کریں۔ تاہم اس رائے زنی میں نہ توثیق موجود ہو نہ تردید۔ ان کا نصب العین ایسا تھا جسے ہنری ایڈمز نے آگے چل کر فضول بنایا۔ وہ کہتا ہے کہ واقعات کے بیان میں انتہائی احتیاط سے کام لے کر اپنے آپ کو مطمئن کر لینا مشکل ہے۔ بیان میں اپنی طرف سے خفیف سی رائے زنی بھی نہ کی جائے۔ واقعات کو اس طرح ترتیب دیا جائے جو زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہو۔ پھر انسانی تحریک میں ایک لمحے کے لیے بھی تسلسل پیدا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ [1]

---

[1]: "دی ایجوکیشن آف ہنری ایڈمز" صفحہ ۳۸۲۔

ردِّ عمل

غرض اس سخت اصول سے ردِّ عمل پیدا ہونا لازم تھا اور بہت قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس پر کار بند رہ سکے۔ وکٹوریا کے عہد میں جرمنی کے اندر تاریخیت کے فاتحیت کا دروازہ کھلا۔ اخلاقیت کا دور شروع ہو گیا۔ قانون، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ، فنونِ لطیفہ اور ادبیات میں بھی اخلاق کی تبلیغ شروع ہو گئی۔ یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ انگلستان میں فروڈ، فرانس میں مشلے، جرمنی میں ٹریٹسکے یا امریکا میں موٹلے اپنے آپ کو اصلاً اخلاقیات کے رہنما یا تاریخ کے عالم سمجھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان دو کرداروں کے درمیان کوئی واضح امتیاز پیدا نہ کر سکے۔ جیمز انتھونی فروڈ نے سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی کے صدر کی حیثیت میں جو افتتاحی خطبہ دیا، اس میں وہ کہتا ہے اشیا کے دائمی حقائق ہمارے افکار و خواہشات کے باوجود قائم اور استوار ہیں، جس طرح ریاضیات آدمیوں کی فطرت میں مضمر ہے۔

امریکی جان ایل موٹلے اس مردانہ وار جد وجہد کا مؤرخ تھا جو ولندیزیوں نے ہسپانوی حکمرانوں کے خلاف چلائی اور وہ نیدرلینڈز کی متحدہ حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ دراصل کیتھولک مذہب کے خلاف پروٹسٹنٹ مذہب کی جد وجہد تھی اور اسے استبداد کے اصول کے خلاف آزادی کے اصول کا جہاد کہنا چاہیے۔ موٹلے نے ہسپانیہ کے بادشاہ فلپ دوم کے خلاف اخلاقی فیصلہ صادر کرنے میں تامّل نہ کیا۔

لیجیے وہ فیصلہ سُنیے:

"فلپ دوم

تاریخ میں چند ہی آدمی ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنی جد وجہد اور سعی و کوشش سے برائیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کر لیا جتنا حال ہی میں مرنے والے بادشاہ نے کیا۔ اگر فلپ میں کوئی بھی اچھائی تھی تو وہ پیشِ نظر صفحات کے مؤلف کی سرگرم تلاش کے باوجود ہاتھ نہ آ سکی۔ اگر اس میں ایسی برائیاں تھیں جو ممکن ہے ہوں اور جن سے وہ خالی رہا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسانی فطرت کو برائی میں بھی درجۂ کمال پر پہنچنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے مجرمانہ افعال میں تخفیف کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ ایک دل لگتی توضیح پیش کی جا سکتی ہے،

اور وہ یہ کہ یہ شخص اپنے آپ کو بادشاہ نہیں، خدا سمجھتا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر افراد سے اتنی بلندی پر بیٹھا تھا کہ اسے شاید یقین ہو گیا تھا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ذاتی جذبات کے مطابق سرگرم عمل رہنے یا دُنیا بھر پر اپنے مذہبی اور سیاسی اصُول ٹھونسنے میں اس کے اندر برابر یہ جذبہ کارفرما تھا کہ وہ خدائی رہنمائی اور آسمانی قوانین کا مجموعہ ہے۔ جب وہ کسی بادشاہ کو قتل کراتا یا پروٹسٹنٹوں کے کسی قصبے میں قتل عام کا حکم دیتا یا جب اپنی ہر قسم کو جو انسانوں کے نزدیک پابندی کی موجب ہے پامال کرتا۔ یا ان صوبوں کو اس نے ایک نسل تک آگ اور تلوار کے ذریعے سے برباد کیا جو ذاتی جائداد کے طور پر اسے میراث میں ملے تھے یا اس نے دوسرے ملکوں کی سلطنتوں میں خانہ جنگی کی آگ مشتعل رکھی جنھیں وہ اپنے قبضے میں لے آنے کا امیدوار تھا اور پوری مسیحی دُنیا پر رشوت، جاسوسی، اور فتنہ وفساد کا زبردست نظام قائم رکھا..........

وہ برابر محسوس کرتا تھا کہ یہ کمینے اور خونیں اعمال جرائم نہیں، بلکہ الوہیت کی رضا یہی ہے جس کا وہ خود ایک حصّہ تھا۔" [1]

ممکن ہے اس معاملے میں قارئین کی رائے یہ ہو کہ مصنّف ہسپانوی شاہنشاہ کی مذمّت کرتے ہوئے اصل دائرے سے تجاوز کر گیا ہے اسے رفع کرنے کے لیے موٹلے نے مؤرخ کی ذمّہ داری کے متعلق چند الفاظ کا اضافہ کیا:

"جب کوئی حقیر سا مجرم کسی عام عدالت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھانسی یا شکنجے سے محفوظ رہے۔ ہر ملک اور ہر عہد میں یہی کیفیّت رہی۔ وہ اپنے نقطۂ نگاہ سے اپنے اعمال کو مجرمانہ نہیں بلکہ لائق ستائش سمجھتا ہے بلکہ اس کے اعمال اور ان کا تسلسل اسے مخلص ثابت کرتا ہے چونکہ پادریوں کے ہاتھوں تاج پہننے والے شہنشاہ انسانی عدالتوں کے روبرو جوابدہ نہیں اور ان خوفناک سزاؤں سے دوچار نہیں ہوتے جو عام لوگوں کے لیے مقرر ہیں۔

---

[1] : "یونائیٹڈ نیدرلینڈز" جلد پنجم صفحہ ۷۴-۷۵

عوام نے ایسی زنجیریں وقتاً فوقتاً توڑ تاڑ کر پھینکی ہیں اور ان کی جگہ ظلم کرنے والوں کے لیے عدالتیں قائم کی ہیں۔ اس قسم کے ہنگاموں کو عرفِ عام میں انقلاب کہتے ہیں۔ یہ انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے بہت اہم ہے کہ تاریخ کی عدالت کے سامنے کسی آدمی کا ناجیوش ہونا اس کے لیے حفاظت کی دستاویز نہ ہو۔ تاریخ کی عدالت کے روبرو کوئی عذر پیش نہ ہونا چاہیے۔ تاریخ اسی صورت میں اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کر سکتی ہے۔

جس حد تک اس شاہی مجرم کا تعلق ہے جسے فلپ دوم کہا جاتا تھا تو اس کی زندگی بذاتِ خود استغاثہ ہے۔ اگر اب کوئی تصریح مطلوب ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ جو جلدیں لکھی گئیں وہ بالکل بے کار تھیں۔"[1]

کارلائل یا موٹلے میں اخلاقی فیصلہ ذاتی رائے کی ایک شکل ہے۔ یہ ایک اعلیٰ فرض تھا جسے ادا کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مؤرخ کے اخلاقی فیصلے کے متعلق واضح بیان خود لارڈ ایکٹن کی طرف سے دیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں لارڈ ایکٹن کو کیمبرج یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

لارڈ ایکٹن کا بیان

اپنے ابتدائی خطاب میں سامعین سے اس نے کہا، جن میں تاریخ کے تمام طلبہ شامل تھے:

"کسی بھی حالت میں اخلاقی سکّے کی قدر و قیمت نہ گھٹنا چاہیے اور راستبازی کے معیار نیچے نہ آنے چاہییں۔ ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک ہم زندہ ہیں کسی آدمی کو اجازت نہ دیں کہ وہ تاریخ کی غیر فانی سزا سے بچ نکلے جو غلطی پر دی جانی چاہیے یقیناً جرم کی تخفیف میں ہمیشہ عذر پیش ہوتے ہیں اور سزا کی کمی کے لیے برابر کوششیں جاری رہی ہیں۔ ہر قدم پر ہمارے سامنے ایسی دلیلیں پیش ہوتی ہیں جن سے جرم کے لیے عذر پیش کیا جاتا ہے

---

[1]: "یونائیٹڈ نیدرلینڈز" جلد پنجم صفحہ ۷۹۔

یا اسے گھٹایا جاتا ہے۔ حق و باطل کو مختلط کیا جاتا ہے اور انصاف پسند آدمی کا درجہ گھٹا کر نفرت کی سطح پر لایا جاتا ہے .... رائیں بدلتی ہیں۔ اوضاع میں تغیر آتا ہے۔ عقیدے ابھرتے اور گرتے ہیں لیکن اخلاقی قانون دوام کی تختیوں پر کندہ رہتا ہے۔

ایکٹن نے ان الفاظ پر اپنا خطاب ختم کیا۔

ہمیں یہ حیثیت حاصل ہے .... کہ حقیقی ریکارڈوں کے پیش نظر ماضی پر رحم کی نظر ڈالیں اور مستقبل کی طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھیں کہ صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ ہمارے دل میں یہ بات جمی رہنی چاہیے کہ اگر ہم نے تاریخ کا معیار گرا دیا تو اسے کلیسا اور سلطنت میں استوار نہ رکھ سکیں گے۔"

ہم جلد بازی سے کام لے کر ایکٹن کے فلسفے کو اس کے کیتھولک ہونے سے منسوب نہیں کر سکتے۔ وہ کچھ زیادہ پابندِ جزئیات کیتھولک نہ تھا۔ ایسے معاصر مؤرخ جیسے ویرونیکا ویج وڈ، آئزا ٹیا برلن اور آرنلڈ ٹائن بی سب کے سب یہی رائے رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ کیتھولک نہیں اور تاریخ میں اخلاقی فیصلے کو لازم سمجھتے ہیں۔ مس ویج وڈ نے ان سیاسی اور مذہبی مسائل کو روشنی میں لانے کی سرگرم کوششیں کی ہیں جو سترھویں صدی میں انگلستان کو ہنگامے پر ابھارتے رہے۔ وہ ہمیں انتباہ کرتی ہے :

مس ویج وڈ کی رائے

"مؤرخین جس افراتفری میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ ہے ہر دور کے لیے معیار قائم کرنے کی کوشش۔ ان کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ ماضی کو سمجھیں اور اس کے ساتھ انصاف کریں۔ لیکن اس کا نتیجہ بہ حیثیتِ مجموعی یہ ہو سکتا ہے کہ حال کے ساتھ بے انصافی کی جائے کیونکہ یہ نقطۂ نگاہ رفتہ رفتہ بالکل غیر محسوس طریق پر اس عقیدہ کو فروغ دے دیتا ہے کہ بجائے خود اچھائی برائی کچھ نہیں البتہ یہ دونوں چیزیں ماحول کے تعلق میں رونما ہوتی ہیں۔ یہ کسی چیز کو سمجھنے کی انتہائی آرزو رکھنا اور اسے معاف کر دینا بہت شریفانہ جذبہ ہے۔ اور

زندہ ہستیوں کے درمیان یہ ذاتی تعلق کے سلسلے میں جائز ہے لیکن (وہ کہتی ہے) تاریخی شخصیتوں کے سلسلے میں اس اصول کا اطلاق ایک جذباتی مغالطہ ہے۔" [1]

آرنلڈ ٹائن بی

آرنلڈ ٹائن بی جس نے دورِ حاضر کے تمام مؤرخوں سے بڑھ کر زیادہ تسلسل کے ساتھ آفاقی اور دائمی امور کا خیال رکھا ہے اپنے پورے ممتاز دورِ تصنیف و تالیف میں ایک مسیحی داعیٔ اخلاق کی حیثیت میں کام کرتا رہا ہے۔ جو زندہ اور مُردہ سب کے بارے میں بے تکلف فیصلے صادر کرتا رہا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اسرائیلیوں کے ہاتھوں عربوں کا فلسطین سے نکالا جانا ویسا ہی جرم ہے جیسا کہ نازیوں نے کم و بیش ساٹھ لاکھ یہودیوں کو قتل کر کے ایک بین الاقوامی نزاع کی آگ بھڑکا دی۔

یہ سب کچھ ایک اخلاقی فیصلے کے حق میں اخلاقی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اخلاقی قوانین ہمہ گیر اور دائمی ہیں۔ قتل ہمیشہ قتل ہی ہوتا ہے۔ غداری کو برابر غداری سمجھا جائے گا۔ بے رحمی اور ناروا داری کی حیثیت ہمیشہ وہی رہی ہے جو اب ہے۔ مؤرخ اخلاقی قوانین سے بالا نہیں رہ سکتا اور ان سے پہلو بچا کر بھی نہیں نکل سکتا۔ لازم ہے کہ ان کا اعتراف کرے، ان میں حصّہ لے اور ان کی بنا پر حکم صادر کرے ایسا نہ کرنا اخلاقیات کی پیروی سے انحراف ہوگا۔ یہی کیفیت تاریخ کی ہے اگر وہ فیصلے صادر نہیں کرے گی تو اپنے ہمسروں کا احترام و اعتماد کھو بیٹھے گی۔

ایک اور دلیل

تاریخ میں اخلاقی فیصلے کے متعلق ایک اور دلیل ہے جو غالباً زیادہ دل نشیں ہے۔ یہ دلیل اتنی اخلاقیات پر منحصر نہیں جتنی نفسیات پر منحصر ہے یعنی مؤرخ کسی واقعہ کا خود ذمّہ دار نہیں اسے وہ سب کچھ قبول کر لینا چاہیے جو اصل واقعے میں مضمر ہے۔ وہ بہرحال اپنے وقت، معاشرے اور عقیدے کی مخلوق ہے۔ اگر وہ عزم سے کام لے کر صریح اخلاقی فیصلے سے احتراز کرے گا تو یقیناً خفیہ فیصلے کا مجرم ہوگا۔ موضوع اور واقعات کا انتخاب بلکہ

---

[1] : "ٹرُوتھ اینڈ اوپینین" صفحہ ۴۸ - ۴۹

الفاظ بھی اس کا پردہ فاش کر دیں گے۔ پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ پیشتر ہی اعتراف کرے کہ کس درجہ انصاف پسند اور دیانتدار ہے۔ اس نکتے کی وضاحت چارلز اے بیرڈ نے کی ہے۔ ۶۵ اس نے دستورسازی کے بجائے دستور کی اقتصادی تعبیر کا عنوان پسند کیا۔ کیونکہ دستورسازی شروع ہی میں کچھ نہیں بتا سکتی کہ پڑھنے والے کو کن کن چیزوں سے سابقہ پڑے گا۔ وہ کہتا ہے:

> "تاریخ سائنس نہیں اور نہ مؤرخ سائنسدان ہے لہٰذا لازم ہے کہ وہ طبعی سائنس کے مفروضات کی غلامی چھوڑ دے اور اپنے اصل موضوع پر آجائے یعنی تاریخ بہ حیثیتِ حقیقت۔"

آئزا ئیا برلن

یہی دلیل آکسفورڈ کے ممتاز فلسفی سر آئزائیا برلن نے دی۔ اس کے نزدیک سائنٹفک غیر جانبداری کا جوشس اس گمراہ کن اور مکروہ عقیدے کے اظہار کا ایک اور کرشمہ ہے کہ تاریخ سائنس ہے۔ تاریخی معروضیت کے تصوّر سے اختلاف ویسا ہی ہے جیساکہ بین الاقوامی قانون یا بین الاقوامی اخلاقیات سے اختلاف کیا جائے اور کہا جائے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ پھر وہ انتباہ کرتا ہوا لکھتا ہے:

> "جب تک یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ تاریخ میں انسانوں سے اسی طرح برتاؤ کیا جائے گا جس طرح فضائے بسیط میں مادی اشیاء کے ساتھ کیا جاتا ہے تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔ مؤرخ کو کردار پر نظر رکھنی چاہیے اور اس کے طریقے میں وہ معیار جذب نہیں کیے جا سکتے جو ٹھوس طبعی سائنس کے لیے وضع کیے گئے۔ مؤرخین سے یہ کہنا کہ وہ اخلاقی یا نفسیاتی قدر شناسی کے اس کم سے کم درجے کو بھی نظرانداز کر دیں جو انسانوں پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے ہوئے لازم ہو جاتے ہیں کہ وہ مقاصد و محرکات کی مخلوق ہیں۔ میرے نزدیک یہ انسانی مطالعے کے مقاصد و ذرائع اور طبعی سائنس کے مقاصد و ذرائع میں خلط [illegible] کا نتیجہ ہیں۔ یہ گزشتہ سو سال کا سب سے بڑا اور سب سے بڑھ کر تباہی خیز مغالطوں میں سے ہے۔"[1]

---

[1]: "ہسٹاریکل اِنیویٹیبلٹی" صفحہ ۵۲، ۵۳

خلاف دلیلیں

لیکن اخلاقی فیصلے کے گرم جوش حامی سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکتے یا یہ مؤرخوں کی ایک پوری صف آپ کے سامنے آتی ہے جو مخالفانہ دلائل کے خوفناک اسلحہ سے مسلح ہے۔

اولاً یہ درست ہے کہ تاریخ تاریخی اعتبار سے واجب طرز عمل کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوشاں ہے لیکن یہ حقیقتہً ممکن نہیں کیونکہ ماضی اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لیے موجود ہی نہیں۔ ہم گواہ نہیں بلا سکتے کہ انھیں اپنے سامنے کھڑا کر کے سوال کریں نیز جرح کے ذریعے سے حقیقتِ حال پر پہنچ جائیں۔ ماضی قریب کے بعض معاملات پر بھی کوئی اخلاقی فیصلہ صادر کرنا ممکن نہیں مثلاً ہوور کے نظم و نسق کا معاملہ۔ یا حکومتِ وشی[1] کا طریقِ عمل۔ یا ہیروشیما[2] پر ایٹم بم کا استعمال۔ پھر یہ کس قدر مشکل ہے کہ ایلسی بیاڈیز[3] کے کردار کے متعلق فیصلہ یا سیزر کے قتل کو حق بجانب ثابت کرنا یا انگلستان پر حملہ کرنے والے نارمنوں کی روش یا ہسپانیہ کے وہ سالار جنھوں نے امریکا فتح کیا۔

ثانیاً قانون، سول سروس، یونیورسٹی اور کھیلوں میں ٹیکنیکل فیصلہ لازم ہے اس کے بغیر معاشرے کا کاروبار چل نہیں سکتا لیکن ایسے فیصلے اخلاقی نہیں محض پیشہ ورانہ ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر جو اخلاقی نظریات کی بنا پر ایک امیدوار کے درجوں کا فیصلہ کرتا ہے، ریفری جس سے اخلاقی مصلحتوں کی بنا پر کھیل کے میدان میں فیصلے صادر ہوتے ہیں، یا جج جو معاہدوں، وصیتوں، واجبات یا دیوالے کے مقدمات میں ذاتی اخلاقی معتقدات سے متاثر ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کو نااہل اور خارج کر دیے جانے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ بلاشبہ معاشرہ بعض امور میں عملی فیصلوں کے معقول معیاروں کی توقع رکھتا ہے۔ مثلاً قانون یا ضوابط کے متعلق۔

---

[1] : فرانس کا ایک شہر جہاں ۱۹۴۰ء میں فرانس کی حکومت کا مرکز بنا تھا۔ قریباً نصف فرانس پر ہٹلر کا قبضہ ہو گیا تھا اور یہ فرانسیسی حکومت ہٹلر کی مرضی کے مطابق سب کچھ کرتی تھی۔

[2] : جاپان کا مشہور شہر جس پر امریکا نے ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو پہلی مرتبہ ایٹم بم پھینکا تھا۔

[3] : ایتھنز کا مشہور سیاستدان اور جرنیل (۴۵۰ - ۴۰۴ قبل مسیح)۔

لیکن والدین، نفسیاتی معالج اور پادری خوب جانتے ہیں کہ اخلاقی فیصلے بڑے پُرپیچ مسائل پیدا کر دیتے ہیں اگرچہ متعلقہ شہادت کسی بھی درجے میں موجود ہو۔ جس حد تک تاریخ کا تعلق ہے ٦٦
گزشتہ صدیوں میں افراد و اقوام کی رائے یہ رہی ہے کہ پوری متعلقہ شہادت کبھی میسّر نہیں آتی اور فیصلے کے کوئی عالمی معیار بھی موجود نہیں۔ مؤرخ جب کوئی فیصلہ صادر کرتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے گویا اس رائے کے اظہار کے لیے مجبور ہو گیا۔ ہیروڈوٹس نے پچیس صدیاں پیشتر یہی رائے ظاہر کی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ جب دارا بادشاہت کر رہا تھا تو اس نے ایک موقع پر:

"یونانیوں کو اپنے دربار میں بلایا اور ان سے پوچھا کہ وہ اپنے باپ دادا کے مرنے پر انھیں بطورِ غذا استعمال کرنے کے لیے کیا قیمت لیں گے ...... یونانیوں نے جواب دیا کہ دنیا میں جتنا روپیہ ہے وہ سب کا سب بھی پیش کر دیا جائے تو کبھی اس چیز پر راضی نہ ہوں گے۔ پھر دارا نے کیلاٹی ہندوستانیوں کو بلایا جو باپ دادا کو کھا لیتے تھے اور یونانیوں کی موجودگی میں پوچھا کہ وہ اپنے دادا کو جلانے کے لیے کتنی قیمت قبول کریں گے (ایک ترجمان یونانیوں کو گفتگو کے مطالب سے آگاہ کرتا جاتا تھا) ہندوستانیوں میں چیخ و پکار مچ گئی اور انھوں نے بادشاہ سے التجا کی کہ اس ناقابلِ ذکر موضوع پر مزید کچھ نہ کہا جائے۔ اس کہانی سے واضح ہوتا ہے کہ عالمِ انسانیت کی عادت کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس سے "پنڈار" [1] کا یہ شاعرانہ مقولہ درست ثابت ہوتا ہے کہ رسم ہی سب پر حکومت کرتی ہے۔"

جسٹس ہومز نے یہ نکتہ زیادہ جامعیت اور ایجاز سے پیش کر دیا۔ وہ کہتا ہے میں نالی کے پانی پر شیمپین کو ترجیح دیتا ہوں لیکن یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ساری دنیا میری ہم رائے ہے۔

تاریخ کیا بتاتی ہے

تاریخ اگر کچھ بتاتی ہے تو صرف معیار، قدریں اور اصول بتاتی ہے جو عہد بہ عہد اور

---

[1] : یونانی شاعر (۵۲۲ – ۴۴۳ قبل مسیح)۔

معاشرہ بہ معاشرہ بدلتے رہے بلکہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں بھی ان کے اندر بڑی تبدیلی آتی گئی اور یہ سب کچھ ایک معاشرے میں ہوا۔ پوپوں کے انتخاب میں ان کے اعلیٰ علم اور نیک کرداروں کو خاص اہمیّت حاصل تھی اور وہ اخلاقاً ضروری سمجھتے تھے کہ مذہب کے راستے سے انحرافات کو ہر ممکن سختی سے روکیں۔ کتنی ہی بے رحمی کرنی پڑے، کریں۔ کتنی ہی اذیّت دینی ضروری ہو، دیں۔ سولھویں صدی کے یورپی لوگ امریکا کے ہندوستانیوں کو مار دینے میں کوئی درد محسوس نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں میں انسانی روح ہے ہی نہیں۔ بڑے بڑے عالم اور راست باز، پیورٹین جادوگرنیوں کو بے تکلف موت کی سزائیں دیتے رہے۔ انیسویں صدی میں امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے مسیحی غلامی کو باعثِ برکت سمجھتے تھے۔ ہیروڈوٹس ہمیں بتاتا ہے کہ یونانی اپنے باپ دادا کو کھا لینے کے تصوّر پر ہرگز پریشان نہیں ہوتے تھے اور ان کی یہی کیفیت تصوّراتِ محبت کے متعلق تھی۔ افلاطون نے اس عمل کے دفاع میں بہت کچھ کہا ہے جسے ہمارے معاصرین نہایت مکروہ قرار دیتے ہیں اور ہمارے فوجی اور کشوری اربابِ اختیار اسے روکنے میں نیندیں اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ افلاطون لکھتا ہے :-

> "میں کہہ نہیں سکتا کہ کسی نوجوان کی تقدیر میں اچھائی کا اس سے بہتر موقع کیا آ سکتا ہے کہ ایک نیک آدمی اس کا عاشق ہو اور عاشق کے لیے ایک خوبرو نوجوان سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے .... اگر کوئی ایسا ذریعہ ہو جس سے کام لے کر کوئی حکومت یا فوج صرف عاشقوں اور معشوقوں سے بنائی جائے تو اس حکومت کا انتظام تمام دوسری حکومتوں سے بہتر ہو گا۔ بشرطیکہ وہ لوگ ذلّت خیز حرکات سے احتراز کریں اور ان میں دیانت دارانہ رقابت کارفرما ہو۔ ایسے لوگ اس قسم کے دوسرے لوگوں کی معیّت میں اگر تھوڑے بھی ہوں تو دُنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔" [۱]

---

[۱] : "سمپوزیم" صفحہ ۱۷۸ -

غلامی کا مسئلہ

جو مسئلہ ایک سو سال سے امریکی مؤرخوں کے سامنے تھا اور انھیں حیران کرتا رہا، وہ غلامی کا مسئلہ تھا۔ یقیناً اگر کوئی چیز غلط ہو سکتی ہے تو وہ غلامی ہے۔ معاشرے کا کوئی دوسرا ادارہ ہمارے اخلاقی جذبات کو اس طرح مجروح نہیں کرتا جس طرح غلامی کرتی ہے۔ کوئی اجتماعی تجربہ ہم پر شرم و خجالت کا ایسا احساس طاری نہیں کرتا۔ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ غلامی، غلام اور مالک دونوں کو خراب کرتی ہے۔ اس سے سیاست میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ یہ زہر اب بھی ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن یہ اخلاق کی زبان ہے اور ہم طبعاً اور فطرۃً یہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ جب ہمیں اس عجیب و غریب ادارے پر گفتگو کرنے کا موقع ملتا ہے۔

تاہم جب غلامی پر فیصلہ صادر کرنے کی نوبت آتی ہے تو ہم ایک نہایت ٹیڑھی مصلحت سے دوچار ہوتے ہیں کہ مسیحی مردوں اور عورتوں کی خاصی بڑی تعداد نسلاً بعد نسلٍ نہ محض اسے قبول کرتی رہی بلکہ برکت کا ذریعہ سمجھتی رہی حالانکہ وہ سب اچھے انسان تھے۔ لیکن ہم کیا کہیں گے۔ جب خود اس حقیقت سے دوچار ہوں گے کہ خود ہمارے باپ دادا دو تین نسلیں پیچھے غلامی کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ اس پر خوش تھے۔ اس کی حفاظت کے لیے انھوں نے لڑنا قبول کیا اور یہ سمجھتے ہوئے اپنی جانیں دے دیں کہ وہ ایک اچھے مقصد کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہیں۔

یقیناً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام مرد و زن جو غلاموں کے مالک تھے اور انھوں نے غلامی کا نظام مدت تک قائم رکھا سب کے سب بُرے تھے۔ غلامی سے فائدہ اٹھانے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے یہ لوگ شمالی ریاستوں کے باشندوں سے اچھے یا بُرے نہ تھے جو اس عجیب و غریب ادارے کو دو نسلیں پیشتر ختم کر چکے تھے۔ وہ بھی نہ غلامی کے معتقدوں سے اچھے تھے نہ بُرے۔

غلامی کے حامیوں کی اخلاقی راستبازی یا موقوف کرنے والوں کی راستبازی کے بارے میں جو غلامی کے لیے لڑے، عملی بنیادوں پر کچھ ہی کہا جائے لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ مؤرخین کے لیے اس کے متعلق اظہارِ رائے کے سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔ غلامی کے حامیوں کے خلاف اخلاقی رائے دینا سراسر مہمل ہے۔ ایک قوم پر داغ لگانا یا اسے تاریخ میں کسی ایسے مقام پر رکھنا جہاں وہ گناہوں سے پاک ہو سکے، سراسر لغو ہے۔ لنکن بہت کچھ دیکھ چکا تھا

اور اسے اس حقیقت کا اعتراف تھا۔ اس نے اپنی دوسری افتتاحی تقریر میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا :

> "دونوں ایک بائبل پڑھتے ہیں۔ دونوں ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ ہر طبقہ خدا ہی کو ایک دوسرے کے خلاف مدد کے لیے پکارتا ہے۔ یہ عجیب معلوم ہوتا ہے کہ لوگ عادل خدا کو اس غرض سے امداد کے لیے پکاریں کہ دوسروں کے چہروں کے پسینے سے ہماری داڑھیاں بھر گئی ہیں۔ انھیں نچوڑ دیا جائے، لیکن ہمیں کوئی فیصلہ صادر نہ کرنا چاہیے تاکہ ہمارے خلاف فیصلہ صادر نہ ہو۔"

متفق علیہ نکتہ

ہم اب کثرت سے اس نکتے پر متفق ہیں کہ غلامی بہت بڑا جرم ہے لیکن ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ جن لوگوں نے غلامی میراث میں پائی، اس کی گرفت میں آگئے، اس کی حمایت کی۔ اس کے لیے لڑے، وہ بھی بُرے آدمی تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر خدا کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو ہم خود بھی غلامی کے چکر میں پڑ جاتے، اس میں بندھ جاتے، اس کے عادی ہو جاتے جس طرح ہمارے آباؤ اجداد عادی تھے۔ یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا کہ ہم بچ گئے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر سابقہ نسلوں نے جن میں شمالی اور جنوبی ریاستوں کے باشندے یکساں شامل تھے، غلامی کا بوجھ اٹھایا اور یہ جرم کیا تو ہم بھی نسلی امتیاز کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں اور اس جرم کے مرتکب ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے دونوں میں امتیاز کا کوئی پہلو نہیں۔

ظاہر ہے کہ مختلف پشتوں کے اخلاقی معیار مختلف ہوتے ہیں۔ ماضی پر اپنے اخلاقی معیاروں کو زبردستی ٹھونسنا اپنے ذہنی تحکم اور غرور کی ایک شکل ہے۔ ہم اپنے ثانوی نظام میں ماضی پر نظر تعاقب اور شہری حقوق سے محرومی وغیرہ چیزوں کو نہیں مانتے۔ ہمیں اپنے تصورات کا اطلاق ماضی پر نہ کرنا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ ماضی کے متعلق اخلاقی راستبازی کی حماقت اور غرور سے احتراز کیا جائے۔ بدرجہا بہتر یہ ہے کہ لنکن کے انتباہ کو قبول کیا جائے۔ فیصلے صادر نہ کرو کیونکہ تم پر بھی فیصلے صادر ہوں گے۔ مؤرخ کا اصل منصب فیصلے کرنا نہیں، سمجھنا ہے، فلاں واقعہ کیونکر پیش آیا۔ جو لوگ پہاڑی کے وعظ میں پیش کیے گئے۔ اصول کے لیے پابندی کا حلف اٹھائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایسے لوگوں کو کیوں آگ میں جلائے جانے کی سزائیں دلائیں،

جن کی رائے ان سے مختلف تھی ۔ یہ کیونکر ہوا کہ جو لوگ یورپی تہذیب کی توسیع کا حلف اٹھائے بیٹھے تھے وہ براعظم امریکا کے بدنصیب باشندوں کو آگ اور شمشیر کی نذر کرتے رہے ۔ یہ کیوں ہوا کہ جو مرد و زن اپنے بچوں سے انتہائی محبت رکھتے تھے اور جن کی روزانہ زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ طبعی نکوکاری اور پارسائی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھیں انھوں نے ایسے قوانین کی مخالفت سختی سے کی جن کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹے بچوں کو کارخانوں اور کانوں میں کام کرنے کے خوفناک بوجھ سے بچایا جائے ۔ یہ کیونکر ہوا کہ مسیحی مرد و زن غلامی کو برکت کا باعث سمجھتے رہے ۔ یہ کیونکر ہوا کہ جو لوگ اعلیٰ تہذیب پر فخر کرتے تھے جن لوگوں نے لائی بنِتز، کانٹ، بیتھوون، موزارٹ، گوئٹے، ہائنا، رلکے اور ٹامس مان جیسے جلیل القدر اصحاب پیدا کیے، ساٹھ لاکھ یہودیوں کے قتل کو چپ چاپ دیکھتے رہے ۔ ضرب المثل ہے کہ کسی کو معافی دینے کے لیے بھی صورتِ حال ذہن نشین کر لینی چاہیے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مؤرخ سب کچھ سمجھتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ سب کچھ معاف بھی کر دے ۔ مؤرخ کا کام یہ ہے کہ معاملے کو سمجھے لیکن یہ کام نہیں کہ وہ کسی کی مذمت کرے اور کسی کو معاف کر دے ۔ وہ خدا نہیں ۔

اخلاقی فیصلے کی تیسری دلیل

تاریخ میں اخلاقی فیصلے کے خلاف ایک تیسری دلیل بھی ہے کہ مؤرخ خدا نہیں ۔ اس کا یہ منصب نہیں کہ زندوں یا مُردوں پر فیصلے صادر کرے ۔ اس سے فیصلے کے صدور کا مطالبہ کیا ہی نہیں جاتا ۔ اگر وہ جج بن کر بیٹھتا ہے تو اپنے ذہنی اور پیشہ ورانہ نمونے کو بالکل تبدیل کر لیتا ہے ۔ اس کا کام ہے کہ معروضی تحقیقات کے لیے وقف رہے ۔ اس کے برعکس وہ استغاثے یا دفاع کے لیے وقف ہو جاتا ہے ۔ رُوسی انقلاب کے ممتاز مؤرخ ای ۔ ایچ ۔ کار نے لکھا ہے :

> "تاریخی فیصلے کے معیار قائم کرنا سراسر غیر تاریخی معاملہ ہے
> اور یہ تاریخ کے جوہر ہی کی ضد ہے ۔ مؤرخ جو سوالات اپنے
> پیشے کے اعتبار سے مسلسل کرے گا، یہ ان کا حکمانہ جواب ہے
> جو مؤرخ ان جوابات کو سوالات سے پیشتر قبول کر لیتا ہے
> وہ آنکھیں بند کر کے کام نہیں کرتا اور اپنا وظیفہ چھوڑ دیتا ہے ۔"

مؤرخ خدا نہیں وہ انسان ہے جیسے دُوسرے انسان ہیں ۔ وہ اکثر خامیوں اور نارسائیوں کا اعتراف کرتا ہے، اس پر دباؤ پڑتے ہیں اور وہ اکثر دباؤ قبول کر لیتا ہے ۔ ان ترغیبات

کا شکار ہو جاتا ہے جو ان کے ہم جنسوں کے لیے باعثِ آزار ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ وہ کسی نہ کسی فریق کا ساتھی بن جاتا ہے۔ کیا کارلائل کو کرامویل کے سلسلے میں یا موٹلے کو فلپ دوم کے سلسلے میں یا چارلز بیرڈ کو امریکی خانہ جنگی کے سلسلے میں۔ یا پیرنگٹن کو جان مارشل کے سلسلے میں قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا ہم میکالے اور ونسٹن چرچل سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ مارلبرو کے سلسلے میں غیر جانبداری سے کام لیں گے۔ کیا ہم لارڈ ایکٹن یا بینی ڈیٹو کروچے پر اس موضوع کے سلسلے میں اعتماد کر سکتے ہیں جو ان کے دلوں سے بہت قریب ہے یعنی تاریخِ آزادی۔ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ مؤرخ بھی مذہبی پیشوا، جج یا مدبّر کی طرح اپنی نسل، قومیت، مذہب، طبقے، میراث اور تعلیم کی مخلوق ہوتا ہے اور وہ ان اثرات سے کاملاً آزاد نہیں ہو سکتا جن کی آغوش میں اس کی شخصیت تعمیر ہوتی ہے اور وہ غیر جانبداری کی انتہائی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں وہ جج بنتا ہے وہاں اسے پیشہ ورانہ تربیت اور روایت کا سہارا بھی میسّر نہیں ہوتا جو لکھنے اور مرتّب کرنے میں اس کا رفیق رہتا ہے لہٰذا اس کے فیصلے بٹرفیلڈ کے تبصرے کے مطابق نیم اخلاقی فیصلے ہوتے ہیں لیکن انھیں پورے اخلاقی فیصلوں کا مستعار لباس پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ملا جلا سا معاملہ ہوتا ہے۔ جزواً تعصّب، جزواً سیاسی عداوت اور ابالنے میں اس کے اندر تھوڑا سا اخلاقی مسالہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ظاہر ہے کہ رانگے یا مومسن یا ٹائن بی پوری تاریخ پر نظر نہیں ڈال سکتے۔ لہٰذا مؤرخ کے ماضی پر چھاپے صرف وقتاً فوقتاً اور اتفاقی ہی ہوں گے۔ ماضی کو ازسرِ نو مرتّب کرنے کی غرض سے یہ کوئی مہلک رکاوٹ نہیں۔ دوسرے لوگ خلا پُر کر دیں گے لیکن اخلاقی ضابطہ تیار کرنے اور اس سے منطقی طریق پر غیر جانبدارانہ کام لینے کا معاملہ واقعی مہلک رکاوٹ ہے۔

غرض ہم مؤرخوں کی دریافتیں حقائق کے معاملے میں قبول کر سکتے ہیں۔ البتہ ہمیں اپنی رائے پر آگے چل کر نظرِ ثانی کا حق حاصل رہنا چاہیے لیکن اخلاقی معاملات میں اس کے نتائج کو کیوں قبول کریں؟ آلیور کرامویل نے کلیسائے سکاٹ لینڈ کو ایک خط لکھا تھا جس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی آنتوں کا حلف دیتے ہوئے کہا کہ غور کرو شاید تم سے غلطی ہو گئی ہو۔ افسوس مؤرخ اکثر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ صدیوں سے وہ فیصلے صادر کرتے رہے ہیں جو مدبّروں، سالاروں اور مذہبی پیشواؤں کے رنگ آمیز فیصلوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کیتھولک مؤرخ برابر ان پروٹسٹنٹوں کی اذیّت کے درپے رہے جو ان کے نزدیک مذہب سے خارج تھے اور پروٹسٹنٹ مؤرخ کیتھولکوں کے ظلم و جور کو اطمینان سے بیٹھے دیکھتے رہے۔ قومی مؤرخوں نے بلا استثنا اپنی قوم کی روش کو ہر حال میں حق بجانب ثابت کیا ہے، اور

اس کے دفاع میں پورا زور لگایا ہے۔ اسی طرح دوسری قوموں کے خلاف فیصلہ صادر کیا ہے گویا وہ دشمن تھیں۔ مزید برآں انھوں نے خود ہی جارحانہ قومیت، سامراج اور عسکریت کے لیے دلیلیں مہیا کر دیں۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے دور میں مؤرخ کی سب سے بڑی پیشہ ورانہ مشغولیت صرف نظر ثانی رہ گئی ہے۔

مؤرخ کے لیے کوئی خاص استثنا نہیں۔ جو تاثرات یا عزائم یا خام خیالیاں یا خوف عام انسانوں کے لیے باعثِ آزار ہیں، ان سے مؤرخ بھی محفوظ نہیں۔ جب وہ پیشہ ورانہ لباس پہنتا ہے تو خاصا ذی اثر اور بعض اوقات عظیم القدر شخصیت بن جاتا ہے۔ جب وہ اخلاقی جج کا لباس پہنتا ہے تو اس طرح برہنہ رہ جاتا ہے۔ جس طرح ہینز اینڈرسن کی کہانی کا شہنشاہ۔

چوتھی مصلحت

اب ہم چوتھی مصلحت پر پہنچتے ہیں جو فلسفیانہ ہونے کے بجائے عملی ہے یعنی تاریخ میں اخلاقی فیصلے کا بے سود ہونا۔ جو لوگ مؤرخ کے لیے جج بننے پر اصرار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسے مجلسِ تعزیر کی مذمت کرنی چاہیے اور رواداری کے فروغ پر زور دینا چاہیے۔ اس کا فرض ہے کہ غلامی کا ماتم کرے، آزادی کے جشن منائے، ہٹلر اور نازیوں کی نسل کشی کو درخورِ لعنت قرار دے اور قوائے آزادی کی فاتحیت پر خوشیاں منائے۔ سوال یہ ہے کہ مؤرخ ان چیزوں کی مذمت اور ستائش کیوں کرے۔ اس توقع کی تہ میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ خود کتاب خواں کا دماغ رائے سے محروم ہے، اس کا اپنا کوئی اخلاقی معیار نہیں، وہ خود فیصلے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، غلامی اور آزادی کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا، تعزیر اور رواداری میں اس کے نزدیک کوئی فرق نہیں بلکہ ان تمام کاموں کے سلسلے میں وہ مؤرخ پر انحصار رکھتا ہے۔ جو لوگ تاریخ کی سنجیدہ کتابیں پڑھتے ہیں، کیا وہ اتنے کند اور غبی ہوتے ہیں کہ جو حقائق ان کے سامنے آتے ہیں ان سے نتائج اخذ نہیں کر سکتے۔ کیا ایسا کوئی خطرہ موجود ہے کہ طلبہ غلامی کی تمنائیں کریں گے یا مجلسِ تعزیر پر خوشیاں منائیں گے یا اگر مؤرخ نے انھیں سیدھے راستے پر نہ لگا دیا تو وہ فلپ دوم اور ایڈالف ہٹلر کی مدح وستائش شروع کر دیں گے۔ اگر تاریخ پڑھنے والا یہ بھی نہیں جانتا کہ ہٹلر اخلاقی اعتبار سے بدفطرت تھا اور ساٹھ لاکھ یہودیوں کا قتل بہت بڑا اخلاقی جرم تھا تو یقین رکھیے کہ مؤرخ کا کوئی قول اسے راہِ راست پر نہ لا سکے گا۔ اگر وہ نہیں جانتا کہ غلامی نہ محض غلام بلکہ آقا کو بھی خراب کر دیتی ہے تو مؤرخ کے کچھ کہنے سے اس کے دل میں کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی۔ اگر مؤرخ مسلسل جج کا کردار اختیار کرتا ہے تو کیا یہ خطرہ نہیں کہ قارئین میں ان فیصلوں کے خلاف رائے پیدا ہو جائے گی یعنی اگر مؤرخ پڑھنے والوں کو اخلاقی اعتبار سے

نالائق سمجھا جائے گا تو وہ تاریخ سے برگشتہ ہو کر ادب کی زیادہ پختہ شکل پر متوجہ ہو جائیں گے۔

ایک اور نکتہ

ایک اور امر بھی غور طلب ہے جسے ایک عذر کی حیثیت میں پیش کرنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ فیصلے کے مسئلے کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ کتاب پڑھنے والا کوئی شخص تاریخ کے مختلف ابواب پر غور و فکر کے لیے تیاری کے بغیر نہیں آتا۔ جو تعلیم وہ حاصل کر چکتا ہے اس کی معاون ہوتی ہے۔ اس کا اپنا اخلاقی زاویۂ نگاہ اور فلسفیانہ تصوّر ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ کوئی خوانندۂ تاریخ کسی اہم باب تک اپنا مطالعہ محدود نہیں رکھتا۔ ہمیں یقین ہے کہ مؤرخین ماضی کے متعلق اپنی تعبیرات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے اور قارئین ان اختلافات سے آگاہی حاصل کر چکے ہوں گے۔ یوں غلطیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔ غلط رائیں درست کر لی جائیں گی۔ جو مؤرخ آئرلینڈ میں انگلستان کی پالیسی کو درست سمجھتا ہے اس کے خلاف کوئی نہ کوئی اس رائے کی مذمّت اور پردہ کشائی بھی کر دے گا۔ جو مؤرخین غلامی کا نقشہ زریں حروف میں کھینچتے ہیں وہاں ایسے مؤرخ بھی مل جائیں گے جن کے نزدیک غلامی، ظلم اور تاریکی کا نتیجہ تھی۔ جو مؤرخ پہلی عالمی جنگ کی ذمہ داری جرمنوں پر عائد کر دیتے ہیں ان کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی ایسا بھی نکل آئے گا جو کہے گا کہ جنگ کے اصل ذمہ دار روسی یا فرانسیسی تھے۔ مؤرخ کو چاہیے کہ وہ حلیمی اور مسکینی سیکھے۔ کتاب پڑھنے والا صرف اسی کی کتاب تک محدود نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اخلاقی تعلیم میں بھی اس پر انحصار کی کوئی وجہ نہیں۔

اٹلی کے مشہور فلسفی مؤرخ بنی ڈیٹو کروچے کا مطلب یہی تھا جب اس نے لکھا تھا:

> "جو لوگ تاریخ بیان کرتے کرتے جج بن جاتے ہیں، کسی کی مذمّت کر ڈالتے ہیں، کسی کو جرم سے پاک قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ کا وظیفہ یہی ہے۔ انھیں عموماً تاریخی حس سے محروم سمجھا جاتا ہے۔"

فیصلوں میں امتیاز

یہاں ایک امر کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اخلاقی فیصلے اور پیشہ ورانہ فیصلے میں امتیاز قائم رکھنا چاہیے۔ جس حد تک پیشہ ورانہ صلاحیت کا تعلق ہے کتاب کا مطالعہ کرنے والے کا ذمہ وہی ہے جو جج، استاد، طبیب اور معمار کا ہے۔ جج مقدمے کا فیصلہ صادر کرتا ہے، استاد طلبہ کو درجے دیتا ہے، طبیب بیماری کی تشخیص کرتا ہے، معمار کسی عمارت کو رد کرتا ہے۔ یہ لوگ اخلاقی رائیں نہیں دیتے بلکہ پیشہ ورانہ فیصلے صادر کرتے ہیں۔ اسی طرح مؤرخ بڑی محنت اٹھا کر مہیا شہادتوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ پھر اس تمام مواد کو الگ کر

دیتا ہے جس سے اس کے نقطۂ نگاہ پر اثر پڑ سکتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ لی نے اپومٹکس کے مقام پر لڑنے کے بجائے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کا یہ فیصلہ درست تھا۔ کہتا ہے کہ روز ویلٹ پرل ہاربر پر حملے کا ذمہ دار نہ تھا اور جنگ کریمیا کے سلسلے میں مجرمانہ حماقت سے کام لیا گیا یا ۱۹۱۴ء میں بلجیم کی غیر جانبداری کو توڑنا اوّل درجے کی غلطی تھی یا اطالوی ریاستوں کو متحد کرنے کا کام گیری بالڈی نے نہیں کاوور[1] نے انجام دیا۔ یا "ہیملٹ" بیکن نے نہیں شیکسپیر نے لکھا اور کینسنگٹن میں جو پتھر ہے وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس پر جو کتبہ ہے وہ ٹھیک نہیں۔ یا صیہون کے پروٹوکال جعلی تھے۔ جو مؤرخ یہ فیصلے صادر کرتا ہے وہ اس کے پیشہ ورانہ فرض ہیں۔ ممکن ہے اس کا فیصلہ غلط ہو لیکن اسی طرح جج یا استاد یا طبیب کا فیصلہ بھی غلط ہو سکتا ہے۔ یہ خطرہ معاشرے کو قبول ہی کرنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے مؤرخ کے فیصلے میں اخلاقیات کی جھلک زیادہ ہو۔ اس جھلک کو باہر رکھنا مشکل ہے۔ ہم نے ایسی چیزوں کو الگ رکھنا سیکھ لیا ہے۔ اگر کارلائل یا موٹلے ہمارے سامنے اخلاقی قوانین پیش کریں اور اس پر غصہ آئے تو اسی طرح اس امر پر بھی غصہ آ سکتا ہے کہ کوئی فاضل محقق کسی موضوع کے متعلق تمام ضروری معلومات از اوّل تا آخر پھیلا دے لیکن انسان ان سے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

---

[1] : اطالوی مدبّر (۱۸۱۰ – ۱۸۶۱ء) جس نے خاص محنت سے اطالوی ریاستوں کو متحد کر کے ایک ملک بنایا۔

نواں باب

تاریخ بہ حیثیتِ فلسفہ و قانون

تاریخ کا فائدہ

۷۲ ہم سب اس نوجوان سے آگاہ ہیں جو جوش و غرور کے ملے جلے جذبات سے ہمیں یقین دلاتا ہے کہ میں نے ہمیشہ تاریخ سے نفرت کی ہے۔ یہ کیا ہے تاریخیں ہی تاریخیں ہیں یا تھکا دینے والا مسائل کا یہ پشتارہ ہے۔ مثلاً زوالِ روما کا مسئلہ، انقلابِ فرانس کا مسئلہ، امریکی ریاستوں کی علیحدگی اور خانہ جنگی کا مسئلہ۔ اور تاریخ ہمیں کسی بھی منزل پر نہیں پہنچاتی۔ اس کا مطالعہ ختم کرتے وقت آپ کی حالت اس سے ہرگز بہتر نہ تھی جب آپ نے اسے شروع کیا تھا۔

اس قسم کی روش کو پورے وثوق کے ساتھ اساتذہ کے ناقص اور کوئی جذبہ پیدا نہ کرنے والے طریقِ تعلیم سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ جس تعلیم سے متعلمین میں خاص دلچسپی پیدا نہ ہوئی اور ان کے تخیّل کو مہمیز نہ لگی، اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے۔ ایسی روش کا کچھ حصّہ یا شاید خاصا بڑا حصّہ ہماری نصابی کتابوں کا ہی نتیجہ ہے جن میں کوئی خاص جذبہ پیدا کرنے والی چیز نہیں آتی۔ بلکہ نصابی کتابوں کے مصنّف ہر شخص کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نزاعی معاملوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ڈرامائی واقعات چھوڑ دیتے ہیں۔ ان مسائل پر توجہ جماتے ہیں جو کبھی حل نہ ہوئے اور ان کا حل کسی خاص دلچسپی کا باعث بھی نہیں۔ ہمارے زمانے کے بیشتر ناول اور ڈرامے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بیان کے پھیلاؤ سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ہیرو اور بدمعاشوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے ایسی بعض چیزیں خود مطالعہ کرنے والوں سے بھی وابستہ ہوتی ہیں مثلاً ایسے لوگ بھی ہیں جن کا تخیّل ماضی کے ڈرامے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگوں کو ان میں شمار کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق ورڈز ورتھ نے کہا ہے:

"دریا کے کنارے بسنتی رنگ کا پھول تھا۔
اس شخص کے لیے وہ صرف بسنتی رنگ کا پھول تھا۔

اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔"

لیکن ان تمام توضیحات کے بعد بھی ذہین اور کشادہ دل طلبہ کی تعداد باقی رہ جاتی ہے جسے تاریخ میں ذہن کی نشوو ارتقا کا کوئی سامان نہیں ملتا۔ ممکن ہے وہ گبن کے ہمنوا ہوں جس نے تاریخ کی تعریف میں کہا ہے "انسانیت کی حماقتوں اور بدنصیبیوں کا رجسٹر" یا نپولین کے الفاظ میں "تاریخ" ایک جھوٹ ہے جس پر سب نے اتفاق کر لیا۔" یا کارلائل کے الفاظ میں "یہ کوڑے کرکٹ کا ایک ڈھیر ہے۔" بہ ایں ہمہ لوگ گبن کی ان عالیشان جلدوں کا مطالعہ ذوق و شوق سے کرتے ہیں جن میں اس نے انسان کی حماقتیں اور بدنصیبیاں لکھی ہیں یا دریافت کرتے ہیں کہ کارلائل نے کیونکر تاریخ کو زندگی اور جذبے سے لبریز قرار دیا۔ یا وہ خود نپولین کے متعلق جھوٹ کو سچ سے الگ نہیں کرتے۔

ہم اس بارے میں کیا کہیں ؟ کیا بتائیں کہ نوجوانوں کو کیوں تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے، یا ان کے بڑوں نے کیوں تاریخ کا مطالعہ کیا یا کیوں تاریخ لکھی ؟

حقیقتِ حال

یہ سوال بار بار سامنے آتا ہے کہ تاریخ کا فائدہ کیا ہے ؛ ہمیں ایک دم اعتراف کر لینا چاہیے کہ عملاً تاریخ کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں مان لینا چاہیے کہ یہ کوئی ایسی اچھائی نہیں جسے تولا یا ناپا یا گنا جا سکے۔ اس سے مسائل حل نہ ہوں گے۔ یہ ہمیں زمانۂ ماضی کی غلطیوں سے بچانے کا ذمہ نہیں اٹھا سکتی۔ قوموں کو وہ راستہ نہیں دکھا سکتی کہ جنگوں سے احتراز کی کیا صورت ہے۔ یا جنگیں کیونکر فتح کی جاتی ہیں۔ کساد بازاری یا اقبال مندی کے وسائل کی سائنٹفک توضیحات مہیا نہیں کر سکتی۔ تاریخ کے پاس ترقی کا کوئی نمایاں وسیلہ نہیں۔

لیکن ایسی باتیں بہت سی دوسری چیزوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہیں جنھیں معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور لوگ انھیں اچھا سمجھتے ہیں۔ آخر موزارٹ کے گیتوں یا رینائر کی تصویروں یا ملز کے مجسموں سے کیا فائدہ ہے ؛ میناؔ[1] کے گرجے یا شارترے[2] کی گلابی کھڑکیوں یا فلوبیرؔ[3] کے ناول یا

---

[1] : اٹلی کا ایک شہر جہاں کا گرجا مشہور ہے۔

[2] : فرانس کا شہر جو پیرس سے ۵۵ میل شمال مغرب کی طرف ہے۔ یہاں کے گرجے کی کھڑکیاں بڑی بے نظیر ہیں۔

[3] : فرانس کا ناول نگار (۱۸۲۱ — ۱۸۸۰ء)۔

ورڈز ورتھ کے سانیٹ سے کیا فائدہ ہے؟ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے دنیاداری کی بہت سی چیزیں ہیں جنھیں معاشرہ مسلّم مانتا چلا آتا ہے اور ان پر فکر و کوشش صرف کی جاتی ہیں مثلاً بیس بال کا کھیل یا گلابی باغ یا زرتار پوشاک یا پورٹ شراب کی بوتل۔

خوش نصیبی سے مہذب معاشرہ اپنے تمام افکار و مساعی انھی چیزوں کے لیے وقف نہیں کرتا جن کا کارآمد ہونا اعداد و شمار کی بنا پر واضح کیا جاسکے۔ فائدہ مندی کے بعض دوسرے معیار بھی ہیں۔ فائدہ مند کی اصطلاح کے اور معنی بھی ہیں، وہی نہیں جن کا فائدہ ریاضیات کے مطابق ثابت کیا جاسکے۔

ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ انھی معنی میں کارآمد ہے جن معنی میں موسیقی، نظم، پھول، مذہب اور فلسفہ فائدہ مند ہیں۔ تاریخ کے بغیر زندگی ایک حد تک افلاس اور لپستی کا شکار ہو جائے گی جس طرح دوسری بیان کردہ چیزوں کے بغیر۔ تاریخ کے بغیر ہم بعض ذہنی اور اخلاقی تجربوں سے محروم ہو جائیں گے۔ جن سے زندگی میں معنویت اور ذہنی ثروت پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں کہ تاریخ کے مطالعے سے ہر نسل کے بہت سے افضل قلب و دماغ تسکین پاتے رہے۔

پہلا اور سب سے بڑا فائدہ

پہلا اور یقیناً سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تاریخ انسان کے لیے خوشی کا سامان ہے اور اس سے زندگی میں نئے نئے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ہمارا نقطۂ نگاہ بے حد وسیع ہو جاتا ہے۔ ہمارے تجربے کا دائرہ بہت پھیل جاتا ہے۔ ہم ماضی میں داخل ہوتے ہیں اور ہزاروں سال کے واقعات کا نقشہ اپنے ذہنوں میں کھینچتے ہیں جو انسانیت کی مختلف نسلوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ تاریخ کے صفحات سے ہم پیری کلیز کی وہ تقریر پڑھتے ہیں جو اس نے اپنے ماتم کے موقع پر کی تھی۔ سیپیو[1] اور ہنی بال کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ جب انھوں نے اپنی فوجیں زاما[2] کے میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی کی تھیں۔ صلیبیوں

---

[1]: رومی سپہ سالار (۲۳۷ – ۱۸۳ ق م) جس نے ہنی بال کو شکست دی۔ یہ سیپیو افریقی مشہور ہے۔

[2]: ٹیونس کا ایک قدیم شہر جہاں ۲۰۲ ق م میں ہنی بال اور سیپیو کے درمیان جنگ ہوئی۔

کے ساتھ ارضِ مقدس پہنچتے ہیں۔ کولمبس کے ساتھ باب ہرکیولیز[1] سے گزرتے ہیں تاکہ نئی دنیا میں پہنچ جائیں۔ دیدرو کے ساتھ بیٹھتے ہیں جب وہ انسائیکلو پیڈیا مرتب کر رہا تھا۔ وائیمار[2] کے چھوٹے سے دربار میں شیلر اور گوئٹے کی زندگی میں شریک ہوتے ہیں۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی چراگاہوں میں وہ زبردست بحثیں سُنتے ہیں جن کی بدولت ڈگلس سینیٹ میں اور لنکن قصرِ ابیض (وائٹ ہاؤس) میں پہنچا۔ جنرل لی کے رنج و اندوہ میں حصّے دار بنتے ہیں جب اس نے شمالی ورجینیا کی فوج کی طرف سے میکلین کے کمرۂ عدالت میں ہتھیار ڈالے تھے۔ ونسٹن چرچل کے ساتھ کھڑے ہو کر باشندگانِ برطانیہ کو اپنی تاریخِ مردانگی کے بہترین دور کے لیے تیار کرتے ہیں۔ غرض تاریخ ہمارے لیے وہ تمام عناصر فراہم کرتی ہے جو ہنری جیمز کے خیال کے مطابق قلب و دماغ کی زندگی کے لیے حد درجہ ضروری تھے یعنی فکر و عمل میں گنجائی، تنوع، رفعت، زرخیزی اور ماضی کا احساس۔

تجربے کی اس بے اندازہ توسیع کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً تاریخ زندگی کے سفر میں ہمارے لیے بہت بڑے رفیق مہیا کرتی ہے۔ یہ معاملہ اتنا متعارف ہے کہ اس کی توضیح غیر ضروری ہے۔ جہاں کہیں کوئی مؤرخ یا سوانح نگار گزرا ہے اس نے ہماری رفاقت کے لیے نئی گہرائیاں اور نئے زاویہ ہائے نگاہ دے دیے ہیں۔ ہمیں صرف کتابیں اٹھانے کی ضرورت ہے اور ہم والٹیر، روسو، جانسن، باسویل، ٹامس جیفرسن، جان ایڈمز، جسٹس ہومز اور ولیم جیمز کے حلقۂ خاص میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہم ان سے زیادہ قریب و بے تکلفی کے ساتھ تعارف پیدا کر لیتے ہیں جو ان کے ہمعصروں کو میسّر نہ تھا کیونکہ ہم ان بڑے آدمیوں کے خطوط اور روزنامچے پڑھتے ہیں۔ یہ محض تاریخ ہی کی شادمانی نہیں، یہ زندگی کی ایک ناگزیر شادمانی ہے۔

تاریخ کی تیسری اور متعارف شادمانی یہ ہے کہ ہمیں حال کو ماضی سے وابستہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور یوں مقامات و وقائع میں ایک نیا زاویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میکالے نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تاریخ سے جو شادمانی حاصل ہوتی ہے وہ بعض حالتوں میں بیرونی ممالک کے سفر سے ملتی جلتی ہے۔ تاریخ پڑھنے والا معاشرے کی ایک نئی حالت سے روشناس ہوتا ہے۔ وہ

---

۱ : یہ اس آبنائے کا قدیم نام ہے، جسے بعد میں آبنائے طارق کہنے لگے۔

۲ : جرمنی کا ایک مشہور مقام۔ یہ اس امیر کی قیام گاہ تھا جس کے دربار میں گوئٹے اور شیلر نے زندگیوں کا بیشتر حصّہ گزارا اور وہیں دفن ہوئے۔

نئے فیشن دیکھتا ہے۔ اظہارِ مطالب کے نئے اسلوب سنتا ہے۔ قوانین، اخلاق اور اوضاع کے وسیع تنوع پر غور و فکر سے اس کے ذہن و قلب میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جارج میکالے ٹریویلین خود میکالے کے بھانجے کا بیٹا تھا۔ اس نے ایک نہایت تابناک ٹکڑے میں اس شادمانی کو نہایت عمدہ انداز میں تازہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"کتابوں کی طرح مقامات میں بھی ایک دلآویزی یا رفاقت کا حسن ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان میں ایک مطلق خوبی یا جمال بھی پایا جاتا ہے۔ سینٹ جان آکسفورڈ کے سامنے جو باغ ہے وہ سب کو خوبصورت نظر آتا ہے۔ لیکن تاریخ کے محب کے لیے اس بیرونی حسن میں اپنے قلب کے متعارف احساسات مل جاتے ہیں۔ یعنی یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ کالج خانہ جنگی کے زمانے میں کیسا ہوگا۔ یہ دربار کے استعمال کے لیے لے لیا گیا تھا جس کی بادشاہی کے دن گنتی کے رہ گئے تھے۔ جب انجام قریب تر آیا تو اس کالج کے چوگوشہ صحنوں اور گزرگاہوں میں مرد و زن بھر گئے تھے جو اپنے آپ کو زندگی بھر کے رنج کے لیے تیار کر رہے تھے۔ طالع آزماؤں نے اقتدار حاصل کرنے کی امید سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ دولتمند افلاس میں زندگی گزارنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے۔ جن لوگوں کو انگلستان سے محبت تھی وہ اجنبی ساحلوں کی طرف نکل جانے کے لیے سر و سامان کر رہے تھے۔ عشّاق ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ وہ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ جب مایوسی کی آخری شام آئی اور محاصرے کی توپوں نے اس منحوس خاموشی کو توڑا۔ ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر جو شمالی جانب واقع ہیں توپوں کے پیچھے وہ آدمی صف بستہ تھے جو مرقعِ حسن و جمال پر ہاتھ ڈالنے والے تھے اور انھیں امید تھی کہ اسے قوت اور نیکی میں تبدیل کر دیں گے۔ یہ فاتحین کی لعنت تھی۔ مطلب یہ نہ تھا کہ جانیں دے دیں بلکہ زندہ رہیں اور خدا پر ایمان کھو بیٹھیں۔ جب بادشاہی بحال ہوئی تو اس میں پرانی شان موجود نہ تھی۔ لیکن اتنی شان تھی جو دیکھنے والوں کے تصوّر سے زیادہ تھی اور پرانی وفاداری ان کے لیے حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ

رشوت اور خودغرضی تھی۔ جس کا نہ کوئی ملک تھا نہ بادشاہ۔ کرامویل کی جمہوری فوج کی توپوں کی آوازیں مدت ہوئی خاموش ہو چکی تھیں۔ بہ ایں ہمہ باغ کی خاموشی ایک ناقابلِ تبدیل تقدیر کی وجہ سے زیادہ خوفناک ہو گئی تھی۔ کیونکہ محاصرہ کرنے والے اور محصورین دونوں ایک دوسرے کو جلد سے جلد تباہ کر دینے پر تُلے بیٹھے تھے، اور صرف کمینوں کے لیے زندگی کی مہلت چھوڑی جا رہی تھی۔ غرض سینٹ جانز کالج محض سنگ و گچ کا انبار نہیں جسے نہایت خوش ذوقی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ بلکہ ایک نہایت موزوں اور حسرت انگیز شاہد بھی ہے جو وہ حال بتاتا ہے جو اب نظر آ رہا ہے اور ان لوگوں کا حال بھی بتاتا ہے جنھوں نے کبھی اسے دیکھا تھا۔"[1]

جس شخص نے بھی تاریخی مقامات دیکھے ہیں خواہ ان کا تعلق نئی دنیا سے ہو یا پرانی دنیا سے، جانتا ہے کہ جب ان مقامات کو تاریخ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو وہ ایسی اشیا نہیں رہتیں جو عجائب خانوں کی زینت ہوتی ہیں بلکہ ان میں زندگی اور قوت حرکت کرنے لگتی ہے۔ مثلاً فلارنس پر نظر ڈالیے اس کے اردگرد زمانۂ قدیم کی پہاڑیاں ہیں ان میں سے دریائے آرنو چمکتا دمکتا بہتا ہے۔ اس کے برج فضا کو چیر کر اوپر نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ منظر کمزور بینائی والے کے لیے بھی حد درجہ حسین ہے۔ لیکن جب ہم فلارنس کے چوکوں اور بازاروں میں زمانۂ ماضی کے مرد و زن کے گھومنے کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں سیوونرولا[2] کا منظر چشمِ تصور کے سامنے آ جاتا ہے جسے شہر کے بڑے چوک میں جلائے جانے کی سزا دی گئی تھی۔ وہاں آجکل حضرت داؤد کا زبردست مجسمہ کھڑا ہے اور برونالاسکے[3] نے ایک عظیم الشان گرجا تعمیر کر دیا۔ گبرٹی[4] نے گرجے کے کانسی کے دروازوں پر نقش و نگار کیے اور پوری عمر اسی میں گزار دی پھر جوٹو[5]

---

[1] : "اے میوز اینڈ اَدر الیسیز" صفحہ ۲۶۔

[2] : اطالوی مصلح (۱۴۵۲ – ۱۴۹۸ء) اس پر مذہب سے خارج ہونے کا فتویٰ لگا اور اسے فلارنس میں جلایا گیا۔

[3] : اطالوی فنکار (۱۳۷۷ – ۱۴۴۶ء)۔

[4] : اطالوی مجسمہ تراش (۱۳۷۸ – ۱۴۵۵ء)۔

[5] : اطالوی فنکار (۱۲۶۶ – ۱۳۳۶ء)۔

فرا فلیپو لپی[1]، رفائل[2]، لیونارڈو[3] اور مائیکل اینجلو[4] نے تصویریں تیار کیں جو اب پٹی اور اُوفیزی کے محلوں میں لٹک رہی ہیں۔ میکیاولی کرائے دار فوج کی تاریخ پر غور کر رہا تھا اور اسی دور میں اس نے اپنی مشہور کتاب "دی پرنس" (یعنی کتاب الملوک) لکھی تھی۔ گلیلیو نے یہیں اپنی ایجاد کردہ دُوربین سے نئی کائنات دیکھی تھی اور اس کے دل میں بھی ایک نئی کائنات کے دروازے کھلے تھے۔ کیا کسی شہر نے اعلیٰ درجے کے دل و دماغ والے لوگوں کی ایسی کہکشاں بھی کہیں دیکھی ہے اور اس پر فخر کیا ہے؟ کیا کوئی شہر ایسا بھی ہے جس نے پرانی یادگاروں کو ایسی فیاضی سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو اور چشم و قلب پر ایسے قیمتی نقوش چھوڑے ہوں؟

محض فلارنس، وینس یا سالٹسبرگ جیسے بڑے بڑے فن و ادب کے مرکز ہی نہیں جنھیں تاریخ کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو ان میں ایک شانِ جدّت نظر آتی ہے، معمولی قصبوں میں سے بھی اکثر ایسے ہیں جن میں تبدیلِ ہیئت کا معجزہ رونما ہوتا ہے۔ ہنری جیمز نے کہا کہ ایمرسن نے پچاس سال اپنی نوجوانی کی اس قیام گاہ میں گزار دیے جس کی دیواریں ہر آرائش سے خالی تھیں لیکن ایمرسن کو اس میں سے ماضی کی خوشبوئیں آتی تھیں۔ بالکل یہی کیفیت کنکورڈ نام چھوٹے سے گاؤں کی بھی تھی۔

جیمز نے لکھا ہے کہ ہاتھورن اس ماحول میں رہ کر جہاں سردی، تاریکی اور افسردگی تھی، اپنی کہانیوں کے لیے سرمایہ کیونکر فراہم کرتا تھا اور انھیں اس حسن و خوبی سے معرضِ بیان میں کیونکر لاتا تھا۔ ہمیں سب سے پہلا احساس اس فسانہ نگار کے لیے رحم کا پیدا ہوتا ہے جو ایسے مقام پر موضوعات کی تلاش کرتا تھا لیکن خود ہاتھورن ایک پرانی کھڑکی سے سیلم نام قصبے پر نظر ڈال لیتا تھا جو تاریخ اور روایات کا خزانہ تھا اور اسی طرح اس نے اپنی تمام تصانیف کے لیے عناصر فراہم کر لیے، مثلاً سکارلٹ لیٹر، دی ہاؤس آف سیون گیبلز اور در جنوں دوسری کتابیں جو ہمارے ادب کا قیمتی حصّہ ہیں۔

---

[1] : اطالوی مصوّر (۱۴۱۲ – ۱۴۶۹ء) اس کا بیٹا (۱۴۶۰ – ۱۵۰۴ء) بھی باپ جیسا ہی فنکار تھا۔ دونوں کا نام بھی ایک تھا۔

[2] : مشہور اطالوی مصوّر (۱۴۸۳ – ۱۵۲۰ء)۔

[3] : (۱۴۵۲ – ۱۵۱۹ء)۔

[4] : (۱۴۷۵ – ۱۵۶۴ء)۔

میساچوسیٹس کی ریاست میں سیلم کے چھوٹے سے قصبے پر غور کیجیے جو اب محض بوسٹن کے مضافات میں شامل ہے۔ یہ بجائے خود ایک خوبصورت شہر ہے۔ سمندر کے کنارے چٹانوں کے بیچ میں اس کے خوبصورت پرانے مکانات اب بھی چیسٹ نٹ اور فیڈرل نام بازاروں کے کنارے موجود ہیں۔ ہم تاریخ کی آنکھ سے اس پر نظر ڈالیں تو ایک چھوٹا سا گاؤں تصوّر میں آ جائے گا جہاں ماہی گیری کی گرم بازاری تھی اور مذہبی جھگڑے بہت ہوتے تھے۔ یاد رہے کہ راجر ولیمز نے یہیں مذہب سے انحراف کی باتوں کا وعظ کہا تھا جس کی وجہ سے اسے اس نوآبادی سے نکال دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے این ہیچنسن[1] کو نکلنا پڑا تھا۔ ہمارے سامنے وہ پہاڑی ہے جہاں پھانسی گڑی تھی اور اس کا نام ہی پھانسی کی پہاڑی پڑ گیا۔ ساتھ ہی ہمیں سیلم کی تاریک اور دہشت خیز طلسمی کہانی یاد آتی ہے جو نیتھانیل ہاتھورن کے لیے وحشت کا باعث بنی رہی۔ اس نے یہیں پرورش پائی تھی۔ اس کی روح اب بھی اس قصبے پر چھائی رہتی ہے۔ ہمارے ذہن میں وہ قصبہ تازہ ہوتا ہے جب یہاں کے ملاح کپتان جہازوں کو دنیا بھر کے سمندروں میں لے جاتے تھے اور اس کا پرچم ایک آزاد قوم کا پرچم سمجھا جاتا تھا۔ چین کا مالِ غنیمت اور وہاں کے انعامات سیلم کے ہر کمرۂ ملاقات میں درخشاں نظر آتے تھے کیونکہ صدی کے موڑ پر سیلم اٹلی کی مشہور شہری ریاستوں کی حیثیت رکھتا تھا مثلاً فلارنس، وینس اور پیسا۔ اس کے اربابِ فنِ تعمیر کو خاص شہرت حاصل تھی جنھوں نے بحری کپتانوں اور ملوک التجار کے لیے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر کیں، مثلاً سیموئیل میک اِنٹائر۔ یہاں بڑے بڑے وعظ کہنے والے گزرے ہیں مثلاً مشرقی کلیسا کا ولیم بنٹلے۔ وہ امریکا میں سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے قانون دان مستقل حیثیت کے حامل تھے۔ مثلاً سیموئیل پٹنم اور سیموئیل سیوال جو دولتِ مشترکہ کا چیف جسٹس مقرر ہو گیا تھا۔ جوزف سٹوری جو بتیس سال کی عمر میں امریکا کے سپریم کورٹ میں پہنچ گیا تھا۔ سیموئیل باؤڈچ نے لڑکپن یہاں گزارا جہاں سے جہازوں کو حرکت کرتے دیکھتا تھا۔ جب وہ ہندوستان جانے والے جہازوں کے لیے مخصوص گودیوں سے باہر نکلتے تھے۔ وہ خود آسمانی ریاضیات اور ملاحی کی کتابیں اس کتب خانے سے لے کر پڑھتا تھا جو جنگِ آزادی میں ایک انگریزی جہاز سے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ سیلم کے ایک تجارتی جہاز میں سوار ہو کر گیا اور ان تجربات کو بڑے ہو کر اپنی اس کتاب میں لکھا جو "پریکٹیکل نیوی گیٹر" کے نام سے معروف ہوئی۔ یہی کیفیت جارج کراؤن شیلڈ کی تھی، جس نے کلیوپیٹرا کی شاندار کشتی بنائی اور اس میں سوار ہو کر بحیرۂ روم میں سے گزرا۔ ٹیموتھی پکرنگ بھی

---

[1] : امریکا کی ایک آزاد خیال خاتون (۱۵۹۱ — ۱۶۴۳ء)۔

اسی قصبے کے ایک قدیم ترین مکان میں رہتا تھا، جو اب تک موجود ہے۔ وہ بڑا ہو کر ملک کا نہایت رجعت پسند مدبّر بنا۔ بنجمن ٹامسن بھی یہیں رہتا تھا جو مقدس رومی سلطنت میں کاؤنٹ رم فورڈ بن گیا۔ میونخ میں شاہانہ زندگی بسر کرتا رہا اور لندن میں رائل انسٹی ٹیوشن قائم کیا۔ ولیم پریسکاٹ لڑکپن میں یہیں کھیلا کرتا تھا جہاں ہندوستان جانے والے جہازوں اور ڈربی جانے والے جہازوں کی گودیاں ہیں۔ وہ بندرگاہ کے ٹھنڈے پانیوں میں تیرتا تھا اور ہاگ آئی لینڈ نام جزیرے پر تفریحی کھانا کھاتا تھا۔ آگے چل کر وہ میکسیکو اور پیرو کا مؤرخ بن گیا۔ پھر ایک اور نسل آئی۔ سیلم طویل دورِ زوال میں داخل ہو گیا۔ اس کی بندرگاہ گاد سے اٹ گئی۔ اس کی گودیاں بیکار ہو گئیں۔ سڑکوں کے سنگین فرش کے بیچ میں سے گھاس نکل آئی اور میک اِنٹائر نے اپنے بنائے ہوئے مکانوں پر جو روغن کیا تھا وہ اُتر گیا۔ نیتھانیل ہاتھورن نے اپنی کہانیوں میں، جوزف سٹوری اور روفس چوایٹ نے اپنے تذکروں میں، جوزف ہرج شاٹر اور ایستھر فوربیز نے اپنی تاریخی رومانوں میں یہ تمام تفصیلات لکھی ہیں جو پرانے قصبے کی روح اور حقائق کے عین مطابق ہیں۔ صرف اس لیے لکھی ہیں کہ ہم تاریخ کے صفحات پر ان چیزوں کو پھر ایک مرتبہ تصوّر میں لے آئیں۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس میں تخیّل کو خاصی زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ خواہ وہ مؤرخ کا تخیّل ہو یا تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کا۔

جارج میکالے ٹریولین لکھتا ہے، حقیقتہً" تاریخ کا براہِ راست تعلق تخیّل سے ہے۔ اس کی مثال دیتا ہوا وہ کارلائل سے ایک اقتباس پیش کرتا ہے، جو باسویل کی حیاتِ جانسن کے متعلق ایک مقالے میں موجود ہے۔

کارلائل لکھتا ہے :-

"نا ملائم اور کرخت سیموئیل (جانسن) اور نرم مزاج خوشامدی جیمز (باسویل) تھے مگر اب نہیں۔ ان کی زندگی اور پورا شخصی ماحول ہوا میں پگھل کر غائب ہو گیا۔ فلیٹ سٹریٹ [1] میں مِٹری ٹیورن [2] اب بھی موجود ہے لیکن اب خوشدلی سے پیسے ادا کرنے والے، گائے کے گوشت اور شراب کے رسیا، یا کلغی نما ٹوپی اور گول گول پیٹ والا مالک کہاں ہے؟ سرخ گالوں والی مالکہ کہاں ہے؟

---

[1] : لندن کا وہ مشہور بازار جہاں مشہور اہلِ علم رہتے تھے۔

[2] : وہ ہوٹل جس میں جانسن عموماً کھانا کھاتا تھا۔

اس کے چمکیلے کانسی کے برتن، میزیں، بھرے ہوئے الماریوں کے خانے، اس کے باورچی، بیرے، قاصد یا لڑکن کہاں ہیں؟ سب غائب ہو گئے! سب غائب ہو گئے! وہ بیرا کہاں ہے جو مسکراتا تھا تو چہرہ جھریوں سے بھر جاتا تھا۔ اور وہی جانسن اور باسویل کے لیے کھانا لاتا تھا اسے اپنا آخری بل وصول کیے ہوئے طویل مدت گزر گئی وہ اور اس کا بل سب غائب ہو گئے جیسے مرغ کی بانگ کے ساتھ بھوت غائب ہو جاتے ہیں۔ جن بوتلوں سے وہ شراب پیتے تھے ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ جن کرسیوں پر وہ بیٹھتے تھے ٹوٹ گئیں اور انھیں آگ میں جلا دیا گیا۔ جن چھریوں اور کانٹوں سے وہ کھانا کھاتے تھے وہ تمام زنگ کی نذر ہو گئیں اور مٹی میں مل گئیں۔ غرض سب کچھ غائب ہو گیا۔ مٹری ٹیورن میں سے صرف دیواریں باقی ہیں۔ لندن، انگلستان اور دنیا میں سے برہنہ دیواروں کے سوا کچھ باقی نہیں یہ بھی معرضِ زوال میں ہیں۔ البتہ رفتار ذرا دھیمی ہے۔ زندگی کا پُر اسرار دریا بڑھا چلا جا رہا ہے۔ نئی لہر آ پہنچی ہے اور کناروں سے وحشیانہ طریق پر ٹکرا رہی ہے لیکن جو لہر پہلے زور شور دکھاتی اور چکر لگاتی ہوئی چلتی تھی وہ کہاں ہے؟ وہ کہاں ہے؟

اب باسویل کی یہ کتاب، یہ تقدیر کے فرمان کی تنسیخ ہے تاکہ وقت کئی صدیوں تک ہم پر مسلّط نہ ہو سکے۔"[۱]

یہ خطرناک چیز ہے ہم جیسے ہی تاریخ میں تخیّل کا عنصر شامل کرتے ہیں تاریخ کے ریکارڈ کی دیانت معرضِ خطر میں آ جاتی ہے لیکن ہم اس عنصر کو باہر کیونکر رکھ سکتے ہیں؟ تخیّل کے بغیر تاریخ ہے کیا؟ تخیّل ہر لمحہ ہماری امداد کے لیے آتا ہے۔ یہی چیز ہے جو ہمیں تاریخ کی برہنہ ہڈیوں کو زندگی کا لباس پہنانے کی اجازت دیتی ہے۔ یہی چیز ہے جو تاریخ کے بے کیف اور غیر شخصی مواد کے بیشتر حصّے میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ اس کے ذریعے سے اعداد کا تختہ بھی رنگ اور زندگی سے معمور ہو جاتا ہے۔ امریکا کے مغربی علاقوں اور ریاستوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے اعداد و شمار دیکھے جائیں تو وہ گاڑیاں یاد آ جاتی ہیں، جن پر سامان لاد کر اور پردوں کا انتظام کر کے آباد کار نئے علاقوں کی طرف روانہ ہوتے تھے یا نہروں کے اندر چلنے والی کشتیاں استعمال کرتے تھے۔ اب ریلیں ہر طرف جاری ہیں۔ پہلے مرد و زن بچوں اور مویشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرف جاتے آتے نظر آتے تھے۔ ۷۸

---

[۱] "کریٹیکل ایسیز" صفحہ ۴ -

تخیل ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیتا ہے کہ تاریخی کتابوں میں نام اصلی لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور جو فیصلے کیے گئے وہ ویسی ہی امیدوں، خطروں، بے یقینیوں اور حوصلوں کا نتیجہ تھے جن سے ہم کام لیتے ہیں۔ لیٹیمر[1] نے جلتے وقت کام لیا تھا۔ لارڈ نیلسن نے ٹریفلگر[2] میں ویسی ہی جانکاہیاں اور شادمانیاں محسوس کی تھیں جیسے کہ ہم محسوس کرتے ہیں۔ نیز رابرٹ لی جیسے آدمی کے لیے اپنی ریاست کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کوئی علیحدگی کا مسئلہ نہ تھا بلکہ ایک ایسا روحانی اور اخلاقی بحران تھا جس سے آج بھی ہم دوچار ہوں تو مایوسی میں ڈوب جائیں گے۔ افسوس بہت سے مؤرخ ایسے ہیں جن کی حیثیت اس مذہبی واعظ کی سی ہے جس کے متعلق ایمرسن نے لکھا:

> "برف کا طوفان ہمارے گرد و پیش برف برسا رہا تھا۔ یہ حقیقی طوفان تھا۔ واعظ محض ایک خیالی پیکر تھا۔ آنکھ اس پر پڑتی تھی تو احساس ہوتا تھا کہ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ کھڑکی میں سے باہر نظر جاتی تھی تو برف دور دور تک خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ واعظ کی زندگی بے مصرف گزری تھی۔ وہ کوئی ایک لفظ نہ کہہ سکا جس سے معلوم ہو سکتا کہ وہ ہنستا رہا یا روتا رہا، شادی ہو چکی ہے یا محبت کے پھندے میں گرفتار ہے، لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں یا اسے دھوکا دیتے ہیں، یا وہ بے کیف ہو گیا ہے۔ اگر اس نے کبھی زندگی بسر کی ہوگی یا عمل پیرا رہا ہوگا تو اس سے ہماری دانش و بینش میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ اس کے پیشے کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ وہ زندگی کو حقیقت میں بدل دے لیکن یہ راز اس نے سیکھا نہ تھا........ اس آدمی نے ہل چلایا، بیج بوئے، باتیں کیں، خرید و فروخت سے کام لیا۔ کتابیں پڑھیں۔ کھانا کھایا اور شراب پی۔ اس کا سر دکھ رہا تھا، دل دھڑک رہا تھا، وہ ہنستا تھا لیکن پورے وعظ میں کوئی ایسا نشان یا سراغ نہ تھا کہ اس نے کبھی زندگی بسر کی ہے۔"[3]

ممکن ہے سمجھا جائے کہ تخیل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جیسے موسیقی کے لیے کان یعنی یا تو آپ کو موسیقی کا ذوق ہے یا نہیں ہے۔ اگر ہے تو بہت اچھا ہے اگر نہیں تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن تخیل کو بھی موسیقی یا مصوری کے ذوق کی طرح نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ تاریخی تخیل کو کیونکر نشو و نما دی جائے گی؟

---

[1]: انگریز بشپ (۱۴۹۰-۱۶؍ اکتوبر ۱۵۵۵ء) یہ ایڈورڈ ششم کے عہد میں تھا۔ لیکن اس پر مذہب کی خلاف ورزی کا مقدمہ چلا اور آگ میں جلانے کی سزا دی گئی۔

[2]: ہسپانیہ کی ایک مشہور بندرگاہ جہاں ۱۸۰۵ء میں انگریز امیر البحر نیلسن نے نپولین کے فرانسیسی بیڑے کو شکست دی اور خود بھی اس لڑائی میں مارا گیا۔

[3]: "ڈوِنیٹی سکول ایڈریس" (۱۵؍ جولائی ۱۸۳۸ء)۔

اسے ڈرامے اور شعر گوئی کے ذریعے نشوونما دی جاسکتی ہے۔ شیکسپیر نے اپنے شاندار تخیّل سے کام لے کر تاریخ میں شاندار رنگ بھر دیا۔ ونسٹن چرچل نے کہا تھا کہ میں نے انگلستان کی تاریخ شیکسپیر کے ڈراموں سے سیکھی۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ دیکھیے والٹر سکاٹ کے ناولوں میں تاریخ زندہ ہو جاتی ہے۔ پریس کاٹ، کارلائل اور ٹریویلین جیسے مؤرخوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا۔ ورڈز ورتھ نے اس کے اخلاقی سبق کس بصیرت اور دقتِ نظر سے اپنی اس نظم میں پڑھے، جس کا عنوان ہے "دی ایکسٹنکشن آف دی وینیشین ریپبلک" (جمہوریۂ وینس کا مٹنا) یا "ٹو توسیں لوورتر" یا تمہید میں۔ تخیّل کو نشوونما دینے کا ذریعہ فنون اور تعمیرات بھی ہیں۔ کوئی بھی شخص لندن کے قومی نگار خانے میں سے گزرے تو ان مردوزن کے منظر سے اس کے دل میں ایک خاص احساس پیدا ہوگا جو انگلستان کو انگلستان بنانے کے ذمہ دار تھے۔ وِلا روٹونڈا اور وِلا ملکنٹنٹا جیسے بڑے بڑے کلاسیکی قصروں میں پہنچ کر انسان پر کیسی مسرت انگیز کیفیت طاری ہوتی ہے جو وسنزا[1] سے باہر ہیں۔ جیفرسن کا مانٹی سیلو انہی نمونوں میں سے نمودار ہوتا ہے۔

تاریخ کی شادمانیاں یہاں ختم نہیں ہو جاتیں۔ درحقیقت یہ ذخیرہ لا متناہی ہے۔ ہم جانسن کا یہ فقرہ یہاں درج کر دینا نامناسب نہیں سمجھتے جو اس نے لندن کے متعلق لکھا تھا۔ یعنی جو شخص تاریخ سے تنگ آ گیا ہے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ زندگی سے تنگ آ گیا ہے۔

کیا ہم تاریخ کی شادمانیوں سے آگے بڑھ کر تاریخ کے قوانین یا فلسفۂ تاریخ پر جا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ قوانین اور فلسفے کے مطلب و مفہوم پر موقوف ہے۔

---

[1]: اٹلی کا ایک قصبہ جو وینس سے ۴۱ میل شمال مغرب میں ہے۔

دسواں باب

تاریخ اور مسئلہ اسباب

تاریخ کی نہایت مسرت انگیز شادمانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تاریخ کا جتنا مسلسل اور دلچسپی سے مطالعہ کیا جائے اس سے انسان کے قوائے فکریہ کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے۔ یہ صلاحیتیں اسباب کی تلاش سے بڑھ کر ہمہ تن کہیں صرف نہیں ہوتیں۔

خوش نصیب وہ ہے جو اشیا کے اسباب سے آگاہ ہے۔ اگر یہ درست ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ مؤرخین مسلسل شادمانی کے تعاقب میں رہتے ہیں لیکن اسے حاصل نہیں کر پاتے۔ اشیا کے اسباب کی تلاش مدت دراز سے صاحبِ فکر مؤرخوں کی سب سے بڑی مصروفیت رہی ہے۔ دورِ حاضر کا کوئی خوددار مؤرخ محض واقعات ریکارڈ کر دینے پر قانع نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں پیش آیا۔ تاریخ کے تمام مسائل میں سے اسباب کی تلاش سب سے بڑھ کر ضروری ہے۔ سب سے زیادہ مسحورکن ہے۔ ساتھ ہی سب سے بڑھ کر پریشانی بھی پیدا کرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ تاریخ نے ایسا رُخ کیوں اختیار کیا؟ چینی کیوں تہذیب میں مغرب سے آگے تھے؟ یونان میں کیوں تہذیب نے اس وقت ایسی شاندار کامیابی حاصل کی، جب یورپ بربریت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا؟ اہلِ یورپ کیوں امریکیوں سے کئی صدیاں پیشتر ترقی کر چکے تھے؛ رومی سلطنت کیوں زوال و انحطاط میں آئی؟ مسلمانوں نے کیوں یورپ کا خاصا بڑا حصہ فتح کر لیا؛ اسلامی قوت کیوں زوال پذیر ہوئی؟ وائکنگوں میں زندگی کی حیرت انگیز قوت کا راز کیا تھا، شمالی باشندے کیوں بحر و بر پر چھا گئے اور انھوں نے اپنا کلچر آئرلینڈ، فرانس اور سسلی تک پہنچا دیا، پھر دفعتہً گمنامی میں چلے گئے۔ یورپ کے شمالی ساحل کا ایک جزیرہ[1] جس پر کہر چھائی رہتی تھی، کیوں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا اور انگریزی زبان دوسری زبانوں کے برعکس لندن سے سنگاپور تک اور ٹورنٹو سے راس امید تک بولی جانے لگی۔ امریکی نوآبادیوں نے کیوں اپنے اصل وطن سے رشتہ منقطع کر لیا۔ اور وہ انقلاب میں کیوں کامیاب ہوئے؟ جنوبی ریاستوں نے کیوں

---

[1] : مراد ہے انگلستان۔

امریکی یونین سے علیحدگی اختیار کی اور ان کا انقلاب کیوں کامیاب نہ ہو سکا؟ کیا وجہ ہے کہ برطانوی امریکہ دو بڑے ملکوں میں منقسم ہوا۔ اور لاطینی امریکہ کس لیے بیس سے زیادہ ملکوں میں بٹ گیا؟ کیا وجہ ہے کہ صرف انگریزی بولنے والی قوموں میں دو پارٹیوں کا نظام رائج ہے۔ باقی ملکوں میں ایک یا متعدد پارٹیوں کا نظام پایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کی دو بڑی جنگوں کے اسباب کیا تھے؟ کمیونزم کی کامیابی اور اشاعت کے وجوہ کیا ہیں؟ اس امر کی کیا دلیل ہے کہ پہلے تحریر و نگارش کا انداز کلاسیکی سے رومانی ہوا پھر رومانی سے دورِ حاضر کا انداز وجود پذیر ہو گیا؟ مختلف دوروں میں اخلاقی معیار بدلنے کے وجوہ کیا تھے؟ مثلاً غلامی کے متعلق روش برابر بدلتی رہی۔ کم سن بچوں کی محنت مزدوری کا سلسلہ بھی برابر تبدیل ہوتا رہا اور جنسیت کے متعلق بھی روش معرضِ تغیّر میں رہی۔

دو ہزار سال سے زیادہ مدت گزر گئی ہے جب سے فلسفی اور مؤرخ ان سوالوں اور تاریخ کے ایسے ہی دوسرے سوالوں کے جواب دینے کی کوششیں کرتے رہے۔ اگرچہ صرف گزشتہ دو یا تین صدیوں سے تحقیق میں کشادہ دلی اور آزادی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ سقراط نے اپنے مکالمات میں تحقیق کی صحت پر زور دیا ہے۔

وہ کہتا ہے:

> "اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ہمیں چھان بین کرنی چاہیے تو ہماری حالت بہتر ہو جائے گی۔ ہم دل کے زیادہ قوی ہو جائیں گے اور اتنے بے بس نہیں رہیں گے۔ اگر محض خیالوں اور وسوسوں ہی میں گم رہے اور یہی سمجھتے رہے کہ جو کچھ ہم نہیں جانتے نہ اسے جان سکتے ہیں نہ جاننے کا کوئی فائدہ ہے تو یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر میں قولاً اور فعلاً اپنی انتہائی قوت کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہوں۔"

عہدِ قدیم کے بہت سے مؤرخ بیکار خیال آرائی میں مصروف رہے۔ یونان اور روم کے بڑے بڑے مؤرخوں نے شاذ ہی واقعات کے اسباب پر توجہ کی۔ ان کے لیے بس کرتا تھا کہ جو کچھ پیش آیا لازم تھا کہ پیش آتا۔ اور معاملات کی باگ ڈور دیوتاؤں یا تقدیر کے ہاتھ میں تھی۔

> "انسان جن باتوں کے منتظر تھے وہ پیش نہیں آتیں۔
> راستہ وہاں پیدا ہوتا ہے جو کسی انسان کے خیال میں بھی نہیں ہوتا۔
> لہٰذا یہ واقعہ یہاں پیش آ گیا۔"

تھیوسی ڈائڈز جیسے بڑے مؤرخ نے بھی پلیپونیسی جنگ یا ایتھنز کی شکست کے گہرے اسباب تلاش نہ کیے۔ پلوٹارک جیسے اخلاقی سبق سکھانے والے نے بھی ان اچھائیوں اور برائیوں کی اصلیت میں چھان بین نہ کی جنھیں وہ بیان کرتا ہے۔

مسیحی مؤرخ بھی چنداں محنت سے دوچار نہ ہوئے۔ تاریخ میں جو واقعات پیش آئے، خواہ وہ چڑیا تھی جو زمین پر گری یا بڑی بڑی سلطنتیں تھیں جو زوال پذیر ہوئیں۔ ان کا ایک سبب تھا یعنی یہ خدائی منصوبے کی تکمیل تھی۔ سینٹ آگسٹین نے یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے اپنی کتاب "دی سٹی آف گاڈ" میں واضح کر دیا تھا اور یہ معاملہ اسی طرح قبول کیا گیا۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کا سیدھا سادا سا نظریہ تاریخی فکر و نظر پر ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک کیونکر مسلّط رہا۔ حتیٰ کہ دورِ احیائے علوم سے گزر کر یہ دورِ اصلاحِ کلیسا میں پہنچا۔ پھر اپنی عقل و دانش تک چلا یا آیا۔ سترھویں صدی میں فرانس کے عظیم القدر مؤرخ ژاک بوسوئے[1] نے عالمی تاریخ کے لیے خطبے تیار کیے جس میں یہ دکھانا منظور تھا کہ پوری تاریخ خدا کی مشیت کے مطابق چلی اور یہی کیتھولک پوپوں کی مرضی تھی۔ عین اسی زمانے میں امریکہ کے ایڈورڈ جانسن نے جو بوسوئے کا ہمعصر تھا، خلیج میں آبادکاری کی توجیہہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا وہ عنوان ہی سے ظاہر ہے یعنی صیہون[2] کے محافظ خدا کی نیو انگلینڈ میں معجزہ نمائی۔ یا آپ یہی دیکھ لیں کہ امریکہ کے نام کی توضیح میں کتنی بڑی بحث پندرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک جاری رہی۔ نئی دنیا کے نام کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کی ابتدائی حالت کا سبب کیا تھا، اس کی اصل نسلیں کیوں پسماندہ رہ گئیں یا کیوں کوئی منظم معاشرہ یا حکومت پیدا نہ ہوئی۔ جو مؤرخ یا فلسفی اس مسئلے پر متوجہ ہوتا وہ طوفان سے ذکر شروع کرتا۔ یعنی انھوں نے فرض کر لیا تھا کہ نئی دنیا میں کوئی طوفان بعد میں آیا یا بہت سے طوفان نمودار ہوئے۔ چند اصحاب نے یہ مسلّم مان لیا تھا کہ ہر برّ اعظم میں انسانی وجود مشترک آباؤ اجداد سے پیدا ہوئے یعنی آدم و حوا سے۔

تاریخی واقعات کو، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، انھی دیوتاؤں کی ترنگ یا خدا کی مرضی سے وابستہ کر دینے کی ذہنیت بدستور جاری رہی۔ اٹھارھویں صدی میں بھی اس کے وجود کے ثبوت ملتے ہیں۔ پھر ایک اور نظریہ تاریخ کے متعلق پھیل گیا جسے دَوری نظریہ کہتے ہیں اسے نظریہ

---

[1]: (۱۶۲۷ء - ۱۷۰۴ء)۔

[2]: یہ یروشلم کا بھی ایک نام ہے، پرانے زمانے میں اس نام کا ایک قلعہ بھی تھا۔ ایک پہاڑی کا بھی نام ہے۔ بہرحال اس لفظ کا تعلق یروشلم سے ہے۔

مدّ و جزر بھی کہا جاسکتا ہے جیساکہ روما کے عروج و انحطاط یا سلطنتِ روما کے زوال و انحطاط یا ستارۂ سلطنت کے مغربی جانب یا کتابوں کے ایسے ہی دوسرے ناموں سے ظاہر ہے۔ پھر ایک غیر شخصی قانون کی سند مان لی گئی لیکن یہ قانون مذہبی نہیں، آسمانی نہیں، سیکولر تھا یعنی قانونِ قدرت، نیز خدائے قدرت۔ یہ نتیجہ تھا نظریۂ نیوٹن کے اطلاق کا انسانی اعمال پر اور اس نظریے نے تاریخ کو نہ محض سیکولر بلکہ قومی بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اب تمام مؤرخ اور فلسفی تاریخ کی توجیہات فطرت کی اصطلاحات میں کرنے لگے۔ یہ صورت کسی نہ کسی حیثیت سے ہمارے عہد تک قائم رہی۔ اٹھارھویں صدی میں قدرت اور قانونِ قدرت کا تصوّر ہمارے تصوّر سے بہت مختلف تھا۔ شروع میں سمجھا جاتا تھا کہ قدرت میں تنظیم ہے، عقلیت ہے اس پر ایک ایسے قانون کے ذریعے سے حکومت کی جاتی ہے جو خوش آہنگی سے جاری ہے اور اس کے نفاذ و اجرا میں کسی کے لیے رو رعایت نہیں گویا وہ ایک بڑی مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔ انسان بھی کائنات کا ایک جزو ہیں اور ان پر بھی اسی عالمی قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔

عجیب امر یہ ہے کہ یہ نظریہ کسی بری صورت میں جبریت کا موجب نہ سمجھا گیا۔ کیونکہ جو قوانین کائنات پر حاوی تھے وہ خوش آہنگ اور معقول تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قانون معاشرے پر بھی حاوی ہیں، حکومت پر بھی۔ ستارے بھی انھی کے تابع ہیں اور لہروں کا مدّ و جزر بھی۔ یعنی یہی قوانین انسان کی عقل اختیار کرسکتی تھی۔ اگر انسان ان فطری قوانین کے مطابق چلیں اور انھیں نظر انداز نہ کریں یا ان کی خلاف ورزی سے محترز رہیں تو جو مصیبتیں اور آفتیں اب تک انسانوں کے لیے باعثِ اذیّت بنتی رہیں وہ نابود ہو جائیں گی، اور دنیا میں امن، خوشحالی اور ترقی کا ایک خاص دور شروع ہو جائے گا جو ہزار سال تک قائم رہے گا۔

حیرت اس امر پر ہے کہ عقل پر سے اعتقاد اُٹھ گیا اور قوت پر انحصار زیادہ سختی سے قائم رہا۔ اور ہمارے زمانے تک چلا آیا۔ مونٹسک نے تاریخ میں "موسم" کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ موصوف نے یہ اصطلاح "ماحول" کے لیے استعمال کی تھی۔ اور اس زمانے سے تاریخ میں توجیہات کے لیے موسم یا ماحول یا جغرافیے کو انتہائی ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی۔ ایبی رینال نے اسی سے کام لے کر امریکہ کی پسماندگی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اس کے بعد علما اور سائنسدانوں کے ایک اور بڑے گروہ نے جس میں مختلف قسم کے لوگ شامل تھے مثلاً الیگزنڈر فان ہمبولڈ، بکل، گرین، فریڈرخ، راٹسل، فریڈرک جیکسن ٹرنر[1] اور بروکس ایڈمس شامل تھے۔ انسانوں کی تقدیروں میں ماحول اور جغرافیے

---

[1]: امریکی مؤرخ (۱۸۶۱ — ۱۹۳۲ء)۔

کے زبردست کردار کا اعتراف کیا۔ لیکن ماحول اور جغرافیہ ہی ایسی قوتیں نہ تھیں جن کی اہمیت مؤرخوں نے تسلیم کی۔ کارل مارکس[1] نے تاریخ کے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی۔ اور محض تاریخ ہی نہیں بلکہ انسانوں کی زیادہ تر سرگرمیوں اور افکار کی تعبیر اقتصادی قوتوں کی شکل میں کی۔ امیر البحر ماہن[2] کو بحری قوت سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ اسی کو تاریخ کا علمِ کل سمجھتا تھا۔ ہنری ایڈمز نے صرف قوت پر زور دیا۔ ابتدا میں صدیوں تک مذہب کی قوت کارفرما رہی۔ پھر دورِ حاضر میں کوئلے، بھاپ اور بجلی کی قوت نے اہمیت اختیار کر لی۔

ہنری ایڈمز لکھتا ہے، مؤرخوں کا کام یہ تھا کہ وہ قوت کے راستے پر گامزن ہوتے۔ خواہ یہ کہیں لے جاتی۔ وہ خود پہلے ریڈیم کی قوت پر پہنچا پھر ایٹمی قوت پر آ گیا۔ ہر ذرّے سے جو قوت پیدا ہوئی وہ اتنی زیادہ تھی کہ تاروں کی اس کائنات کے لیے سب کچھ مہیا کر سکتی تھی۔ انسان اس قوت کو دبا نہیں سکتا تھا۔ قوتوں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے اس طرح پھینکا جیسے وہ بجلی سے بھرا ہوا تار تھا۔

تاروں بھری اس کائنات میں تمام قوتیں نہ کسی سے وابستہ تھیں نہ ان کا کوئی مقصد و مدعا تھا۔ اگر تاریخ ایسی ہی قوتوں کے زیرِ نظم وضبط تھی تو ظاہر ہے کہ اسے قانون کی شکل دینے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ایڈمز بھی اسی نتیجہ پر پہنچا تھا جب اس نے کہا کہ تاریخ میں سب سے بڑا قانون قوت کا ضیاع ہے۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں ایک نئی قوت ایجاد ہوئی، انیسویں صدی میں اسے ہر اعتبار سے مکمل کر لیا گیا۔ یہ قوت زیادہ شفیق تھی۔ اس نئی فکر اور نئی قوت کا نام ترقی رکھا گیا۔ پہلے طبعی قانون کے دائرے میں بعد ازاں ارتقا کے دائرے میں۔ ٹرگو[3] نے ۱۷۵۰ء میں ایک یادگار خطبہ دیتے ہوئے اس کا ذکر کیا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا نگاروں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ کنڈورسے[4] کے عہد میں اسے سرکاری طور پر ماننے کے ممکنات پیدا ہو گئے۔ ہم سب عہدِ ترقی کے پروردہ ہیں۔ ہم سب اس قانون کے وارث ہیں۔

"تمام دوروں میں صرف ایک روز افزوں مقصد کارفرما ہے۔
انسانوں کے افکار آفتابوں کے عمل سے توسیع پاتے ہیں۔" (ٹینی سن)

اس متعارف شے پر مزید بحث غیر ضروری ہے۔

---

[1] : (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳ء)۔

[2] : امریکی امیر البحر اور مؤرخ (۱۸۴۰ - ۱۹۱۴ء)

[3] : فرانسیسی مصنف (۱۷۲۷ - ۱۷۸۵ء)۔

[4] : (۱۷۲۷ - ۱۷۸۱ء)۔

ترقی کا نظریہ محض اعتقاد کی بنا پر مان لیا گیا نہ کہ مشاہدے کی بنا پر۔ والٹیر نے اپنی کتاب میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ عقیدہ بعض اوقات تشکک کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے اپنی تصنیف ریسے لاس میں یہی کہا ہے۔ اس کے لیے کوئی تاریخی توثیق موجود نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ آیا قدیم ترین معاشروں میں واقعی نظریۂ ترقی کارفرما تھا جیسے چین، مصر اور یونان کے معاشرے تھے۔ اس کے لیے کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ تھا۔ پھر خوش نصیبی سے نظریۂ ارتقا بروئے کار آیا جو اس کے لیے زبردست سائنٹفک ثبوت مہیا کرتا تھا۔ کم از کم اصل نظریہ ہربرٹ سپنسر نے اپنے خیال کے مطابق واضح کر دیا تھا کہ نامیاتی ارتقا کے اعلیٰ قانون جو حیوانی دنیا پر حاوی ہیں انسانی دنیا کے بھی نظم و ضبط کے ذمہ دار ہیں۔ جس طرح ارتقا نے قدرت کی دنیا میں بقائے اصلح کا یقین دلا دیا تھا۔ اس بات کی بھی ضمانت دے دی تھی کہ انسان بھی درجۂ کمال کی طرف ارتقا کرے گا۔ اور اس کی خامیاں حذف ہوتی جائیں گی۔

سپنسر کہتا ہے کہ ترقی کوئی حادثہ نہیں بلکہ ایک ضرورت ہے یہ قانونِ قدرت کا ایک جزو ہے۔

سپنسر کا امریکی شاگرد جان فسک[1] کہتا ہے:

"انسان کی تخلیق وہ مقصد ہے جس کے لیے قدرت میں ابتدا ہی سے رجحان موجود تھا مقصود کسی اعلیٰ مخلوق کی تخلیق نہ تھا۔ محض یہ تھا کہ انسانیت کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا جائے یہ قدرت کے طویل اور بے کیف کام کا شاندار اتمام تھا۔"

یہ سب کچھ بڑا دلکش تھا لیکن تاریخ کی توجیہ کے نقطہ نگاہ سے کچھ زیادہ معاون نہ تھا۔ کیونکہ اگر سوال کیے جائیں کہ روم کیوں زوال پذیر ہوا؟ ہسپانوی بیڑہ کیوں تباہی سے ہم آغوش ہو گیا؟ جنوبی امریکی ریاستیں خانہ جنگی میں کیوں شکست کھا گئیں؟ تو ان کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ قانونِ ترقی کے عین مطابق تھا یا یہ قانونِ ارتقا کا ایک حصہ تھا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم جہاں آغاز میں تھے وہیں رہے۔ ترقی مسلم۔ ارتقا مسلم لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ یہ خاص معاملات میں وہی صورتِ اظہار اختیار کریں جو انھوں نے کی۔ یعنی کیا رومی سلطنت کے زوال کو ترقی سمجھا جائے۔ کیا یہ یقینی ہے کہ عملِ ارتقا سے فائدہ اٹھانا ہسپانیہ کے لیے نہیں بلکہ برطانیہ کے لیے مقدر تھا۔ نہیں۔ توجیہ کی تلاش اس آسانی سے تسکین پذیر نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم ماضی کے واقعات کی توجیہات کے خواہاں ہیں، اگر ہم مستقبل کے لیے پیش گوئیاں کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کسی واضح، پختہ اور زیادہ معیّن قانون کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ترقی کا ہوائی نظریہ یا ارتقا کا غیر شخصی اصول کارگر نہیں۔ ریاضیات، حیاتیات، کیمیا، طبیعیات ان تمام سائنسوں نے ایسے قوانین مہیا کیے، جن سے وہ سب کچھ آشکارا ہو جاتا ہے جو اب تک پردۂ راز میں تھا۔ یقیناً تاریخ کو بھی ایسے قوانین ہم

---

[1]: امریکی مصنف (۱۸۴۲ – ۱۹۰۱ء)۔

پہچاننے چاہییں جو واقعاتِ ماضی کی کلید بن سکیں اور جن سے مستقبل کے افق پر روشنی نمودار ہو جائے۔ آگسٹ کونٹ[1] نے فرانس میں یہی کہا تھا جس نے سوشل سائنسوں کی ایک منظم سکیم بنائی تھی۔ ہربرٹ سپنسر نے انگلستان میں یہی کہا تھا جس نے حیاتیات، انسانیات اور نفسیات کی بنیاد پر علم اور معاشرہ پیدا کر دیا۔ جان فسک نے امریکا میں یہی کہا جس کی کتاب "آؤٹ لائنز آف کاسمک فلاسفی" میں پورے سوشل اور فلسفیانہ افکار داخل کر دیئے تاکہ وہ قانون مل جائیں جو اخلاقی دنیا میں ضبط و نظم قائم رکھتے ہیں، اور اس کی اکثر تاریخوں سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ قوانین امریکا میں ابتدا سے کارفرما رہے تھے۔ دوسرے علوم بھی قوانین کا دم بھرتے تھے مثلاً مالتھس[2] قانون ارتقائے آبادی۔ گریشم[3] کا قانونِ اقتصادیات، فرڈی ننڈ لاسال[4] کا قانونِ اجرت۔ ہنری بکل کا قانون جغرافیہ اور یہ کائنات کا ایک شاندار اصول تھا جس میں کوئی بے قاعدگی نہ تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تاریخ کے قانون نہ ہوں۔

---

۱ : فرانسیسی فلسفی۔

۲ : (۱۷۶۶ — ۱۸۳۴ء)۔

۳ : انگریز ماہر مالیات (۱۵۱۹-۱۵۷۹ء)۔

۴ : جرمن سوشلسٹ (۱۸۲۵ — ۱۸۶۴ء)۔

گیارھواں باب

تاریخ میں قوانین

ہنری ایڈمز نے ساٹھ سال پیشتر لکھا تھا :

'پانچ میں سے چار طالب علم ایسے ہیں جو زندہ ہیں اور انھوں نے اپنے کام کے دوران میں محسوس کیا کہ وہ بڑی تعمیم کے کنارے پر کھڑے ہیں جس کے بعد تاریخ اسی طرح ایک قانون کے تابع آجائے گی، جس طرح مادی دنیا مختلف قوانین کے تابع ہے .... معلوم ہو رہا تھا کہ یہ دریافت ہسپانویوں کے قول کے مطابق ان کی دوات میں تھی۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ کتنی مرتبہ انھوں نے اپنے قلم رکھ دیے، اور سوچنے لگے کہ آخری قدم کس قدر جلد اٹھنے والا ہے۔ اچانک ایک روشنی نمودار ہو گی جو پورے انسانی علم کو نمایاں کر دے گی۔ تاریخ کے گھنے جنگل میں ایک گوشہ ایسا نمودار ہو گا جس میں ایک مدھم سی پگڈنڈی ملے گی جو ہمیں سائنس کی شاہراہ پر پہنچا دے گی۔"

افسوس کہ ایڈمز خود جس قانون پر پہنچا، اسے ناکارگی کا قانون قرار دیا جا سکتا ہے یعنی قوت کی تذلیل۔ اس نے گھنے جنگل میں سے راستہ تو کوئی ہموار نہ کیا بلکہ مزید تاریخی تحقیق و تفتیش پر ایک مستقل بند لگا دیا۔ بیس سال بعد ایڈورڈ پی چینے نے بھی وہی بات دہرائی۔ امیریکن ہسٹاریکل ایسوسی ایشن کے ۱۹۲۳ء کے اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے اس نے کہا :

" میں اس انجمن کے کسی آئندہ اجلاس کا منتظر ہوں۔ جب تاریخ کے قوانین کی تلاش ہو چکے گی اور ان کا اطلاق انجمن کے طریقِ کار کا بڑا حصہ بن جائے گا .... اس پروگرام

میں کسی خاص قابلیت والے نوجوان مفکرِ تاریخ کو نمایاں حصّہ دیا جائے گا۔ جو پیشرووں کی ابتدائی اور خام کوششوں کو الگ رکھتا ہوا رفیقوں کے اطمینان کے مطابق نئے اور دُور رس قوانینِ تاریخ وضع کردے گا۔"

افسوس انسانی امیدیں پھر ختم ہوگئیں۔ چالیس سال بعد اس تاریخی انجمن کا اجلاس ہوا تو اس کا بیشتر حصہ ٹکنیکل تاریخ کے لیے وقف رکھا گیا۔ فلسفیانہ قیاس آرائی کو پسندیدہ نہ سمجھا گیا۔

پروفیسر چینے نے خود تاریخ کے چھ قوانین وضع کیے جنھیں یہاں دُہرا دینا فائدہ مند ہوگا کیونکہ ان سے خود بخود ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے قوانین وضع کرنے میں کتنی مشکلات مضمر ہیں چنانچہ وہ درجِ ذیل ہیں :

۱ : قانونِ تسلسل
۲ : قانونِ تغیر
۳ : باہمی انحصار کا قانون
۴ : قانونِ جمہوریت
۵ : آزاد رضامندی کی ضرورت کا قانون
۶ : اخلاقی ترقی کا قانون

اب یہ کہا جاسکتا ہے جیسا کہ تاریخ کے متعلق قوانین وضع کرنے کی ہر کوشش کے متعلق کہا جائے گا کہ یا تو یہ تاریخ کے متعلق وضع نہیں کیے گئے اور ان کا تعلق عام زندگی سے ہے۔ یا یہ قوانین نہیں بلکہ محض امید و اعتقاد کا اظہار ہے۔ مثلاً چینے کے قانونِ تسلسل کو لے لیجیے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تاریخ کے واقعات کا کوئی سلسلہ مرتب کرلیا ہے، اور اس سلسلے میں ہر واقعہ دوسرے کے بعد آتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ درست ہے لیکن بے معنی ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعہ پیش آتا ہے وہ پہلے کے کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ہم دریافت کرسکتے ہیں تو یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ کولمبس کے سفر اور امریکا کی دریافت یقیناً پیشتر کے متعدد اسباب کا نتیجہ ہے جس سے ایک منطقی نمونہ سامنے آتا ہے، لیکن کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ازٹکوں اور انکاؤں کی سلطنتوں کی بربادی بھی متعارف اسباب کا نتیجہ ہے اور یہ ایسے نمونے کے مطابق ہوئی جسے میکسیکو اور پیرو کے ابتدائی باشندے منطقی سمجھتے تھے؟ کیا یہ دعویٰ درست ہوگا جو اہلِ علم جلیشیوں کی غلامی کی تاریخ امریکا میں تلاش کرتے ہیں۔

وہ ایک ایسا صاف اور منطقی نمونہ مرتب کر لیتے ہیں جس سے خیال ہوتا ہے کہ غلامی ناگزیر تھی۔ لیکن کیا کوئی ایسی منطق بھی پیش کی جاسکتی ہے جو افریقہ کے ان باشندوں کو مطمئن کر سکے جنھیں اغوا کر کے امریکا پہنچایا جاتا رہا کہ غلامی ان کے لیے ناگزیر تھی؟ اصولِ تسلسل اور سلسلۂ اسباب کے لیے ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس میں تسلسل کا صرف ایک خط اور اسباب کا صرف ایک سلسلہ فرض کر لیا گیا ہے حالانکہ یہاں ایک سو یا ایک ہزار سلسلے ہیں۔

یا چینے کے قانونِ تغیر" پر نظر ڈالیے یعنی یہ کہ تاریخ میں کسی چیز کو دوام و ثبات نہیں۔ لیکن یہ تاریخ کا قانون نہیں، یہ تو زندگی کا قانون ہے۔ چینے سے دو ہزار سال پیشتر شاعر اور داعیانِ اخلاق اس اصول کا اعلان کر چکے ہیں۔ چینے نے اسے اب تاریخ کے لیے لیا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ بعض چیزیں دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ مستقل ہوتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس بارے میں قانونِ تغیر" کچھ نہیں بتاتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا ہم تاریخ کے لیے ایک "قانون" بناتے ہوئے کہیں کہ تمام انسان فانی ہیں۔

چینے کے دوسرے قوانین کی کیا کیفیت ہے مثلاً جمہوریت، آزادی، اخلاق۔ یقیناً یہ چیزیں عہدِ وکٹوریہ کے ایک آزاد خیال آدمی کی پیدا کردہ ہیں۔ چین یا روس کے کتنے مؤرخ قانونِ جمہوریت کی تائید کریں گے۔ پھر امریکا کے کتنے حبشی قانونِ آزادی کے ہمنوا ہوں گے۔ جرمنی کے کتنے یہودی اخلاقی ترقی کے "قانون" کی توثیق کریں گے۔ یا ہیروشیما اور ڈریسڈن کے کتنے لوگ زندہ رہے جو اس قانون کو درست مانیں گے۔ ایسی ہی نمایاں اور ناقابلِ عبور مشکلات قانون سازی میں پیش آنے کی بنا پر بعض مؤرخوں نے یہ کام ہی چھوڑ دیا۔ اور اتفاق کے اصول میں پناہ گیر ہو گئے۔ یہی مشکلات سلسلۂ اسباب کا مسئلہ حل کرنے میں پیش آئیں۔

ایچ۔اے۔ایل فشر[1] نے جس کی تاریخِ یورپ کو کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب کی تمہید میں اعتراف کیا ہے:

"میں ایک ذہنی جوشش و خروش سے محروم رہا مجھ سے زیادہ دانش مند اور زیادہ پڑھے لکھے لوگوں نے تاریخ میں ایک سازش یا ایک خاص وضع کی حرکت یا پہلے سے طے شدہ نمونہ دریافت کیا۔ یہ باتیں میری نظر سے مخفی رہیں۔ مجھے صرف ایک ہنگامی حالت نظر آئی جو دوسری کے پیچھے اسی طرح

---

[1]: انگریز مؤرخ (۱۸۶۵ — ۱۹۴۰ء)۔

> چلی آرہی تھی جیسے لہر کے پیچھے لہر آتی ہے۔ صرف ایک بڑی حقیقت جس کی تعمیم نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ یگانہ حیثیت کی حامل ہے مؤرخ کے لیے صرف ایک محفوظ قاعدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے انسانی تقدیروں کی نشو و ارتقا میں ایک ہنگامی اور نادیدہ قوت کی کارفرمائی کا اعتراف کر لینا چاہیے۔"

اپنی اصل صورت میں تاریخ کے اس نظریے کی حیثیت "کلیوپیٹرا کی ناک" کی ہے۔ یہ سب سے پہلے بلیز پیسکل[1] نے بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر کلیوپیٹرا کی ناک کسی قدر چھوٹی ہوتی تو روئے زمین کی حالت آج بالکل مختلف ہوتی۔ والٹیر نے بھی یہی نظریہ اپنا لیا تھا اور یہی اس کے دوست فریڈرک اعظم کا نظریہ تھا۔ جیسے جیسے انسان سن رسیدہ ہوتا جاتا ہے یہ حقیقت زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے کہ اس بدنصیب اور بدبخت دنیا کے تین چوتھائی واقعات کعبتین یا پانسوں کا کھیل ہے۔

۸۶ آرتھر شلیسنگر جونیئر نے لکھا ہے کہ سلیقہ مندی کا جذبہ تاریخ نگاری کی پیشہ ورانہ بیماری ہے۔ یہ درست ہے اگرچہ ہمیں انصاف پسندی کی بنا پر کہہ دینا چاہیے کہ یہ ایک قسم کی تاریخی ضرورت بھی ہے۔ تنظیم ہمیشہ فکر کی اس ندی یا کردار کی برہمی میں جسے زندگی کہتے ہیں، خلل پیدا کرتی ہے۔ مثلاً ترنم کی تنظیم کو موسیقی کی شکل دے دی جاتی ہے۔ رنگ و روغن کی تنظیم مصوری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ الہامات کی تنظیم شاعری بن جاتی ہے۔ افکار تنظیم پاتے ہیں تو فلسفہ کہلاتے ہیں۔ اسی طرح حقائق کو منظم کر دیا جائے تو وہ تاریخ بن جاتی ہے۔ مان لیجیے کہ تاریخ غیر منظم کردار کا ریکارڈ ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ضرور غیر منظم انداز میں پیش کیا جائے۔ بہت بڑے جج کا نشان یہ ہے کہ متصادم شہادتوں اور دلیلوں سے وہ ایک منظم و مربوط سلسلہ پیدا کر دے۔ تاریخ حوادث، غلطیوں، حیرت انگیز اور مہمل واقعات کا ایک بے سرا مجموعہ ہے۔ اور ہمارا علم بھی اس کے متعلق یہی ہے لیکن اسے معرض بیان میں لاتے وقت ہمیں کوئی نہ کوئی نظم پیدا کر لینا چاہیے۔ ادبیات شعور کی ندی سے کام لے کر یہ ضرورت پوری کر سکتے ہیں، تاریخ ایسا نہیں کر سکتی۔

خطرہ یہ ہے کہ تاریخ کے اندر سلیقہ مندی سے کام لینے میں مؤرخ یہ اثر پیدا کرے گا (ممکن ہے وہ خود سمجھ بھی یہی رہا ہو) کہ ہر چیز ابتدا سے بالترتیب چلی آتی ہے، مثلاً جنگ

---

[1] : فرانسیسی مؤرخ (۱۶۲۳ — ۱۶۶۲ء)۔

عموماً غلطیوں اور ابتریوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مؤرخ آکر اسے بہتر صورت دے دیتا ہے۔ مثلاً وہ بتائے گا کہ جنگ کا منصوبہ کیونکر بنایا گیا تھا، کس طرح قلب نے حملہ کیا۔ پھر میسرہ آگے بڑھا۔ توپ خانہ جنگ میں شامل ہو گیا یا رسالے نے حملہ کیا۔ اور فتح حاصل ہو گئی گویا ہر چیز بڑی سلیقہ مندی سے واضح کر دی گئی۔ یا مثلاً مؤرخ کسی ڈپلومیٹک واقعے پر نظرِ بازگشت ڈالتا ہے۔ یا کسی انتخاب پر غور کرتا ہے اور اسے بڑے عمدہ انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے، جن سے اصل واقعے پر بُرا اثر پڑے۔ یوں نادیدہ واقعات، تذبذب، خوف اور انتشار کے تمام حوادث حذف ہو جاتے ہیں۔ غرض وہ حالات کو ایسے منطقی انداز میں بروئے کار لاتا ہے کہ تاریخ میں وہ طے شدہ واقعات مانے جاتے ہیں جیسے منرو کا نظریہ[1] یا کھلے دروازے کی پالیسی[2] یا ٹرومین کا چوتھا نکتہ۔ اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ تمام واقعات کس درجہ منطقی ہیں۔ پھر ہمیں معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حال ہی میں چوتھے نکتے کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حوادث کا ایک سلسلہ تھا اور کوئی سوچی سمجھی ہوئی پالیسی کے بجائے یہ معاملہ خود صدر ٹرومین کو بھی ایک خوشگوار تعجب کا واقعہ معلوم ہُوا۔

قطعاً شبہہ نہیں کہ ہمیں تاریخ کو شطرنج کا کھیل نہ سمجھ لینا چاہیے جس میں ہر چیز پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی اور طے کردہ ہوتی ہے ساتھ ہی ہمیں دوسرے سرے پر پہنچ جانے سے بھی احتراز کرنا چاہیے یعنی یہ بھی مناسب نہیں کہ ہر واقعے کو محض اتفاق کا نتیجہ سمجھا جائے دوسرے لفظوں میں ہمیں بے سلیقگی اور بے نظمی کو بھی نمایاں نہ کرنا چاہیے۔ بے نظمی بھی ایک لحاظ سے نظم ہے۔ یہ زندگی کا اصول بھی ہے اور زندگی کا قاعدہ بھی۔ پیدائش نہایت غیر منظم سلسلہ ہے لیکن ہم عدم نظم کو بھول جاتے ہیں یا فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا تو ہوتا ہے اور پیدائش پر خوشی مناتے ہیں۔ پوری زندگی بے نظمی کا سلسلہ ہے۔ ہمارا نشوونما پانا، ہمارا تعلیم حاصل کرنا، محبت میں مبتلا ہونا، کوئی ملازمت حاصل کرنا، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ ہمارے تعلقات وغیرہ۔ ہمارے معاشرے بھی بدنظمی کے پیکر ہوتے ہیں۔ شہروں میں بدنظمی موجود رہتی ہے۔ اقتصادیات میں بدنظمی پائی جاتی ہے۔ معاشروں کی سیاسیات اور مجلسی روابط میں بھی بدنظمی ہے۔ اسس

---

[1] : منرو امریکا کا صدر تھا جس نے ۱۸۲۳ء میں جنوبی امریکا کی جمہوریتوں کی آزادی تسلیم کر لی ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ آئندہ براعظم امریکا میں کسی یورپی طاقت کو استعمار کی اجازت نہ ہوگی۔

[2] : یعنی آزاد تجارت۔

بدنظمی میں نظم پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے یا تو بدنظمی میں کمی آجاتی ہے یا یہ بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت تاریخ کی ہے مؤرخ کے عقل و دانش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ماضی کی بدنظمی میں نظم پیدا کریں۔

یہاں ایک اور اطمینان افزا مصلحت سامنے آجاتی ہے یعنی اگرچہ حوادث تاریخ کی وضع یا رفتار کو عموماً بدل دیتے ہیں لیکن اس میں کوئی اصولی اور اساسی "تغیر" پیدا نہیں کرتے۔ حقیقی مؤرخ جانتا ہے کہ معاملے کی "اصلیت" کیا ہے۔ ہمیشہ حادثوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور حادثے حادثوں کو ختم کر دیتے ہیں جیسے فٹ بال کھیلنے والوں کو جو لوگ دیکھنے کے عادی ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی ایک اضطراری پکڑ پورے کھیل کا فیصلہ نہیں کرتی یا پورے موسم کے کھیلوں کا فیصلہ نہیں کرتی۔ جس شے کو ہم تاریخ میں حوادث کا نام دیتے ہیں اس کے ساتھ زیادہ اہمیت وابستہ کرنا ناپختگی بلکہ گمراہی ہے طوفانی ہوا نے ہسپانوی بیڑے کو منتشر کر دیا اور انگریزوں کو اسے تباہ کرنے میں سہولت مہیا ہو گئی۔ لیکن یہ وجہ نہ تھی جو ہسپانیہ کو تسخیرِ انگلستان میں مزاحم ہوئی۔ سپین نے کبھی انگلستان کو فتح نہ کیا، خواہ ہوا مخالف تھی یا موافق۔ اور دوسری کوئی طاقت بھی فتح نہ کر سکی۔ واشنگٹن نے ۱۷۷۶ء کے کرسمس میں اچانک دشمن کو بہ مقام ٹرنٹن[۱] شکست دے دی اور امریکی مقاصدِ آزادی بہتر ہو گئے لیکن امریکیوں کے آزادی حاصل کرنے کا سبب یہ نہ تھا۔ اگر واشنگٹن کی بے ڈھنگی امریکی فوج وہاں شکست بھی کھا جاتی ہے تو زیادہ قرینِ قیاس یہی امر ہے کہ اہلِ امریکا زود یا بدیر کامیابی حاصل کر لیتے۔ خانہ جنگی میں شمالی ریاستوں کی ایک فوج کا سپاہی انٹاٹیم[۲] پہنچا اور اتفاقیہ اسے جنرل لی کا جنگی منصوبہ مل گیا جسے اس نے میکلیلن کے پاس پہنچا دیا لیکن انٹاٹیم کی جنگ میں لی کی شکست کا سبب یہ نہ تھا اور نہ اس وجہ سے جنوبی ریاستوں نے جنگ کی بازی ہاری۔ اگر جنرل لی انٹاٹیم کی جنگ جیت جاتا تو جنوبی ریاستوں کے لیے اس حالت میں بھی کامیابی حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ صدر ولسن جمعیتِ اقوام کی تصدیق کے لیے دورے کر رہا تھا تو وہ کنزس[۳] کے ایک سٹیشن پر سخت بیمار ہو گیا اور جمعیتِ اقوام کا معاملہ ضغطے میں پڑ گیا۔ لیکن اس وجہ سے سینٹ نے جمعیت کا مسئلہ رد نہیں کیا تھا اور اس وجہ سے ری پبلکن پارٹی نے ۱۹۲۰ء میں انتخاب نہیں جیتا تھا۔ صدر ولسن کو کوئی صورت پیش آتی یا نہ آتی، ری پبلکن پارٹی کو بہرصورت کامیاب ہونا تھا۔

---

[۱] : امریکہ کا ایک قصبہ جو دریائے ڈلویئر پر واقع ہے۔

[۲] : ایک دریا جو پنسلوینیا سے نکلتا ہے اور میری لینڈ میں سے گزرتا ہوا پوٹومیک سے مل جاتا ہے۔

[۳] : امریکا کی ایک ریاست۔

تاہم بہت سے واقعات میں اور ہزاروں ان واقعات میں جو ہم پیش کر سکتے ہیں، اتفاق نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس کی وجہ سے معاملات کی صورت بدل گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں کو زندہ رہنا تھا وہ مر گئے۔ جن جنگوں کے لیے پہلے کوششیں کی جا چکی تھیں وہ دوبارہ لڑنی پڑیں جس شے کو ہم تاریخ کی رفتار کہتے ہیں وہ دھیمی پڑی یا تیز ہوئی یا عارضی طور پر اس کا رُخ بدل گیا۔

کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ اتفاقی واقعات کا بھی اندازہ پیش کیا جا سکتا ہے اور پختہ کار مؤرخ اپنی توضیحات میں اس سے کام لیتا ہے جس طرح دانشمند جرنیل اور مدبر سوچ بچار میں اس سے کام لیتے ہیں۔ ایک زلزلہ، ایک قحط، ایک نئے براعظم کی دریافت یا سونے چاندی کی کانوں کا پتا لگ جانا یا کسی وبا کا پھیلنا یا قتل کے واقعات پیش آنا ایک اعتبار سے اتفاقی ہے دوسرے اعتبار سے طبعی ہے کیونکہ ایسے واقعات ہر ملک کی تاریخ میں، ہر صدی میں پیش آتے رہے ہیں۔

غالباً تاریخ کا طالب علم جو نہایت مفید سبق سیکھ سکتا ہے یہ ہے کہ معاملات کو زیادہ سے زیادہ سادہ بنانے کی کوشش کرے بلکہ ہر معاملے میں اسباب کا تعدّد قبول کرلے۔ یا یہ فیصلہ کرلیا جائے کہ ابھی تک ہمیں پورا علم حاصل نہیں ہوا جس کی بنا پر اسباب کی تشریح کر سکے۔ ماضی کے بے سروپا مواد کی توضیح کے لیے کوئی ایک اور عموماً سادہ سا سبب تلاش کرنا ناپختگی کی دلیل ہے حالانکہ ماضی کا لچھا اس طرح الجھا ہوا ہے کہ کسی ایک دھاگے کا سرا اس میں سے مل ہی نہیں سکتا نیز یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو خطرناک ذہنی عادات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیونکہ اس سے حال کے متعلق بھی سادہ سے تصوّرات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ جو مؤرخ ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ماضی کے بڑے بڑے واقعات کی توضیح کے لیے کوئی ایک سبب قبول کر لینا چاہیے وہ ہم میں بے اعتمادی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے افراد نہایت اہم واقعات کی توضیح اتفاقی حوادث کی شکل میں کر دیتے ہیں یا یہ کہ کوئی سازش کرلی گئی تھی یا مختلف افراد کے کردار کے بارے میں کوئی سادہ سا تصوّر کرلیا جاتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک بادشاہی صرف اس لیے برباد ہوگئی کہ اسے ایک میخ کی ضرورت تھی جو بروقت مل نہ سکی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو تحریک اصلاحِ کلیسا کی بنیاد یہ بتاتے ہیں کہ لوتھر شادی کا خواہاں تھا یا کہتے ہیں کہ ہسپانیہ نے میکسیکو کو اس لیے مسخر کرلیا کہ کارٹیج کی داشتہ کی یہی خواہش تھی یا چین اس لیے ہاتھوں سے نکل گیا کہ ریاستہائے متحدہ کے محکمے میں غدّار موجود تھے۔ حکیمانہ اقوال پیش کرنے والے لوگوں کے لیے جارج ایلیٹ نے خوب لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

" جو لوگ ارادے کے مضبوط اور فہم و دانش میں وسیع النظر ہوتے ہیں انھیں حکیمانہ مقولے والے لوگوں سے وجداناً نفرت ہوتی ہے کیونکہ ایسے آدمی جانتے ہیں ہماری زندگی کے پُر اسرار

معاملات معقولوں کی بنا پر نہیں چلتے۔ اس قسم کے فارمولوں کو قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی محرکات والہامات کو دبا دیا جائے جو بصیرت اور ہمدردی کی فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ حکیمانہ معقولوں والے آدمی عموماً ایسے قلوب واذہان کے نمائندے ہوتے ہیں، جو اخلاقی فیصلے صرف عام قاعدوں کی روشنی میں صادر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح بنے بنائے طریقوں سے وہ انصاف پر پہنچ جائیں گے لیکن ان میں صبر، امتیاز اور غیر جانبداری کا جوہر نہیں ہوتا اور اس بات کا بھی خیال نہیں کرتے کہ آیا ان میں کوئی ایسی بصیرت بھی ہے جو محنت سے حاصل کردہ رغبت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے یا جو واضح روشن اور سرگرم زندگی سے حاصل کی جاتی ہے اور اس سے انسانی ہمدردی کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا ہے۔"

بارھواں باب

فلسفۂ تاریخ

ہم آخر میں فلسفۂ تاریخ پر پہنچتے ہیں۔ یہ اصطلاح خاصی مبہم ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں یا دو میں سے ایک۔ اس کا ایک مطلب وہ فلسفہ ہے جو تاریخ کا مطالعہ کرنے والا اپنے ساتھ لاتا ہے یعنی تاریخ کی ایسی تعبیر جس کے متعلق اسے اعتماد ہوتا ہے کہ تاریخ اس سے تطابق پیدا کرے گی۔ یا اس سے مراد وہ فلسفہ ہو سکتا ہے جو تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو اس سے ملتا ہے اور جس کے ساتھ وہ شاید خود تطابق پیدا کرے۔

تاریخ کے مختلف فلسفے

فلسفۂ تاریخ کی اصطلاح ایک رسمی چیز ہے اور نفرت انگیز ہے۔ یہ ہمارے لیے ان نظام سازوں کا تصوّر تازہ کرتی ہے جنھوں نے ماضی اور حال کے نظام بنائے، اور تاریخ کا مستقل فلسفہ پیدا کیا یعنی کہا کہ تاریخ کو بھی اپنے اسلحہ لے کر کمانداری کے مقام پر پہنچ جانا چاہیے۔

مثلاً:

آگسٹین جس نے ثابت کیا کہ تاریخ انسان کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق کام کرنے کا نام ہے۔ یا ہیگل جس نے تاریخ کے متعلق ایک پُراسرار تصوّر قائم کیا اور کہا کہ آزادی کی تاریخ ہمارے زمانے تک کمال پر پہنچ گئی ہے یا کنڈورسے جس نے تاریخ کے تمام قوانین کا تصوّر ایسے انداز میں کیا کہ یہ ترقی کے صف بہ صف مناظر ہیں یا کارل مارکس جس نے تاریخ کے لیے آہنی قوانین بنائے اور اسے مادی مقاصد کے لیے جدوجہد کا ریکارڈ قرار دیا۔ یا ہنری ایڈمز جس نے خواہ مخواہ تاریخ پر حرکیاتِ حرارت کا قانون چسپاں کیا۔ حالانکہ تاریخ کے مواد اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یا بینی ڈیٹو کروچے جس نے تحکمانہ اصول پیش کر دیا کہ پوری تاریخ معاصرانہ تاریخ ہے۔ لہٰذا ہر مؤرخ اسے گرفت میں لے سکتا ہے اور اس کی حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے یا آرنلڈ ٹائن بی جس کے نزدیک تہذیبی ظہور پذیر

ہوتی ہیں اور منتشر ہو جاتی ہیں۔

فلسفوں کا تعدّد

ہم تاریخ کے ان مختلف فلسفوں کو دیکھتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حد درجہ وسیع، انتہائی پُر پیچ اور ہاتھ سے نکل جانے والے موادِ تاریخ کو ایک ڈھانچے میں مرتب کرنے کی کوشش عمل میں لانا یا اسے ایک فارمولے کی شکل میں پیش کرنا بالکل فضول ہے۔ اس نتیجے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تاریخ کا معمّا حل نہیں ہو سکا بلکہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کا کوئی حل نہیں اور غالباً یہ معمّا بھی نہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہم کون ہیں جو اپنا ارادہ تاریخ پر مسلّط کر رہے ہیں؟ ہم کون ہیں جو متقاضی ہیں کہ یہ ہمارے نظریات قبول کرے، ہمارے سُروں پر ناچے اور ہمارے حکموں پر چلے؟ یقیناً ہمیں فلسفۂ تاریخ کے ریکارڈ میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ یقین کر لیں کہ ہمیں کبھی تاریخ کا ایسا مفہوم بھی مل سکے گا جس پر سب متفق ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی فلسفوں کا تعدّد اور بالغ نظر مؤرخوں میں سے اکثر کا اس کے معانی پر عدم اتفاق یہ ظاہر کرتا ہے کہ فلسفے تاریخ سے پیدا نہیں ہوئے، بلکہ حالات سے پیدا ہوئے یا تاریخی فلسفیوں کے مزاجوں اور تربیّت سے معرضِ وجود میں آئے۔

یہ سب کچھ طبعی ہے معلوم ہے کہ بڑے بڑے خدا رسیدہ لوگ ہزاروں سال سے خدا اور انسان کے روابط پر غور و فکر کر رہے ہیں لیکن وہ کسی مشترک مذہب پر نہیں پہنچ سکے۔ فلسفی اور مدبّر دو ہزار سال سے ہمارے سیاسی نظریات پر توجہ جائے ہوئے ہیں، لیکن اب تک کوئی ایک نتیجہ سامنے نہیں آیا جس پر انسانیّت کا بڑا حصّہ رضاکارانہ اتفاق کر لے۔ فلسفی اور معلّم صدیوں سے تعلیم کی نوعیت پر غور کر رہے ہیں لیکن ہم اب تک کسی ایسے فلسفۂ تعلیم پر نہیں پہنچ سکے جس پر عموماً سب کا اتفاق ہو۔ پھر ہم تاریخ کے ایسے مستند فلسفے کی کیوں توقع رکھیں جب کہ ہم مذہب، سیاسیات یا تعلیم کے مستند فلسفے مہیا نہ کر سکے۔ ۹۰

استقرائی رسائی

اگر فلسفۂ تاریخ کے لیے استخراجی رسائی ناسودمند ہے تو آئیے استقرائی رسائی کی کوشش کریں۔ جی۔ ایم ٹریویلین نے بہت صحیح کہا ہے کہ فلسفہ ایسی چیز نہیں جسے آپ تاریخ

میں لے جائیں بلکہ یہ چیز آپ کو تاریخ سے لینی چاہیے۔ اگر ہم تاریخ پر فلسفیانہ نمونے عائد نہیں کر سکتے تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا تاریخ ہم پر فلسفیانہ اسباق عائد کر سکتی ہے۔

یہ حقیقتہً ایک اسلوبِ گفتار ہے۔ تاریخ مجرداً کوئی شے نہیں جس سے سبق ترتیب پاتے ہوں اور انھیں شاگردوں پر عائد کیا جائے۔ جب ہم تاریخ کے متعلق سبق عائد کرنے کی بات کرتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے کسی باب کا طویل مطالعہ اور اس پر گہرا غور و فکر بعض نتائج سامنے لے آتا ہے جو خاص مقصد اور قدر و قیمت کے ہوتے ہیں بشرطیکہ مؤرخ قانون دان ہو یا سیاسی فلسفے کو سمجھتا ہو اور اس کی حیثیت معلّم کی ہو۔ اس قسم کے معاملات سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے پختہ نہیں سمجھے جا سکتے۔ ان کی حیثیت ایک سند کی سی ہو سکتی ہے جو مؤرخ کی شہرت اور کردار کے اعتبار سے متعیّن ہوگی۔ لیکن یہ صورتِ حال تمام غیر سائنٹفک دائروں کی ہے اگر سالہا سال اور صدیوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانا فاضل (اگرچہ وہ مختلف انجمنوں سے وابستہ ہوں) ایسے معاملات پر متفق ہوں جنھیں عمومیت کا درجہ دیا جا سکے تو کیا ہم ان کے درجہ احترام کے مطابق انھیں حق بجانب نہ سمجھیں گے۔

تاریخ سے امداد

بہر حال لوگ ماضی میں بھی غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ زمانے کی غلطیاں بھی خالی از منفعت نہیں۔ یہ والٹیر کا قول ہے۔ وہ لکھتا ہے کسی فرد کو بار بار جرموں اور تباہیوں کی یاد نہ دلانی چاہیے۔ لوگ کچھ کہیں لیکن ایسے معاملات میں قبل از وقت انسداد کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ کسی جابر کی سرگزشت ایک قوم کو نئے جابر کے حوالے تمام اختیارات کر دینے سے مانع آ سکتی ہے۔ چارلز دوازدہم[۱] نے پلٹوا میں جس طرح اپنا کاروبار برباد کیا اسے ایک نسل کے لیے انتباہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ کافی سامانِ رسد ساتھ لیے بغیر کسی کو یوکرین میں زیادہ آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وزنی شے اور ہلکی شے کو ملا دیا جائے۔ لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں اچھے دل و دماغ والے لوگ کس طرح تاریخ پر

---

۱ : ناروے کا بادشاہ — ۱۶۸۲ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۱۸ء میں مارا گیا۔ بڑا بہادر تھا اس نے روس پر حملہ کر دیا۔ پلٹوا کے مقام پر جو یوکرین میں ہے شکستِ فاش کھائی (۱۷۰۹ء) اور ترکی بھاگ گیا۔ ۱۷۱۴ء میں وطن واپس ہوا۔ پھر ایک قلعے کے محاصرے میں مارا گیا۔

متوجہ ہوئے اور کس طرح تاریخیں لکھی گئیں۔ یقیناً امریکا میں جو پادری آئے اور انھوں نے آبادیوں کی بنیاد رکھی ان کے نزدیک تاریخ کا مطالعہ فائدہ مند تھا وہ سب تاریخ سے وابستگی رکھتے تھے خصوصاً قدیم دنیا کی تاریخ سے۔ ان میں سے تقریباً ہر ایک نے تاریخ لکھی۔ زمانۂ قدیم کی تاریخ سے ایسے واقعات نکالے جو آزادی کے لیے وجہِ جواز تھے۔ اور انھیں وفاق کے راستے پر لے گئے۔ ان سے سیاسیات اور حکومت کے ہر دائرے کے لیے مثالیں ملیں۔ جس سے آزادی اور نظم میں مصالحت کے مسائل روشن ہوئے۔ ۱۷۸۷ء کے وفاقی کنونشن میں بحثیں ہوئیں۔ پھر کنونشن پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہوئے بھی بحثوں کا موقع آیا۔ وفاقی اخباروں نے مسلسل تاریخی تشریحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی طرح جان ایڈمز، میڈیسن، جیفرسن، ہملٹن اور واشنگٹن کے ذاتی خط چھاپے گئے ان سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں کو جب کسی اخلاقی ضابطے کی تشریح مقصود ہوتی تھی تو وہ تاریخ ہی سے مثالیں ڈھونڈتے تھے۔ دستور کی توثیق کے بعد بھی تاریخ کے مآخذ مثالوں سے خالی نہ ہو چکے تھے۔ جب واشنگٹن نے
۹۱ اپنے ہم وطنوں کو پارٹیوں اور گروہوں کے بُرے اثرات سے متنبہ کیا تھا تو اس نے تاریخ ہی سے مثالیں لی تھیں۔ جیفرسن نے اجنبیوں اور فسادات کے متعلق قوانین کی مذمت کی تھی اور حکومت کے جبر و استبداد سے آزادی کے طویل ریکارڈ کا جشن منایا تھا۔ کال ہون[1] نے ریاستوں کے حقوق کی توثیق کے لیے تاریخ ہی سے مدد لی تھی۔

ویبسٹر[2] نے ایک اور ناقابلِ علیحدگی یونین کے لیے جو اپیل کی تھی وہ اب بھی ہمارے دلوں کی حرکت تیز کر دیتی ہے۔ لنکن نے پہلے افتتاحی خطبے میں قوم کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ قوم ریاستوں سے پہلے آتی ہے۔ گیٹس برگ میں اس نے جو خطبہ دیا تھا۔ اس کی ابتدا ہی میں ستاسی سال پیشتر کے واقعات یاد دلائے تھے۔ ایسی سیکڑوں مثالیں ہمارے دلوں میں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے صرف ایک یہاں پیش کی جاتی ہے۔

ونسٹن چرچل مؤرخ بھی ہے اور تاریخ ساز بھی۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ میں نے جب چیکرس[3] میں یہ سنا تھا کہ جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا ہے تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب برطانیہ

---

۱ : (۱۷۸۲—۱۸۵۰ء) — ۱۸۲۵ سے ۱۸۳۲ء تک امریکا کا نائب صدر رہا۔

۲ : امریکی مدبّر اور خطیب (۱۷۵۲—۱۷۸۲ء)۔

۳ : لندن سے باہر وزیرِ اعظم انگلستان کی سرکاری قیام گاہ۔

بچ گیا۔ میں نے امریکا کی خانہ جنگی کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ جس میں امریکی آخری انچ کے لیے انتہائی بے جگری سے لڑتے رہے.......... میں مزے سے سو گیا اور وہ نیند ایسے فرد کی تھی جو مہلک خطرات سے محفوظ ہو گیا ہو۔

تاریخ ہمیں کیا سکھاتی ہے

ہم تاریخ کی سب سے زیادہ متعارف تعریف غالباً پہلے درج کر چکے ہیں یعنی فلسفہ مثالوں کے ذریعے سکھانے کا نام تاریخ ہے۔ یہ تعریف بالنگ بروک کی ہے لیکن ہیلی کارناسس کے دیونیسیس[1] نے دو ہزار سال پیشتر یہی الفاظ کہے تھے۔ پندرہ سو سال بعد سر والٹر ریلے[2] نے جو مؤرخ بھی تھا، اور مکتشف بھی۔ لکھا تھا کہ تاریخ کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہمیں مثالوں کے ذریعے ماضی کے دور سے ایسی عقل و دانش سکھائے جو ہماری خواہشات و اعمال کی رہنما بن سکے۔ کوئی تعریف اس سے زیادہ فرسودہ نہیں اور نہ کوئی اس سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔

اچھا، اگر تاریخ مثالوں کے ذریعے سے فلسفہ سکھانے کا نام ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ کیا سکھاتی ہے؟

راستبازی اور انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اعتراف کر لیں، یہ وہ سب کچھ سکھاتی ہے جو مؤرخین یا یوں کہہ لیجیے کہ برسرِ اقتدار لوگ سکھانا چاہتے ہیں۔ صدیوں سے تاریخ فتحمند فوجوں کے پیچھے پیچھے چلتی رہی ہے۔ یہ ہمیشہ کامیاب فریقوں کی محافظ رہی۔ جن طبقوں کو اقتدار حاصل ہوا ان کے مختلف کاموں کا جواز پیش کرتی رہی اور جو مذاہب قائم ہو چکے تھے ان کی نشر و اشاعت میں لگی رہی۔ در اصل تاریخ کو ذاتی، جماعتی، مذہبی، طبقاتی یا قومی مقاصد کے لیے اس پیمانے پر ناجائز طریقے سے استعمال کیا گیا کہ ہم نپولین کے اس مقولے سے ایک حد تک ہمدردی رکھتے ہیں کہ تاریخ ایک جھوٹ ہے جس پر اتفاق کر لیا جائے۔

میتھیو آرنلڈ نے کہا تھا کہ تاریخ ایک بہت بڑا دریا ہے مسسی پی ہے، جو جھوٹ سے لبریز ہے۔ جسٹس ہوم نے حقیقت کی ایک تمسخر آمیز تعریف پیش کی ہے کہ حقیقت اس قوم کی اکثریت کی رائے کا نام ہے جو دوسری قوموں کا کچومر نکال دے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ قریباً ہر بڑی جنگ میں دونوں فریق تاریخ سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں کامل یقین ہوتا ہے کہ

---

[1]: یونانی حکیم اور عالم، وفات ۷ قبل مسیح۔

[2]: ملکہ الزبتھ کے عہد کا مشہور امیر اور مکتشف (۱۵۵۲–۱۶۱۸ء)۔

تاریخ دونوں کے تقاضے پورے کرے گی۔ سالہا سال سے تاریخ ہر اہم معاملے کی مؤید چلی آتی ہے۔ اوقیانوس کے دونوں ساحلوں پر دولت مندوں اور طاقتوروں نے انقلاب فرانس کی تاریخ پیش کرتے ہوئے تمام عوامی اصلاحات پر لعنت بھیجی اور اپنے حقوق کی حفاظت پر زور دیا۔ جنوبی امریکی ریاستوں کے باشندوں نے یونان اور روم کی تاریخ سے فائدہ اٹھا کر یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ غلامی ایک فائدہ رساں ادارہ تھا اور اعلیٰ تہذیب کے لیے یہ اشد ضروری ہے۔ ہٹلر نے تاریخ کے غلط استعمال سے آریاؤں کی برتری دوسری نسلوں پر ثابت کی۔ کمیونسٹ چینی آج اپنی تاریخ از سرِ نو لکھ رہے ہیں تاکہ ثابت کر سکیں کہ سفید فام نسلیں ہمیشہ زرد فام قوموں سے ناجائز فائدہ اٹھاتی رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی سیاستدان تاریخ سے استمداد کرنے میں دریغ نہیں کرتے تاکہ اپنی دلیلوں کو صحیح ثابت کریں۔ مثلاً افراطِ زر ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ اختیارات مرکز میں جمع کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ استبداد شروع ہو جائے۔ اشتراکیت جذبۂ جدّت برباد کر ڈالتی ہے۔ اکثریت میں بے انصافی سے قرب ہوتا ہے۔

تاریخ کے فائدے

اگر حقیقتِ حال یہی ہے تو ہم یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیتے ہیں کہ تاریخ کا مطالعہ بہتر سے بہتر حالات میں ایک بے مقصد خود غرضی ہے اور بدترین حالات میں اسے سرچشمۂ خرابی سمجھ لینا چاہیے۔ بعض نقاد بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں مثلاً "نیٹشے[1] اور ورلین[2]"، مگر حقیقت یہ نہیں۔ تاریخ کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ یہ انسانیت کے لیے حافظے کا کام دیتی ہے۔ اس سے تخیل میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ ذہنی افق میں وسعت آتی ہے اور ہمدردیاں گہری ہو جاتی ہیں اس کے ذریعے سے ماضی کے متعلق گواہوں کی ایک فوج بلائی جاتی ہے جو نئی نسل کو تعلیم دے کر بہتر بناتی ہے۔ اس سے ہر نسل میں یہ سمجھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ ماضی کی بنا پر نئی تعبیر ممکن ہے، اور اغلب ہے مستقبل میں ترقی کا راستہ کھلے اس سے اخلاقی اصول اور حکمت نامے پیدا ہوتے ہیں۔

کون سے اخلاقی حکمت نامے؟ تاریخ ایک وسیع منظر مہیا کرتی ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ وقت کا سلسلہ بہت طویل ہے اور ہماری زندگیاں محض تیزی سے گزر جانے والی آنیں ہیں۔

---

[1]: جرمن فلاسفر (۱۸۴۴ – ۱۹۰۰ء)۔

[2]: فرانسیسی شاعر (۱۸۴۴ – ۱۸۹۶ء)۔

ہزاروں سال سے ہر نسل خیال کرتی رہی کہ تاریخ کا مقصود وہی ہے۔ لوگوں پر پہلے بھی بحرانی دور گزر چکے ہیں۔ جنگیں پیش آئیں۔ ہنگامے بپا ہوئے۔ فتوحات حاصل کی گئیں۔ الم نامے رونما ہوئے۔ اور دنیا قائم ہے۔ جو معاملے اور مسائل ہمارے افق پر بہت نمایاں حیثیت اختیار کر گئے، ممکن ہے تاریخ کے وسیع تر افق پر وہ نظر بھی نہ آئیں۔ بادلوں سے جا ملنے والے برج شاندار محل، متین عبادت گاہیں جو ہمیں عجائباتِ عالم کا جزو معلوم ہوتی ہیں بالکل فنا ہو جائیں گی اور ان کا نقش تک باقی نہ رہے گا۔

تنگ نظری میں اعتدال

چونکہ تاریخ وسیع تر منظر مہیا کرتی ہے۔ یہ ہماری تنگ نظری میں اعتدال پیدا کر دیتی ہے۔ زمان و مکان دونوں کی تنگ نظری۔ یہ تنگ نظری اخلاقی بھی ہے اور مجلسی یا سیاسی بھی۔ ہمیں تعلیم ملتی ہے کہ دنیا بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر قسم کی مخلوق رہتی ہے۔ متفرق اجزا ہیں جو سب کے سب ہماری خواہشوں کے تابع نہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کبھی ایک لوگ پھر دوسرے لوگ۔ ایک قوم پھر دوسری قوم۔ ایک تہذیب پھر دوسری تہذیب۔ تاریخ کے مرکزی سٹیج پر پہنچ گئی۔ اور اس نے اپنے لیے سب سے بڑے کردار کا مطالبہ کیا پھر وہ تاریکی میں گم ہو گئی۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ہماری عادات اور ہمارے مفادات، ہمارے معیار اور ہماری قدریں کوئی عالمی حقیقت نہیں رکھتیں۔ ہم اپنی رائے تاریخ پر مسلط نہیں کر سکتے یا کولوسس[1] کی طرح تاریخ پر سوار نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اس سے ہمیں حلم اور مسکینی کا سبق ملتا ہے۔

صبر و شکیب کی تعلیم

ان حکمت ناموں کے ساتھ ساتھ تاریخ ہمیں صبر و شکیب کا پابند بناتی ہے یعنی قدرت کی تسخیر کے لیے انسانوں کی جد و جہد میں صبر کے سوا چارہ نہیں۔ ایسی حکومت اور ایسا معاشرہ منظم کرنا چاہیے جو ہزاروں مسائل سے عہدہ برا ہو سکے۔ ایسے مسائل مسلسل ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ تاریخ ہمیں صبر کی تعلیم دیتی ہے تاکہ انسانوں کی غلطیوں، مہموں کی بدانجامیوں اور اداروں کی ناکامیوں کو

---

[1]: یہ ایک بہت بڑا مجسمہ تھا جو جزیرہ روڈز میں ایک آبی گزرگاہ کے اوپر پل کی طرح چھایا ہوا تھا اور دنیائے قدیم کے سات عجائبات میں سے ایک تھا۔ ۲۲۴ قبل مسیح کے زلزلے میں گر گیا۔

برداشت کر سکیں۔ ہماری امیدوں اور آرزوؤں کو جن حسرتوں سے سابقہ پڑتا ہے ان پر ہمّت نہ ہاریں۔ تاریخ ہمیں معاصروں کے بارے میں صبر کی تعلیم دیتی ہے۔ ایسے موقعوں پر صبر سکھاتی ہے جیسے جیفرسن نے انقلاب فرانس کے سلسلے میں استعمال کیے یعنی ان آدمیوں کے متعلق جو خون کے ذریعے سے سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے اپنے دیرینہ گم شدہ حقوق قتل کر کے رکھ دیے۔ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ بھی صبر سے کام لیے بغیر چارہ نہیں جو صدیوں کی محرومی اور تاریکی سے ابھی باہر نکل رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک ہی جست میں مغربی دنیا کے لوگوں تک جا پہنچیں۔ ان لوگوں کے متعلق بھی صبر سے کام لیے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا جو نہ ہمارا طریقِ فکر ماننے اور اختیار کرنے پر آمادہ ہیں، نہ ہمارے ادارے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں ان تجربوں کے سلسلے میں بھی صبر ہی سے کام لینا پڑے گا جو صحیح اصول پر نہ ہو سکے اور مکروہ تھے۔ تاریخ ہمیں مشورہ دیتی ہے کہ اس کی اتھاہ عملداری کے سلسلے میں تحمل پر کاربند ہوں۔ تاریخ کے یہ اعمال غیر متوقع، نادیدہ اور غیر متعارف ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کبھی اس طرح پیش نہیں آتا جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ پیش آئے۔ وہ مسائل جو کبھی اس طرح حل نہیں ہوتے جس طرح ہم انھیں حل کرنے کے خواہاں تھے۔ اور یہ مسائل نئے مسائل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ بھی یکساں لاینحل رہتے ہیں۔ تاریخ ان تمام معاملات میں ہمیں صبر و سکون کی تعلیم دیتی ہے لیکن ان سادہ لوحیوں کو گوارا نہیں کرتی جو ہمارے پُر پیچ مسائل کو زیادہ پُر پیچ بنا دیتے ہیں۔ اور اُلجھا دیتے ہیں۔

رواداری

تاریخ رواداری کی تعلیم دیتی ہے۔ مختلف عقیدوں، مختلف وفاداریوں، مختلف کلچروں، مختلف افکار اور مختلف نظریات کے تعلق میں رواداری برتنا۔ تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ صدیوں میں بیشمار عقیدے، کلچر، بے شمار قومیں، بے شمار فریق، بے شمار فلسفے گزر چکے ہیں اور ہر قوم یہ فرض کرنے کی مجرم ہے۔ دیکھو ہم وہ قوم ہیں جن کے ساتھ دانش ختم ہو جائے گی۔ ہر فرقہ اور ہر فریق کبر و رعونت کے ایسے ہی سلسلوں میں گُم رہا اور سمجھتا رہا کہ وہی تاریخ کا مقصد و نصب العین اور وہی خدا کی مشیّت کا ظہور ہے۔ یہ اجنبی قوموں کو متصادم مفادات و افکار کے متعلق رواداری سکھاتی ہے۔ ایسے افکار و مفادات جو جسٹس ہومز کے الفاظ میں مکروہ اور موت سے لبریز نظر آتے تھے۔ تاریخ ہمیں آزادی کی ضرورت پر متوجہ کرتی ہے۔ چھان بین کی آزادی، آزادہ روی کی آزادی، اختلاف کی آزادی، کیونکہ یہ واضح کر دیتی ہے کہ آزادی ہی وہ طریقہ ہے جس سے کام لے کر انسانیت حقیقت کی دریافت میں غلطیوں سے بچی رہ سکتی ہے۔

اہم سبق

تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ انسان فولادی قوانین کی مخلوق نہیں جن پر کنٹرول ممکن نہ ہو، نہ یہ اتفاق کی مخلوق ہے۔ یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ انسان کسی سیکولر جبر کا محتاج ہے، نہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ تاریخ کی ہوا اسے جس طرف چاہتی ہے لے جاتی ہے اور وہ تاریخی ہواؤں کا ایک بازیچہ ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر انسان اپنی تقدیروں کے مالک نہیں تو وہ تقدیر کے صید بھی نہیں۔ ہزاروں ولولہ افروز مثالوں کے ذریعے سے ہمیں یاد دلاتی ہے کہ فرد ایک حیثیت کا حامل ہے۔ کردار ایک مثبت حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ واضح کر دیتی ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نبوغ تھا جس نے دنیائے عرب میں زندگی کی ایک حیرت انگیز روح پیدا کر دی۔ یہ دوشیزۂ اورلیانز کی اخلاقی قوت تھی جس نے فرانسیسیوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کر دیا۔ کرامویل کا فولادی عزم پیوریٹنوں کی فتح مندی کے لیے ناگزیر تھا۔ یہ واشنگٹن تھا جس نے انقلابی جنگ میں امریکا کی کامیابی ممکن بنائی۔ اور ونسٹن چرچل کی فصاحت و عزم کے بغیر انگلستان کے لیے اس وقت تک قائم و استوار رہنا مشکل تھا جب تک سمندر پار سے اس کے لیے مدد پہنچتی۔

قومی کردار

کیا تاریخ ہمیں نہیں بتاتی کہ صرف فرد ہی کا کردار نہیں بلکہ پوری قوم کا کردار درکار رہے؟ چرچل نے کہا کہ وہ ہمیں کس قسم کی قوم سمجھتے ہیں۔ یہ انگلستان کی تاریخ کا نہایت مشہور موقع تھا اور کیا ہم کہہ نہیں سکتے کہ ہٹلر اور اس کے ساتھی تاریخ سے ناواقف تھے اور اسے حقیر سمجھتے تھے۔ اس لیے تقدیر نے انھیں بھلا دیا کہ انگریز کیسی قوم تھے؛ قوم کا کردار اہم حیثیت کا حامل ہے اور اس کی وجہ سے حالات میں بہت فرق آجاتا ہے۔ ولندیزوں کو ہسپانوی امرا کے خلاف جدوجہد میں خاصی مصیبتیں پیش آئیں۔ نپولین کی شہنشاہی کے خلاف انگریزوں نے بھی بڑی ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ اسی طرح اہلِ سوئزرلینڈ نے حب الوطن، اور حوصلہ مندی کی خاص شان دکھائی۔ اہلِ ناروے نے نازیوں کے ظلم و جور کے خلاف بڑے تدبر، محنت اور دانشمندی سے کام لیا پھر جس قومیت کو نازی درہم برہم کر چکے تھے اسے از سرِ نو آزادی کی فضا میں تعمیر کیا۔

انسانی قلب و روح

تاریخ ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ کردار محض حوصلے اور قوت کے مظاہر ہی میں نمایاں نہیں ہوتا بلکہ قلب و روح کی چیزوں میں بھی اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ہم اگر قدیم ایتھنز یا احیائے علوم کے

فلارنس اور سینا یا الزبتھ کے انگلستان یا استعماری ورجینیا یا انیسویں صدی کے ڈنمارک کی تاریخوں پر متوجہ ہوتے ہیں تو محض اسی لیے نہیں کہ وہاں اولی العزمی اور شاندار قوت کے بڑے کارنامے نظر آتے ہیں، بلکہ اس لیے متوجہ ہوتے ہیں کہ اس تاریخ میں قلب و روح کی تازگی کا سامان ہے۔ تاریخ ہمیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتی ہے کہ شادمانی، عصمت اور قوت کی آزمائشیں ہر جگہ یکساں نہیں ہوتیں اور بہ حیثیت مجموعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل فتوحات دولت اور قوت کی نہیں بلکہ انسانی قلب و روح ہی کی ہیں۔

ہم اشیا کے اسباب نہیں جان سکتے لیکن ان اسباب کی تلاش بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس سے ذہن و دماغ کی توسیع ہوتی ہے اور ان سب کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے جو اس تلاش میں شامل ہوں۔ تاریخ کے ایسے قوانین موجود نہیں جنھیں سند سمجھا جا سکے لیکن جو بے شمار قوتیں تاریخ پر مسلسل کارفرما رہتی ہیں۔ ہمارے فہم و بصیرت میں گہرائی اور ہمارے فیصلے میں عالی ہمتی پیدا کر دیتا ہے۔ کوئی فلسفہ تاریخ کے بے نشان راستے کا پتا نہیں بتا سکتا لیکن جو لوگ ہمدردی سے اور فہم و بصیرت سے تاریخ کا مطالعہ کریں، جانتے ہیں کہ تاریخ فلسفہ سکھاتی ہے۔ خدا کرے تیرا یہ عمل برابر جاری رہے۔

تیرھواں باب

معلّموں کے لیے تجویز کردہ طریقے

(۱)

"مجھے کامل امید ہے کہ ماضی پر غور و فکر آنے والے دَور کے لیے رہنمائی کی ۹۹
روشنی مہیّا کرے گا۔ نئی نسل کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ پیشتر کی بعض غلطیاں
درست کر لے اور بنی انسان کی عظمت و شان اور ضرورت کے مطابق اس دور
میں حکومت کرے جس میں مستقبل کے مناظر سے پردہ اٹھنے والا ہے۔"

ونسٹن چرچل

انسان پہلے کی طرح اب بھی اپنے ماضی کے متعلق حد درجہ جویا نگاہیں رکھتا ہے۔ تہذیب کی صبح نمودار ہوتے ہی وہ آثارِ باقیہ تحریرات، تصویروں، عمارتوں، مقبروں، خطوں، دستاویزوں اور روزنامچوں کے مطالعے میں مصروف رہا ہے۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ جان لے مجھ سے پیشتر کیا کچھ ہو چکا ہے۔ دورِ حاضر کا انسان آثارِ باقیہ اور دورِ ماضی کے دوسرے باقیات پر بہت رقمیں صرف کر رہا ہے مثلاً قومی زیارت گاہوں اور تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے تعطیلات میں منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ ماضی کے بڑے بڑے انسانوں کے متعلق جو کہانیاں اور افسانے خود اس نے سُنے انھیں بڑے احترام سے بچوں کو سناتا ہے۔ بچّے اور نوجوان بھی اس دلچسپی میں حصّہ لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کی چھان بین میں بار بار ایسے عنوان آتے ہیں "جو لوگ بہت پہلے یہاں زندگی گزار چکے" مثلاً نئے نئے علاقے دریافت کرنے والے بڑے بڑے مکتشفین کیسے تھے؟ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ نوجوانوں کے مطالعے کا بھی دلچسپ حصّہ یہی ہے اگرچہ معلوم ہے کہ تاریخ کو سکول کے مضامین میں چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ ۱۰۰

میں سمجھتا ہوں کہ اساتذہ دمعلّمین کی حیثیت میں یہ ہمارا کام ہے کہ اس دلچسپی کو ضبط و نظم میں لائیں اور اس پر ماضی کے مطالعے کا ایک ایسا طریقہ تجویز کریں جس سے طلبہ کے لیے اس میں نئے معنی، نئی قدر و قیمت اور نیا جوش پیدا ہو جائے۔

ہمارے سامنے اس موضوع کے لیے گنجائش کم رکھی گئی ہے اس لیے ہم نئے تاریخی نصاب، پروگرام، نظریے

اور منظر کی تجویز پیش نہیں کر سکتے ، اس سے جو جو افکار پیدا ہوتے ہیں وہ کامیابی اور نجات کی ضمانت نہیں بن سکتے البتہ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ پروفیسر کمیجر کے نہایت جاذب افکار واضح کر دیں جن سے زیادہ تر معلمین مختلف مواقع پر کام لے رہے ہیں اور امید رکھیں کہ ان میں سے بعض افکار ضرور طلبہ کی مختلف جماعتوں کے لیے اختیار کیے جائیں گے یا انھیں جماعت کے سامنے پیش کرنے کے لیے موضوع بنا لیا جائے گا۔

سب سے پہلے یہ غور فرمالیجیے کہ انسانی معاشرے کی جو کیفیت ہمیں یاد ہے یا قلم بند ہو چکی ہے اس میں مسلسل اور بے پناہ تغیر کو ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل رہی ہے ۔ تغیر کے سوا یہاں کسی خصوصیت کو دوام نہیں ۔ یہ پرانے زمانے کے یونانی فلسفی ہراکلیٹس[1] کا قول ہے ۔ ہر پڑھا لکھا اور ذی احساس انسان جو اپنی قریبی اور وسیع میراث کا مطالعہ کرتا ہے ، شکلوں کو دیکھتا اور آوازوں کو سنتا ہے ۔ یہ شکلیں اور یہ آوازیں اس کے گرد و پیش منڈلاتی رہتی ہیں ۔ وہ یہی اثر قبول کرتا ہے کہ یہاں تغیر ہی کو سب پر فوقیت حاصل ہے ۔ جو بڑی بڑی عمارتیں اور یادگاریں ماضی کے واقعات کی کہانیاں سناتی ہیں ۔ ان پر جمی ہوئی کائی یا موسم کے دوسرے اثرات بھی تغیر ہی کا منظر پیش کرتے ہیں ۔ ایسے بڑے بڑے مدبروں کی ریکارڈ کی ہوئی آوازیں سننے میں آتی ہیں جو اب حکومتوں کی عالیشان عمارتوں میں نظر نہیں آتے ۔ البتہ وہاں تاریخ موجود تھی اور اب بھی تاریخ سازی کا کام جاری ہے ۔ ہم ایسی غذائیں بہ آسانی کھا سکتے ہیں جو گزرے ہوئے زمانے میں انسانوں کے لیے ممکن نہ تھیں ۔ کسی آلے کا نرم و ملائم چوبی دستہ محسوس کیا جا سکتا ہے جو کسی زمانے میں اہم مقصد کے لیے لگایا گیا تھا اور اب وہ موجود نہیں ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے بچے اور نوجوان تاریخ کے منتخب اور تخلیقی حصے سامنے رکھ لیں اور غور سے مطالعہ کریں تو وہ تغیر کے مختلف مناظر کے مضمرات اور نوعیت کا بہتر اندازہ کر سکتے ہیں ۔ اس مختصر سے حصے میں ہم نے وہ طریقے واضح کیے ہیں جو اساتذہ اور معلمین کو تغیر کے مستقل پہلو نمایاں کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جیسا کہ انھیں تاریخی پس منظر میں دیکھا جاتا ہے ۔ اساتذہ و معلمین چاہیں تو وہ تغیر کی دوسری شاخوں اور خواص کی توضیح کے لیے اور چیزیں بھی لے سکتے ہیں اور متبادل سرگرمیاں بھی جاری کی جا سکتی ہیں ۔

معلمین و اساتذہ طلبہ کے مختلف درجوں میں یہ بھی کر سکتے ہیں کہ کسی ممتاز یا غیر ممتاز فرد کی زندگی سامنے رکھ لیں جس کے متعلق مواد موجود ہوں مثلاً جونیر اور سینیر ہائی سکول کے طلبہ کے لیے ابراہم لنکن کی زندگی کو تغیرات کی نمائش کا موضوع بنایا جا سکتا ہے ۔ ابراہم لنکن پر ایک کتاب[2] فلپ وین ڈورنسٹرن نے لکھی ہے ۔ استاد یا معلم یہ کتاب سامنے رکھ کر لنکن کی تقریروں سے مختلف حصے کلاس میں پڑھ کر سنا سکتا ہے اس کتاب پر جو ابتدائی تنقید

---

[1] چھٹی یا پانچویں صدی قبل مسیح کا یونانی فلسفی ۔

[2] "دی لائف اینڈ رائٹنگز آف ابراہم لنکن" ۔ نیو یارک ، ماڈرن لائبریری ۱۹۴۰ء ۔

کی گئی' وہ ایلن نیونز کے قلم سے تھی۔ وہ لکھتا ہے :

" لنکن نے قوت کے اس ذخیرے کو جو قدرت نے اسے عطا کیا تھا، رفتہ رفتہ نشوونما دی اور اس طرح وہ ہر ضرورت کے مقابلے کے لیے تیار رہتا رہا۔ اس نے زندگی کے ہر بحران کا مقابلہ کیا جس میں محض مقابلہ نہ تھا بلکہ ایک تازہ رُوح کار فرما تھی۔ کنزس اور نبراسکا میں جو مسودۂ قانون غلامی کی توسیع کے لیے پیش ہوا تھا۔ اس پر لنکن کے دل میں مخالفت کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس موقع پر جو تقریر کی گئی وہ پیوریا کی تقریر سے زیادہ بلند پایہ تھی۔ گیٹس برگ میں لنکن نے جو خطبہ دیا وہ اس کے دوسرے افتتاحی خطبے سے بدرجہا زیادہ عالی قدر تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ عالی قدر تھا جب ڈگلس نے لنکن کی ریشمی ہیٹ تھام رکھی تھی اور وہ عہدے کا حلف اٹھا رہا تھا۔ ارتقا کا ثبوت ہمیں اس کی تقریروں اور خطوں میں بھی مل سکتا ہے۔ ہم ان تقریروں اور خطوں میں وہ جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں جن کے گہرے چشمے اس کی اندرونی قوت کا مرجع تھے۔"

لنکن کی تقریروں کے بعض حصے جماعت میں پڑھ کر سنائے جا سکتے ہیں۔ یہ کام اساتذہ اور معلمین بھی کر سکتے ہیں، اور اس کے لیے وہ ریکارڈ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں جو ریمنڈ میسی نے لنکن کی تقریروں کے تیار کیے تھے۔ مثلاً پہلی تقریر جو ۹ مارچ ۱۸۳۲ء کو کی گئی۔ پھر ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو سینیٹر ڈگلس کے جواب میں پیوریا کے مقام پر کی گئی تھی۔ بعد ازاں جوشوا اسپیڈ کے نام اس کا خط جو ۲۴ اگست ۱۸۵۵ء کو لکھا گیا۔ پھر سپرنگ فیلڈ میں اس کی تقریر جو ری پبلکن سٹیٹ کنونشن کے موقع پر کی گئی (۱۶ جون ۱۸۵۸ء)۔ کوپر یونین میں لنکن کا خطاب (۲۷ فروری ۱۸۶۰ء)۔ سپرنگ فیلڈ میں اس کا وداعی خطبہ (۱۱ فروری ۱۸۶۱ء) اس کا پہلا افتتاحی خطبہ (۴ مارچ ۱۸۶۱ء)۔ اس کا خط ہارلیس گریلی کے نام (۲۲-اگست ۱۸۶۲ء)۔ اس کا خط بنام جیمز کنکلنگ (۲۶-اگست ۱۸۶۳ء)۔ اس کا گیٹس برگ کا خطبہ (۱۹ نومبر ۱۸۶۳ء)۔ اس کا آخری خطبہ (۱۱-اپریل ۱۸۶۵ء)۔

طلبہ سے پوچھنا چاہیے کہ وہ ان تحریروں کے اختلافات کی نشان دہی کریں۔ بہ اعتبار لب ولہجہ اور بہ اعتبار اثر نیز لنکن میں بہ حیثیت انسان اور بہ حیثیت مدبر تغیرات پر بحث کی جائے جو ان تحریرات میں نمایاں ہیں۔ اسی انداز میں سیکنڈری سکولوں کے طلبہ سے بھی لنکن کی زندگی کے تغیرات پر بحث کرائی جا سکتی ہے اس غرض کے لیے رابرٹ ای شیروڈ کے قلم سے وہ کھیل پیش نظر رکھا جا سکتا ہے جس کا نام ہے ایبے لنکن ان الی نائے ہیں۔ یا اساتذہ انٹرمیڈیٹ جونیر ہائی سکول اور سینیر ہائی سکول کی سطح پر کارٹونوں کا ایک سلسلہ شروع

ل۔ امریکی ریاست الی نائے کا ایک مشہور شہر۔

کرا سکتے ہیں جس میں کسی خاص شخصیت کی زندگی کے تغیرات واضح کیے جائیں۔ اس کے لیے ایلبرٹ شا کی کتاب "اے کارٹون ہسٹری آف روز ویلٹس کیریر"، نیز جے این ڈارلنگ کی کتاب "اینڈ ڈنگ سا ہوور"۔ یہ کتابیں اس سلسلے میں نمونے کا کام دے سکتی ہیں۔

۱۰۲ اگر آپ کسی ایک فرد میں تغیر کی بہت ہی نمایاں تصویر دیکھنا چاہیں تو وہ بیٹی فلیڈلینڈ کی کتاب میں ملے گی جس کا نام ہے۔ "جیمز گلسپی برنی: سلیو ہولڈر ٹو ایبو لشنسٹ"۔ سینیر ہائی سکول کے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ وہ آپس میں گفتگو کریں۔ ان کی امداد کی جائے کہ وہ سمجھ سکیں۔ برنی کی زندگی میں اتنا زبردست انقلاب کیونکر پیدا ہوا۔ جب وہ لڑکپن کی حالت میں تھا تو اس کے پاس ایک غلام تھا جب اس نے شادی کی تو اسے اور اس کی بیوی کو دونوں کے والدین نے گھریلو زندگی کے لیے غلام تحفے کے طور پر پیش کیے۔ ۱۸۲۱ء تک برنی خود انہیں حبشی خرید چکا تھا اور اس کے تمام غلاموں کی تعداد تینتالیس تک پہنچ چکی تھی لیکن غلامی ابتدائی دور ہی سے برنی کے لیے خاصی پریشان کن رہی۔ تاہم عملاً اسے ایک اچھی چیز سمجھ کر قبول کر لیا اگرچہ اصولی طور پر اس سے اتفاق نہ تھا۔ طلبہ کے لیے یہ دریافت کرنا بطور خاص اہم ہوگا کہ برنی کے خیالات میں ایسا تغیر پیدا ہوا جس کی بنا پر اپنے تمام غلام آزاد کر دیے۔ وہ غلامی کی تنسیخ کا حامی بن گیا اور ایک مرتبہ اسی مسئلے پر صدارت کے انتخاب میں بھی کھڑا ہوا جس میں اپنے بدلے ہوئے معتقدات پیش کیے۔ ۱۸۴۶ء میں اس نے ایک گرجا گھر بنایا اور اسی زمانے میں اپنے عقائد کے متعلق ایک مقالہ لکھا جس میں انسانی مساوات پر زور دیا۔

چھوٹے بچے اور نوجوان اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق مقامی تغیرات کی چھان بین کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ بہت ہی سہل ہے کہ کوئی سرگرم استاد یا معلم (یا کوئی طالب علم) ایک ہی مقام کے متعلق مختلف تصاویر یا تحریری مقالات جمع کرے جو سالہا سال پر پھیلے ہوئے ہوں، پھر خود بتائے کہ اس مدت میں کیا کیا تغیرات ہوئے۔ جو لوگ اس مقام پر مدت سے رہتے ہوں وہ ایسی تصویریں یا مقالات طلبہ کو مستعار دینے پر راضی ہو سکتے ہیں۔ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ خود انھی کو دعوت دے کر جماعت میں بلایا جائے تاکہ وہ ذاتی کہانیاں براہ راست بیان کر سکیں۔ بوڑھے شہری سکول میں نہیں آ سکتے، ان سے ذاتی طور پر معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں مثلاً طلبہ کے چھوٹے چھوٹے گروہ ان کے پاس پہنچیں اور ان کی بیان کردہ کہانیاں ٹیپ ریکارڈ کر کے لے آئیں تاکہ طلبہ کی جماعت انھیں تعلیم کے کمرے میں سُنے اور اس پر بحث کرے۔ جو مقامی کاروباری لوگ سالہا سال سے وہاں مقیم ہیں ان کے پاس سے تصویروں، پوسٹروں، اشتہاروں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی خاصی مقدار مل جاتی ہے جن سے سہولتوں اور آسائشوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ بعض اخبارات سکول کے بچوں کے لیے پرانے اخباروں کے نمبر اور تصویریں مہیا کر سکتے ہیں جن میں مختلف مقامات میں تبدیلیاں

ہوتی رہیں۔ طلبہ کا چھوٹا سا گروہ ایسے مقامات دیکھ سکتا ہے اور تمام حالات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ جس ضلع میں سکول واقع ہو، اس کے مرکزی دفتر سے بھی رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے تاکہ گوناگوں تغیرات کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ پرانے ہائی سکولوں میں فائلوں کے ڈھیر مل سکتے ہیں جن میں سابقہ سالناموں کی کاپیاں بھی ہوں گی۔ ان سے چھان بین
اور بحث کا سامان حاصل کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ اس مشغلے میں اس درجہ منہمک ہو سکتے ہیں کہ رفتہ رفتہ سکول کے پورے ۱۰۳
ضلع کی نیز خاص سکول کی تمام تبدیلیوں کی مختصر سرگزشت مرتب کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی سکول کے بچے ایسی کتابوں میں دلچسپی لے سکتے ہیں جیسے جینس ہالینڈ کی کتاب " وے بلٹ اے سٹی "۔ اس کتاب میں ہمارے مرکزی شہر کی ابتدا اور ترقی کا حال بیان کیا گیا ہے جن میں ہمارے کیپیٹل[1] کی ابتدا اور ترقی کی کیفیت بتائی گئی ہے۔ بالائی ابتدائی، جونیر اور سینیر ہائی سکول کے اساتذہ طلبہ کو ایسی چیزوں میں مصروف رکھ سکتے ہیں جیسے جوزف اور ڈوروتھی برگر کی نہایت دلکش کتاب " ڈائری آف امیریکا " طلبہ کے سامنے رکھنی چاہیے تاکہ انھیں معلوم ہو کون کون سے مقامات بدل چکے ہیں اور تغیر کس پیمانے پر آ چکا ہے ذیل میں ان ڈائریوں میں سے چند اقتباسات دیے جاتے ہیں جن میں نیویارک کا بیان ہے : پہلا اقتباس جیسپر ڈنکرٹس کا ہے۔ یہ ۱۶۷۹ء کا ہے جب نیویارک کی آبادی زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین ہزار تھی۔ بعد کے اقتباسات فلپ ہون کے قلم سے ہیں جو نیویارک کا دولتمند کاروباری آدمی تھا۔ یہ اقتباسات ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان کے ہیں۔ پھر ایک فرانسیسی مصنف سالموَن ڈی بیووائر نے ۱۹۴۷ء میں نیویارک کو دیکھ کر اپنے احساسات بیان کیے۔ یہ اقتباسات ذیل میں درج ہیں :

۱۔ " جزیرہ مین ہٹن[2] تقریباً سات گھنٹے کی مسافت لمبائی میں ہے اور ایک گھنٹے کی مسافت چوڑائی میں۔ اس کے کناروں پر چھوٹی چھوٹی خلیجوں کے دندانے ہیں، یا کوئی خلیج اندر چلی گئی ہے۔ یہ پورا جزیرہ آبادی کے لیے لے لیا گیا ہے۔ نجی مالکوں کے قبضے میں ہے لیکن نصف سے زیادہ زیر کاشت نہیں اس کا خاصا بڑا حصہ جنگل ہے۔ مغربی جانب شہر واقع ہے، اسے بالکل صاف کر لیا گیا ہے۔ اس کی لمبائی ایک گھنٹے کی مسافت کی ہے لیکن یہ زمین بالکل ناقص ہے۔ بہترین زمین مشرقی اور شمالی جانب ہے۔

" یہاں تازہ پانی کے بہت سے چشمے ہیں جو جا بجا بہتے ہیں۔ آدمیوں اور جانوروں کے پینے کے لیے نہایت عمدہ پانی ملتا ہے۔ یہ چشمے دیکھنے میں بھی اچھے معلوم ہوتے

---

[1] واشنگٹن میں سرکاری عمارت جس میں امریکی کانگرس کے اجلاس ہوتے ہیں۔

[2] ایک جزیرہ جہاں نیویارک کا بہترین حصہ آباد ہے۔ اس جزیرے کی لمبائی تقریباً ۱۳ میل ہے۔ چوڑائی وسط میں دو میل ہے اور کناروں میں کسی قدر کم۔

ہیں۔ آرام کے مقامات ان کی وجہ سے ٹھنڈے اور خوشگوار نظر آتے ہیں لیکن یہ مقامات کارخانے بنانے کے لیے موزوں ہیں۔"

۲۔ "کیمڈن اور امبائے کی ریلوے لائن پیر کے روز کھل گئی جو مسافر نیویارک سے دخانی جہاز میں امبائے گئے، وہ ساڑھے چھ بجے چلے تھے اور دو بجے فلاڈلفیا پہنچ گئے۔ یہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بہترین مشترکہ کمپنی معلوم ہوتی ہے۔

....

"مئی کے مہینے میں اس بندرگاہ پر پندرہ ہزار آٹھ سو پچیس مسافر اترے۔ یہ سب یورپ سے آئے تھے اور سمندر کے راستے آئے تھے۔ جو لوگ گھر پر روزی کا ذریعہ نہیں پاتے وہ یہاں آجاتے ہیں۔ ہم انھیں کیا کریں۔ ان کی وجہ سے ہمارے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ہماری روٹیاں کھاتے ہیں۔ ہمارے بازاروں کا ہجوم بڑھاتے ہیں اور بیس میں سے ایک بھی نہیں جو اپنا گزارہ کر سکے۔"

۳۔ "ہم اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ لاگوارڈیا کے فضائی اڈے پر ہر منٹ
کے بعد ایک طیارہ اترتا ہے.......... ہم دریا کے ساتھ ساتھ چلے۔
لوہے کا ایک پل عبور کیا اور میرا ساتھی یکایک پکارا کہ وہ سامنے براڈوے ہے
میں نے بھی ایک نظر اس پر ڈالی۔ نہایت روشن گلیاں جن میں ہزار دو ہزار موٹریں
تھیں۔ کبھی حرکت میں آجائیں۔ پھر ٹھہر جائیں، پھر چل پڑتیں۔ نظم کا یہ عالم تھا کہ
معلوم ہو رہا تھا۔ ان سب کو آسمانوں سے خدائی مقناطیسی قوت چلا رہی ہے۔
ہمیں موٹر ٹھہرانے کے لیے جگہ کی تلاش میں خاصا وقت لگا۔ ڈی۔ پی نے میرے لیے ۱۰۴
ایک بہت بڑے ہوٹل میں کونے کا کمرہ پہلے سے محفوظ کر رکھا تھا۔ یہ ہوٹل آٹھویں
ایوے نیو کی جو اکیسویں گلی میں واقع ہے۔"[۱]

آدمیوں اور مقاموں میں تبدیلیوں کے متعلق بچوں اور نوجوانوں کو مدد دینے کے علاوہ اساتذہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ

۱؎ "ڈائری آف امیریکا"

مختلف اشیا میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان کی چھان بین کرائیں، خواہ ان کا تعلق ٹکنالوجی سے ہو یا سائنٹفک تبدیلیوں سے، وہ خاص ایجادات ہوں یا ٹکنیک اور عمل بدل گیا ہو۔ طلبہ کی پوری جماعت محض ایک شے میں نشوو ارتقا اور عمل کی تبدیلیاں تلاش کر سکتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بعض چیزوں کی چھان بین اپنے ذمے لے سکتی ہیں۔ بعض طلبہ تنہا بھی اپنی تحقیق کے لیے مختلف دائرے تجویز کر سکتے ہیں مثلاً یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ گھڑیاں کیونکر ترقی پذیر ہوئیں۔ مقامی عجائب خانے میں جب کر دیکھا جا سکتا ہے کہ مختلف دوروں میں کیا کیا چیزیں زیر استعمال رہیں۔ طلبہ اپنے آپ کو دھوپ گھڑی، آبی گھڑی اور ریت کی گھڑی سے آشنا کر سکتے ہیں۔ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ابتدا میں دندانے دار بتیاں کیونکر بنیں پھر لیمپ کیونکر بنائے گئے۔ کلاک، جیبی گھڑیاں، کلائی کی گھڑیاں اور ایسی ہی دوسری ایجادات رفتہ رفتہ اس درجے پر پہنچیں کہ چابی بھی خود بخود آ جاتی تھی۔ معلم یا طالب علم چھان بین کے بعد ایسی چیزیں لکھنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ جنھیں بلوواٹائم سنٹر چھاپ سکے جیسے کہ پہلے ایک رسالہ "یو اینڈ ٹائم" چھاپا گیا یعنی وقت کا معاملہ ایک سحر انگیز کہانی میں پیش کیا گیا۔ بہتر یہ ہے کہ طالب علم اور معلم تھلما اور کورڈون بیل کی کتاب "دی رڈل آف ٹائم" دیکھیں، اس میں موضوع پر بڑے دلچسپ انداز میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جماعت میں ایسی گھریلو چیزیں جمع کر لی جائیں جو ابتدائی دور کے امریکہ میں زیر استعمال تھیں مثلاً پاؤں گرم رکھنے کی چیزیں، لالٹین، بتی تھامنے کا آلہ، بچوں کا شوربہ دان، چوہے دان، دروازے کا کھٹکھٹا، کونڈی اور موسل، آتشدان کی دھونکنی، بوٹ کھرچنے کا آلہ، دہکتے ہوئے کوئلے اٹھانے کا آلہ۔ یہ تمام چیزیں جماعت میں رکھ دینی چاہئیں اور کچھ نہ بتایا جائے کہ یہ کیا ہیں اور کس کام کے لیے ہیں۔ طلبہ سے کہا جائے کہ وہ بتائیں یہ کیا ہے۔ ان کی ابتدا کا سراغ لگائیں۔ ان کی وضع و ساخت اور استعمال کی غرض بتائیں۔ یہ بھی بتائیں کہ ان کے استعمال کے ساتھ کون سی خاص باتیں وابستہ ہیں پھر ان آلات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر کریں اور بتائیں کہ ان کا استعمال کب سے رکا ہے۔ بعض حالتوں میں طلبہ کو ان آلات میں کئی تبدیلیاں ملیں گی۔ ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں گی جن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، اور طلبہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

طیاروں کی سرگزشت سے بھی اساتذہ کو یہ کام لینا چاہیے کہ یہ ایجاد کن کن مراحل سے گزری اور آخر اس نے ٹکنالوجی کے کیسے کیسے نئے نکتے بروئے کار لا کر زندگی کا طریقہ بدل دیا۔ پرواز کی تاریخ میں ولبر رائٹ اور آرویل رائٹ کے کاغذات سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں جس میں اس ایجاد کے وسائل اور ایجاد کرنے
والوں کی شخصیتوں کے متعلق ابتدائی کہانی بتائی جائے۔ یہ کاغذات میکفارلینڈ مرتب کر رہے ہیں اس سے ١٠٥
رائٹ برادران کی کامیابی اور ایک خواب کو حقیقت میں بدلنے کی دلچسپ ابتدائی کہانی بن گئی ہے معلم مثال کے طور پر یہ کر سکتا ہے کہ بالائی ابتدائی درجے اور دوسرے درجے کے طلبہ کے سامنے وہ خط پڑھے، جو ولبر رائٹ نے ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو آکٹیو چینوٹ کے نام لکھا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے:

"میں کئی سال سے اس خیال میں مبتلا چلا آتا ہوں کہ انسان کے لیے پرواز ممکن ہے۔ یہ بیماری شدت میں بڑھ گئی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کے لیے مجھے زیادہ روپے کی ضرورت ہوگی، اگر زندگی کی قربانی نہ دینی پڑی۔[1]"

پھر آرویل نے ۱۳ جنوری ۱۹۲۰ء کو ایک مقدمے میں مدعا علیہ کے وکیل کی طرف سے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہمارے دل میں سب سے پہلے اس مسئلے سے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب ہمارا باپ ربڑ کا ایک سپرنگ لایا جو ہوا میں اٹھ سکتا تھا۔ ہم نے کاغذوں سے اس کھلونے کی کئی نقلیں بنائیں جنھوں نے کامیابی سے پرواز کی۔ ہم سے مراد میں اور میرا بھائی ولبر ہیں۔ لیکن جب ہم نے وسیع پیمانے پر کھلونا بنانا چاہا تو یہ کچھ کام نہ دے سکا۔ اس کا سبب اس وقت ذہن میں نہ آیا لہذا ہم نے تجربہ ترک کر دیا۔ ۱۸۹۸ء میں ہم نے کسی روزنامے یا کسی میگزین میں پڑھا کہ اوٹو للین تھل اس معاملے میں تجربے کر رہا ہے اور وہ جرمنی میں ایک چھوٹی سی پہاڑی سے اڑنے کے لیے کوشاں ہے۔ چند ماہ بعد ایسی ہی کسی کوشش میں وہ مر گیا۔ اس سے موضوع کے ساتھ ہماری دلچسپی بڑھ گئی اور ہم نے پرواز کے متعلق کتابوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ ہمیں ایک کتاب ملی جو پروفیسر میرے نے جانوروں کی میکانکیت پر لکھی تھی۔ در اصل اس میں پرواز کے متعلق پرندوں کی میکانکیت سے بحث تھی۔ اس کے سوا ہمیں کتابوں میں سے اور کوئی چیز نہ مل سکی۔

"۱۸۹۹ء کے موسم بہار میں ہماری دلچسپی پرواز کے متعلق پھر بڑھ گئی کیونکہ ہمیں علم الطیور کے متعلق ایک کتاب مل گئی تھی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ پرندے میں کوئی ایسی خاص بات ہے جو اسے اڑنے میں مدد دیتی ہے اور ویسی کوئی چیز بڑے پیمانے پر انسان اپنے استعمال کے لیے نہیں بنا سکتا تھا۔"

معلم یہ منظر بھی پیش کر سکتا ہے کہ آرویل رائٹ نے کٹی ہاک[2] سے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو بشپ ملٹن رائٹ کے نام اپنی کامیابی کا مختصر سا تار بھیجا جس کا متن یہ ہے:

---

[1] رائٹ برادران کے کاغذات۔

[2] یہ وہ مقام ہے جہاں رائٹ برادران نے پرواز کے پہلے تجربے کیے تھے۔

"جمعرات کو اکیس میل فی گھنٹہ چلنے والی ہوا کے مقابلے میں چار مرتبہ پرواز کی۔ انجن خوب چلتا رہا۔ رفتار اکتیس میل فی گھنٹہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ لمبی پرواز ساٹھ سیکنڈ تھی۔ اخباروں کو اطلاع بھیج دیجیے۔ کرسمس گھر پہنچ کر مناؤں گا۔"

٦ اگر لڑکیاں بھی جماعت میں شامل ہوں تو وہ طیاروں جیسی ایجادات کے مطالعے میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرسکتیں۔ معلم کے لیے مناسب ہے کہ لڑکیوں کو غذا اور خوراک کی تبدیلیوں میں چھان بین پر لگا دے۔ نیز کہہ دے کہ دیکھیں کھانے کس کس انداز میں پکتے رہے۔ مثلاً لڑکیاں یہ تحقیق کرسکتی ہیں کہ ماکولات کی حفاظت کے کیا کیا طریقے اختیار کیے گئے اور ان کی وجہ سے زندگی کے طور طریقوں میں کیا کیا تغیرات ہوئے۔ مثلاً وہ ڈبوں کی ایجاد سے کام کا آغاز کرسکتی ہیں۔ ڈبے اس وجہ سے وجود پذیر ہوئے کہ نپولین چاہتا تھا اس کے سپاہیوں کے لیے کھانے محفوظ رہیں۔ پھر پیٹر ڈیورنڈ نے انگلستان میں ڈبوں کا کام شروع کیا۔ لوئی پاسچر[۵] کی سائنٹفک دریافتوں نے کئی سہولتیں پیدا کیں۔ پھر جان میسن نے ڈبے اعلیٰ پیمانے پر بنانے کا کام شروع کر دیا۔ الیگزنڈر کرنے مہر لگانے کا انتظام کر دیا وغیرہ۔ لڑکیاں اپنی دادیوں نانیوں سے بات چیت کرکے معلوم کرلیں گی کہ عورتیں باورچی خانے میں گھنٹے صرف کر دیتی تھیں تاکہ کھانا تیار ہونے کے بعد محفوظ رکھا جاسکے۔ اب وہی وقت دوسرے کاموں میں صرف ہو سکتا ہے کیونکہ نئی قسم کے ڈبے ایجاد ہو چکے ہیں اور خوراک کو انجماد کے درجے پر محفوظ کر لیا جا سکتا ہے۔

انٹرمیڈیٹ جماعت سے سینیئر ہائی سکول تک کے بچے اور نوجوان الفاظ کی تبدیلیوں میں مشغول کیے جاسکتے ہیں نیز یہ کہ تلفظ کے طریقے، خط و کتابت کی شکلیں، زمانہ بہ زمانہ اور ثقافت بہ ثقافت کیونکر تبدیل ہوتی رہیں۔

نیچے صرف چند الفاظ دیے جاتے ہیں جن کی ابتدا اور میراث بڑی دلچسپ ہے اس سے اساتذہ کو بے شمار الفاظ کا خیال پیدا ہو جائے گا (جو ہر جماعت کے طلبہ کی تعلیمی سطح کے لیے موزوں ہوں گے) جنھیں جماعت میں مطالعے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے:

گرین ہارن	امیریکا	الفابیٹ	پیپر
سکول	کرنل	بگل	سینڈوچ
ڈیزل	ہیمبرگر	انگلینڈ	آگسٹ
ٹائیکون	میورک	ڈیموکریسی	ریوالور
الجبرا	آسٹراسائز	کیمپ	باربیرین

۵ فرانس کا مشہور ماہر جرثومیات (۱۸۲۲ - ۱۸۹۵م)۔

فکر و نظر کے مختلف مرحلوں پر نوجوان اور بچے تاریخی ہستیوں پر بھی کام کر سکتے ہیں جنھوں نے بڑی بڑی تبدیلیاں کیں اور مساعی کے مختلف دائروں میں تبدیلیوں کا ذریعہ رہے۔ ابتدائی طلبہ کے اساتذہ منتخب اور سہل سوانح بچوں کو سنا سکتے ہیں البتہ یہ سوانح معروف شخصیتوں کے ہونے چاہئیں مثلاً لاون ہوک[1]، پاسچر اور ریڈ[2] جیسے سائنسدان۔ ان پر پال ڈی کروئیف نے خوب لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ جراثیم کی تلاش کرنے والے لوگ تھے۔ ایسی ہی دوسری شخصیتیں لی جا سکتی ہیں۔

ثانوی جماعتوں کے طلبہ عظیم القدر انسانوں کے نظریے پر چھان بین کر سکتے ہیں اور بحث و مطالعہ میں بڑے بڑے مؤرخوں کی تحریرات بطور اقتباس سامنے لائی جا سکتی ہیں مثلاً ایمرسن نے لکھا "حقیقتہً تاریخ کوئی شئے نہیں۔ یہ صرف سوانح حیات ہیں۔ نیز ادارہ ایک انسان کے سائے کی طوالت ہوتا ہے...... یا تاریخ در اصل چند نہایت زبردست اور گرم جوش اشخاص کے سوانح کی شکل اختیار کر لیتی ہے"۔ زیادہ سن رسیدہ طلبہ ۱۰۷
ایسے مصنفوں کی کتابوں پر بحث و گفتگو کر سکتے ہیں جنھوں نے اصلاح کا کام انجام دیا مثلاً چارلز ڈکنز۔ ہیریٹ بیچر سٹو، سوسل بی انتھونی، جین ایڈمز، لنکن سٹیفنز۔

طلبہ کو قانونی اور مجلسی تبدیلیوں پر غور و فکر میں امداد دینے کے کئی طریقے ہیں۔ ایسی امداد کے چند نمائندہ ماخذ ذیل میں درج ہیں جن سے انٹرمیڈیٹ اور جونیر ہائی سکول میں مختلف طریقوں سے کام لیا جا سکتا ہے مثلاً جنی ویو فاسٹر کی کتاب "برتھ ڈیز آف فریڈم"۔ رچرڈ بی مارس کی تصنیف "دی فرسٹ بک آف کونسٹی ٹیوشن" ہنری سٹیل کومیجر کی تصنیف "دی گریٹ پروکلیمیشن"۔

پہلی کتاب یعنی فاسٹر کی تصنیف قانونی نشو و ارتقا کا سلسلہ پیش کرتی ہے مثلاً شارل مین کے قوانین، اینگلو سیکسن قوانین، میگنا کارٹا وغیرہ۔ "دی فرسٹ بک آف کونسٹی ٹیوشن" میں مختلف ریاستوں اور سلطنتوں کے دساتیر کی کیفیت بیان کی گئی ہے پھر بتایا گیا ہے کہ وفاق اعلیٰ کی دفعات کیا ہو سکتی ہیں نیز اینا پولس اور فلاڈلفیا میں جو کنونشن ہوئے تھے، وہ کیا تھے۔ اسی طرح نیو جرسی پلین، ورجینیا پلین، بڑی مفاہمت، دستور کی تصدیق کے لیے کش مکش۔ ورجینیا اور نیو یارک کے مباحث، دستور کا قبول، حقوق کا مسودہ اور ترمیمات پر سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔ کومیجر کی "دی گریٹ پروکلیمیشن" میں وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں، جن سے غلاموں کی آزادی کا اعلان ہوا اور پھر دستور میں تیرھویں ترمیم کی گئی۔

تبدیلی کا ایک نہایت اہم پہلو جسے ہمارے سکولوں میں معنی خیز تعبیر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے وہ بنیادی تاریخی تبصرہ ہے کہ بعض چیزیں دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ قائم و استوار رہتی ہیں اگرچہ

---

[1] ہالینڈ کا مشہور سائنسدان (۱۶۳۲ – ۱۷۲۳ء)۔

[2] یہ فوج میں سرجن تھا (۱۸۵۱ – ۱۹۰۲ء)۔

اس کے لیے دلائل نہ واضح ہوتے ہیں نہ مطابق - تبدیلی ہر وقت ہوتی رہتی ہے - یہ نسل بہ نسل یا مقام بہ مقام ایک حیثیت سے پیش نہیں کی جا سکتی - کسی خیال ، قدر ، عقیدے ، عمل اور ادارے وغیرہ کی استواری اسی امر کی ضمانت نہیں کہ وہ اچھی یا با اثر ہے اور نہ تبدیلی کو ہر حال ترقی کا ہم معنی قرار دیا جا سکتا ہے -

معلّم کے لیے طالب علم کو استواری کا تصور دینے کی ایک ممکن شکل یہ بھی ہے کہ بہت سی لکھی ہوئی چیزوں کی نقلیں پیش نظر لائی جائیں مثلاً پوسٹر ، اخبار ، میگزین ، کتابیں ، خطوط ، روزنامچے ، تقریریں ، دستاویزیں وغیرہ - یہ پیش کرکے طلبہ سے کہے کہ اس امر پر بحث کرو کہ کوئی شے کتنی مدت تک خاصی تعداد کو متاثر کر سکتی ہے اور اس کے اثر کی کیفیت کیا ہوتی ہے - ذیل میں صرف چند چیزیں درج ہیں جنھیں سرسری طور پر رکھ دیا گیا ہے اور انھیں طلبہ کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے -

کسی روزانہ اخبار کا کوئی تراشہ جس میں ایک دن کے لیے کسی مقامی سٹور کے نیلام کا اشتہار دیا گیا ہو -

عہد نامہ قدیم کا ایک نسخہ -

اقوام متحدہ کے منشور (چارٹر) کا ایک نسخہ -

کسی میگزین کا کوئی مقالہ جس میں ایسے مسئلے کے متعلق حکومت کے کسی بڑے امیدوار سے انٹرویو لیا گیا ہو ، جو فی الوقت عوام کے سامنے ہو -

کسی صدارتی امیدوار کی تقریر کی نقل جو ہار رہا ہو -

جنگی تمسکات کی فروخت کے لیے کسی پوسٹر کی ایک نقل -

مسودۂ حقوق کی ایک نقل -

جنرل میکالف نے ۱۹۴۴ کے کرسمس پر مبارکباد کا جو پیغام ۱۰۱ ایر بورن ڈویژن کے ارکان کو بھیجا تھا ، اس کی ایک نقل -

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی مستقل حیثیت اور بعض کے اثرات کے متعلق اتفاق رائے نہ ہوگا - معلّم کو خود یہ حقیقت واضح کر دینی چاہیے جب وہ ان چیزوں کی نمائش کر رہا ہو لیکن طلبہ یقینی طور پر دیکھ لیں گے ، کہ ایسی چیزوں اور مستقل حیثیت کی چیزوں میں اختلاف رائے کا دائرہ بہت وسیع ہے -

ابتدائی اور ثانوی درجوں کے طلبہ کے رُوبرو وقت بہ وقت اور مقام بہ مقام تبدیلی کی شرح میں اختلاف واضح کیا جا سکتا ہے - معلّم کے لیے ایک امکان یہ ہے کہ فاسٹر کی کتاب " جارج واشنگٹنز ورلڈ " پڑھ کر جماعت کو سنائے - اس کی ترتیب زمانی میں تبدیلیوں کا معاملہ بطور خاص سازگار ہو سکتا ہے - فاسٹر نے واشنگٹن کی زندگی کو مرکز بنا کر بہت سے معاملات پیش کیے ہیں ، مثلاً دخانی انجن کی ایجاد ، کُک کے ذریعے سے آسٹریلیا کی دریافت ، نپولین کی پیدائش - کیلیفورنیا میں آبادکاری کا آغاز وغیرہ - ساتھ ہی دنیا کے

مختلف حصوں میں یہ سب کچھ ہوتا رہا (پروشیا، انگلستان، فرانس، اٹلی، ہسپانیہ، ترکی، پولینڈ، روس، چین، جاپان وغیرہ)۔ یہ اقتباس فاسٹر کی تصنیف کا ایک نمونہ ہے:

"ان برسوں میں انگلستان جو یورپی ساحل سے تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بادشاہی تھی ایسی مضبوط جڑیں لگا رہا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی سلطنت بننے والا تھا۔ ایشیا کے ساحل سے ہٹا ہوا ایک چھوٹا سا جزیرہ جاپان تھا۔ یہ اس طرح گمنامی میں لپٹا ہوا تھا جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے کوئے میں۔ اسے بہت عرصہ بعد یہ معلوم ہوا کہ اسے بھی بڑی بادشاہت بننے کی خواہش ہے۔ اس وقت تک اکتشافات کا دور ختم ہو چکا تھا اور ایسی زمینیں باقی نہیں رہی تھیں جن پر قبضہ کیا جا سکے اور کوئی ان کا مدعی نہ ہو۔" ۱۰۹

فاسٹر کی کتاب پر جماعت میں بحث کی جائے تو طلبہ جلد ہی مختلف معاشروں، قوموں اور براعظموں کے اندر تبدیلی کی مختلف شرح سے جلد آگاہ ہو جائیں گے۔ ہائی سکول کے طلبہ میں معلّم متعدد ثقافتوں کی تبدیلیوں کے مختلف نمونے شروع کر سکتے ہیں۔ تین تین یا پانچ پانچ طلبہ کی کمیٹیاں بنائی جا سکتی ہیں اور انھیں مختلف صدیوں کے متعلق چھان بین سپرد کی جا سکتی ہے۔ ہر کمیٹی ماخذ کی کوئی کتاب سامنے رکھ کر کام شروع کر سکتی ہے۔ مثلاً ولیم لینگر کی کتاب" انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم" پوری دنیا میں تغیرات کے تعیّن کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ یہ کام خاص صدیوں کے تعین سے انجام دیا جا سکتا ہے پھر چھان بین کر کے دوسرے ماخذ دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہی پیمانہ پیش نظر رکھتے ہوئے طلبہ کے گروہ کوئی ایک صدی تجویز کر لیں گے، اور جو تبدیلیاں نمایاں، دلچسپ اور نمائندہ ہوں گی ان کی فہرست بنا لیں گے۔ البتہ طلبہ کو ایسے رفیق مل جانے چاہئیں جو ثقافت بہ ثقافت، اور صدی بہ صدی کی شرح متعیّن کرنے میں مدد دے سکیں۔ مثلاً انھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلمانوں (خصوصاً طلیطلہ اور قرطبہ[1] کے مسلمانوں) اور مسیحی معاشروں میں آٹھویں صدی سے بارھویں صدی تک کیا کیفیت تھی یا مقابلہ کیا جائے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی قرونِ مظلمہ اور محمد[ؐ] سے پیشتر کی صدیوں میں (جسے دورِ جاہلیت کہتے ہیں یعنی جہالت اور ناخواندگی کا دور) کیا کیا کیفیت تھی۔ یہی خطے تھے جنھوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا۔

اسی طرح جونیر اور سینیر ہائی سکولوں کے طلبہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ میں ہر دس سال کے تغیّرات کی چھان بین کر سکتے ہیں ان کے لیے اچھے ماخذ کا کام رچرڈ بی مارس کی کتاب" انسائیکلو پیڈیا آف امیریکن ہسٹری" بھی دے سکتی ہے یا کم از کم اس سے ابتدا میں کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو

---

[1] ہسپانیہ کے مشہور شہر۔

دیکھ چکنے کے بعد اور بہت سی کتابیں مل سکتی ہیں اور طلبہ ایک بہت بڑا اشتہار تیار کر سکتے ہیں، جس میں تبدیلیاں نمبروار درج ہوں گی اور یہ اندازہ ہو سکے گا کہ سالہا سال میں تبدیلیوں کے نشیب فراز کی کیفیت کیا رہی۔ یعنی چوٹیوں اور سطوح ہائے مرتفع اور وادیاں کیا کیا داستان سناتی ہیں۔ بہت سے تحریری مواد
بھی مل سکتے ہیں جن سے پتہ چل جائے گا کہ گزشتہ چند دہوں میں تیزی سے تبدیلیاں کیونکر ہوئیں۔ ١١٠

آخر میں تبدیلیوں کا ایک خاص دائرہ بھی ہے جسے تاریخ کے سلسلے میں دیکھنا چاہیے۔ سینیر ہائی سکولوں کے طلبہ کو یہ بتانا چاہیے کہ تبدیلیاں کیوں ناگزیر ہیں۔ اوّل یہ ایک المیہ ہوتی ہیں، دوم یہ ایک چیلنج کا جواب ہوتی ہیں۔ معلّم طلبہ کے سامنے کوئی ایک اقتباس پیش کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اس پر جواب مضمون لکھا جائے۔ پھر اپنے ہم جماعتوں سے موازنہ افکار کیا جائے۔

"........ یہ عمل لامتناہی ہے۔ جونہی کوئی ایک مقصد حاصل ہوتا ہے تو دوسرے اور زیادہ اعلیٰ مقصد کے لیے جدّوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ برابر اسی طرح جاری رہتا ہے۔ انسان کبھی امن چین سے نہیں بیٹھ سکتا کبھی دنیا پر نظر ڈال کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اچھی ہے۔ چونکہ کمال اور حقیقت کی جستجو لامتناہی ہے ان کا تعاقب جاری رکھنا الم انگیز بھی ہے اور نشانِ بہادری بھی......"[1]

تاریخ انسانوں کو ممکن سے آگاہ کرتی ہے نہ کہ اغلب سے۔ انھیں موقع دیتی ہے کہ معقول متبادل چیزوں میں سے جو وقتی طور پر موجود ہوں کوئی ایک منتخب کر لی جائے۔ تاریخ غیر متبدل قوانین پیش نہیں کرتی جو پہلے سے موجود ہوں یا ناگزیر سمجھے جائیں اور ان پر فیصلوں کا انحصار ہو:

"........ کوئی فرد خاص موقع پر کیا کر سکتا ہے..... کیا وہ محصور ہے لیکن پہلے سے اس کے متعلق کوئی فیصلہ موجود نہیں۔ انسانوں کے تعاون سے تاریخ میں ہر چیز پیدا ہوتی ہے۔ بہت کم انسان ہیں جو پہلے سے انھیں دیکھ لیتے ہیں کہ ہم جو کچھ کریں گے اس کے جواب میں دوسرے کیا کریں گے پورے عمل کا نمونہ کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ نہ تاریخ کا ماخذ پہلے سے طے شدہ ہے۔ اس میں ترقی کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور رجعت قہقری بھی ممکن ہے کیا تاریخ کا کوئی خاص معنی ہے؟ اگر ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں جو کچھ پیش آتا ہے نتیجے کے طور پر پیش آتا ہے جسے عموماً قبل از وقت دیکھا نہیں

---

[1] ایجوکیشن فار اے نیو مورالیٹی"۔

جا سکتا۔ اگر تاریخ مقتل ہے جہاں انسانی نسلیں ذبح کی جاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں یا سب لوگوں نے جو کچھ کیا اس لیے نہیں کہ وہ مجبور تھے یا دنیا کی روح کی مکّاری کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔[سلہ]"

کونٹ، ہیگل، مارکس، اینگلز، ٹائن بی اور دوسرے یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ ہمارے سامنے تاریخ کا ایک وسیع نمونہ کھلا ہوا ہے جس سے ماضی کے بہت سے معاملات کی توضیح ہو جائے گی، اور مستقبل کے لیے ہدایت کی راہیں مل جائیں گی۔ ان سب نے تاریخ کے لیے خاصے مواد فراہم کیے، لیکن اکثر معروضی مؤرخ یقین نہیں کر سکے کہ ایسے نمونے موجود ہیں۔ انسانیت ہمیشہ ایسی حالت میں رہتی ہے جہاں نئے اور زبردست فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ ان فیصلوں پر اگر ماضی سے کوئی روشنی بھی مل سکے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی وجہ سے کیے گئے۔ کرین برنٹن نے لکھا ہے کہ لوگوں کو ہمیشہ محسوس ہوتا
111 رہا کہ انھیں خوفناک حالت سے سابقہ پڑا ہے لیکن بیچ میں بے شمار ممکنات بچاؤ کے نکل آتے ہیں۔ ہم تاریخ کے کتنے ہی ماہر بن چکے ہوں لیکن اب تک اپنے آپ کو ایک بحران کے بعد کسی دوسرے پیچیدہ اور نازک بحران سے دوچار پاتے ہیں۔

اس کا مطلب یقیناً یہ نہیں کہ انسان ماضی کے اسباب سے فائدہ نہیں اٹھاتا یعنی وہ تاریخ نہیں سیکھ سکتا لیکن اصل معاملہ (لوئی گاٹس چاک کے الفاظ میں) کہا نہیں جا سکتا کہ وہ فلاں کام کرے گا، یا نہیں کرے گا۔

اس اعتبار سے تمام تاریخی فیصلے محلِّ نظر سمجھے جاتے تھے جیسے کہ آجکل کے فیصلے سمجھے جاتے ہیں (یہ کل کی تاریخ بن جائیں گے) یہ فیصلے بھی محلِ نظر ہیں۔ معاصر انسان ہی زمانۂ ماضی کے انتخابات کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں اور وہی آج کے فیصلوں کے مقابلے میں معنی خیز متبادل ڈھونڈ سکتے ہیں (جیسا کہ شیکسپیئر نے جولیس سیزر میں کہا ہے) کہ اگر میں نے نکمّا انتخاب کیا تو پیارے بروٹس اس کے ذمہ دار ہمارے ستارے نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو افراد اس زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے جب ہم نے نہایت اہم اور تاریخ کے ہنگامہ خیز دوروں میں فیصلے کیے تو وہ افراد بہرحال افراد تھے۔ انھیں نے مختلف متبادل راستوں میں سے عمل کا ایک راستہ انتخاب کر لیا لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہی راستہ ان کے لیے مقدر تھا۔ ایسی چیزوں کے متعلق چھان بین مطلوب ہو تو امریکہ میں لوگوں کو مغربی جانب حرکت اور آبادکاری ہی کرنی چاہیے۔ مثلاً جو بچے آجکل انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں پڑھتے ہیں ان کے دل پر یہ اثر چھا ہوا ہے

سلہ فلاسفی آف ہسٹری۔

کہ جس زمانے میں نئی نئی آبادکاریاں ہو رہی تھیں، اس زمانے میں گھر اور فارم فروخت کر کے سامان باندھ کر مغربی جانب کا رخ کر لینا ایک طبعی امر تھا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا خاندان چلے جا رہے تھے اور اس پر نظر ثانی کے لیے تیار نہیں لیکن حقیقت میں مغربی جانب کی نقل و حرکت بہت ہی پُر پیچ معاملہ تھی اس میں بہت سے عاملوں پر غور کرنا پڑتا تھا اور فیصلہ اتنا آسان نہ تھا جتنا سمجھا جاتا ہے۔

مغربی جانب کی نقل و حرکت کے مطالعے میں ایک گروہ کو بتایا جا سکتا ہے کہ فرض کرلو، وہ لوگ نیو انگلینڈ کے کسی بنجر فارم کے بجائے چٹان پر بیٹھے تھے اور یہ ۱۸۶۷ کا معاملہ ہے۔ ایک شام کو ایک بھائی باورچی خانے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک پوسٹر تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا:

"کنزس میں فارم اور گھر
تبدیل سکونت کرنے والو اپنے فائدے پر نظر رکھو
فارم تین ڈالر فی ایکڑ کی شرح پر
اور ایک فٹ زمین بھی بنجر یا بیکار نہیں
فارم دس سال کے ادھار پر
خرید پر ایک ہبہ بھی نہ لیا جائے گا
ان زمینوں پر چھ سال تک مالیہ نہیں لگے گا
کاشت کی زمینیں مشرقی کنزس میں
ایچی سن شہر سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر
اتنی ہی مسافت دریائے مزوری سے
یہ آبادکاروں کے حوالے کی جا رہی ہیں جن میں زیادہ منافع ہیں
پیسیفک یونین ریل روڈ کمپنی کی مرکزی برانچ
یہ فارمیں کیکاپو انڈین ریزرویشن میں دے رہی ہے
ایک لاکھ باون ہزار چار سو سترہ ایکڑ
سکول اور گرجے چھ سال محاصل سے آزاد۔"

۱۱۲

کنبے کے افراد آتش دان کے ارد گرد بیٹھے ہیں پوسٹر پڑھا جاتا ہے۔ اس موقع پر معلم طلبہ سے پوچھتا ہے تم کیا سمجھتے ہو کنبے کا جواب کیا ہوگا فوری اور تقریباً سب کا ردِّ عمل عموماً یہ ہوگا کہ وہ لوگ مغربی جانب کنزس چلے جائیں گے۔ پھر ممکن ہے معلم یہ کہے کہ ذرا جس قسم کی گفتگو کنبے میں پیش آئی ہوگی

اس کا سراغ لگائیے۔ مختلف طلبہ کے نزدیک کنبے کے افراد کے جوابات اس قسم کے ہوں گے :

"دادا جان : آپ بہت بوڑھے ہیں اور بہت تھک گئے ہیں سالہا سال گزر گئے آپ کنبے کو یورپ سے یہاں لائے تھے، اس گاؤں میں آباد ہو گئے۔ بچوں کو پال پوس کر اتنا بڑا کنبہ بنایا۔ آپ کی بیوی یہاں فوت ہوئی۔ یہیں آپ نے اسے دفن کیا۔ آپ کے نزدیک یہ دنیا کا عزیز ترین مقام ہے ....

باپ : فارم میں پیداوار کی قوت گھٹ گئی۔ ایک سال کے بعد آپ کو یہ سب کچھ بیچ کر کوئی دوسرا کام سنبھالنا پڑے گا۔ آپ مدت سے اپنے زرخیز فارم کے لیے کوشاں تھے، اور یہ چیز آپ کے نزدیک دنیا میں سب سے عزیز تھی ......

ماں : آپ جانتی ہیں کہ فارم سے کچھ فائدہ نہیں ہو رہا۔ آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ غالباً ہمیں کنزس جانا پڑے گا لیکن آپ کو یقین نہیں کہ پوسٹر میں جو کچھ لکھا ہے وہ حرفاً حرفاً درست ہے۔ آپ اسے صحیح نہیں سمجھتیں، آپ کے دل میں شک ہے اور ثبوت کی خواہاں ہیں ......

سب سے بڑا بیٹا : مہم جوئی اور ہنگامہ آرائی زندگی کی سب سے اہم چیزیں ہیں۔ آپ سفر شروع کرنے کے لیے انتظار نہیں کر سکتے ....

سب سے بڑی بیٹی : آپ کو پاس کی فارم کے ایک لڑکے سے محبت ہے۔ آپ کو امید ہے کہ چند سال میں اس سے شادی کر لیں گی لہٰذا آپ جانا نہیں چاہتیں ....

....

دس سال کی لڑکی : بیٹی تم بیمار رہتی ہو، اور سفر کی صعوبت برداشت نہیں کر سکتیں تم صرف امن، سکون، خاموشی، کتابوں اور گھر کی راحت کی جویا ہو....

.........."

جب کھیل کا آخری ڈراما شروع ہوتا ہے تو فیصلہ اس سے بہت زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جتنا ابتدا میں بچوں نے سمجھا تھا لہٰذا متبادل مشاغل زیرِ غور لائے جاتے ہیں اور طلبہ نے ابتدا میں ماضی کا جو سادہ سا تصور کر لیا تھا اس کی ایک حد تک اصلاح کی جاتی ہے۔ مفروضہ صورت حال پر بحث و غور کے بعد معلّم کے لیے مناسب ہوگا کہ ہیملن گارلینڈ کی کتاب "اے سن آف دی مڈل بارڈر" کے بعض حصّے پڑھے جائیں۔ یہ ایک حقیقی کنبے کے مغربی جانب کوچ کرنے کا ایک صحیح اور ہنگامہ خیز بیان ہے۔ اس میں فیصلے کے نتائج بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد فقروں کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے :

دادا جان بولے۔ اچھا ڈک تم مغربی جانب کوچ کر جانے کا منصوبہ بنا رہے ہو۔

ہاں۔ جب میرے سؤر اور غلّہ بک جائیں گے۔ میں آئی اووا[1] میں اپنے نئے فارم پر چلا جاؤں گا۔

دادا جان نے بڑی افسردگی کے انداز میں کہا۔ اسی پرانی آرام گاہ سے چمٹے رہنا تمھارے لیے بہتر تھا اس سے اچھی جگہ تمھیں نہ مل سکے گی۔

میرے باپ کو اس پر ایک حد تک غصہ آگیا۔ یہ جگہ انھی کے لیے اچھی ہے جو وادی کے وسط میں ہموار مقام پر رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے کیونکر اچھی ہے جو پہاڑوں کے دامن میں بیٹھے ہیں۔ کاش آپ نے وِنی شِک میں میرا فارم دیکھا ہوتا۔ کوئی چھوٹی موٹی پہاڑی ایسی بھی نہیں جس پر ہمارا کوئی لڑکا نہ چڑھ سکے۔ یہ مرغزار کے عین دائیں کنارے پر ہے۔ وہاں پانی کا ایک چشمہ بہتا ہے۔ درختوں کا ایک جھنڈ ہے اور وہ عین اسی مقام پر ہے جہاں اسے ہونا چاہیے، ایسے مقام پر نہیں جہاں سے اسے کاٹنا پڑے۔

دادا جان بولے۔ لیکن تمھارا اصل وطن یہ ہے۔ تم نے یہاں شادی کی۔ تمھارے بچّے یہاں پیدا ہوئے۔ تمھیں ایسے دوست مغربی جانب کبھی نہ مل سکیں گے جیسے یہاں نیشونا ک میں ملتے ہیں اور تمھاری بیوی اپنے کنبے سے جدا ہو جائے گی۔

میرا باپ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔ اوہ تم سب لوگ ہمارے ساتھ آؤ گے۔ بیوی بھی بڑی خوشی سے تیار ہے۔ ولیم بھی رفاقت اختیار کرے گا۔

بوڑھے دادا جان نے ایک سرد آہ کھینچی اور بولے۔ میں سمجھتا ہوں۔ تم غلطی پر ہو۔ میں اپنی زندگی کے آخری دن یہاں گزارنا چاہتا ہوں، میرے بیٹے اور میری بیٹیاں میرے پاس ہوں۔ یہاں دادا جان کی آواز ذرا درشت ہو گئی۔ انھوں نے کہا ہمارے ملک کی یہ سب سے بڑی لعنت ہے۔ ہر وقت

---

[1] امریکہ کی ایک ریاست۔

نقل وحرکت، ہر وقت نقل وحرکت، اگر میں اوہیو میں رہتا تو ہزار درجے بہتر ہوتا۔ اگرچہ یہ وادی ابتدا میں مجھے بڑی خوبصورت معلوم ہوئی تھی۔"

اسی طرح لارا اینگلز وائلڈر نے روزنامچے کی شکل میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "آن دی وے ہوم"۔ اس میں انیسویں صدی کے ایک خاندان نے جنوبی ڈکوٹا سے مزوری تک سفر کیا تھا۔ اس کی
کیفیت نہایت مؤثر انداز میں صاف اور واضح طریق پر بیان کی گئی ہے۔ ۱۱۴

اس موضوع کے متعلق کام کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو مختلف درجوں پر خاصی معلومات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ تاریخی افسانوں سے کام لینے کا معاملہ ہے۔ فرض کیجیے کہ معلم امریکی انقلاب کے متعلق جماعت کو تعلیم دے رہا ہے۔ وہ طلبہ سے پوچھے گا کہ ایک لمحے کے لیے فرض کر لو کہ ۱۷۷۵ء کا سال ہے اور تم لیکسنگٹن میں رہتے ہو جو ریاست میساچوسٹس میں ہے۔ اچانک ایک نوجوان سوار گاؤں میں پہنچا ہے اور اس نے اپنا گھوڑا روک لیا ہے۔ اس کا سانس پھولا ہوا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ خاصا مضطرب ہے۔ ایک ہجوم اس کے ارد گرد جمع ہو گیا۔ اس موقع پر معلم طلبہ کے روبرو ہوورڈ فاسٹ کی کتاب "اپریل مارننگ" میں سے کچھ اقتباسات پڑھتا ہے جن کا تعلق ۱۹ اپریل ۱۷۷۵ء کے بیانات سے ہے جو لیکسنگٹن سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوار مجمع کے اضطراب افزا سوالات کے جوابات دے رہا ہے:

"اب ایک سوال اور صرف ایک۔ وہ کب چلے؟

میں بتا چکا ہوں کہ وہ دریائے چارلس پر کشتیوں میں بیٹھ رہے تھے اور یہ دس بجے کا عمل تھا۔

گویا تین گھنٹے ہو گئے۔ کیا تم اس وقت تک وہاں ٹھہرے رہے جب تک انھوں نے دریا عبور نہ کر لیا۔ عبور میں کتنا وقت لگا۔

میں اس وقت تک ٹھہرا رہا جب تک ان میں سے پہلا شخص دریا عبور کر کے خشکی پر نہ اتر گیا۔ میں ٹھہرا ہوا تھا کہ انھوں نے مینوٹومی کی سڑک پر صف بندی کر لی۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ زیادہ نہ ٹھہرنا چاہیے۔

....

پادری نے سوال کیا۔ کیا تم وہاں سے سیدھے یہاں آئے ہو۔

خدا کی قسم سیدھا آیا۔ جھوٹ بولنے والے پر لعنت۔ سڑک پر اس قدر اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ مجھے اپنی گردن ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ بہر حال میں یہاں پہنچ گیا لیکن یہاں رات نہیں گزار سکتا۔ ہم چار آدمی تھے۔ ایک نے

میڈفورڈ کا راستہ لیا۔ دوسرے نے بروک لائن کا۔ تیسرا واٹر ٹاؤن چلا گیا۔ آپ اس کا مطلب سمجھے۔ یہ تمام سڑکیں کنکورڈ جاتی ہیں۔ یہاں سٹورز ہیں (ذخیرے)۔ کسی نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا اور یہ اطلاع دے دی کہ کمیٹیاں کنکورڈ پہنچی ہوئی ہیں تاکہ جو کچھ ہاتھ لگتا ہے اٹھا کر لے جائیں۔ اس وجہ سے وہ سب آ رہے ہیں اور آپ یقین فرمائیں کہ ان کا نصب العین کنکورڈ ہے۔ . . . .

. . . .

. . . . فوج کتنی ہے . . . . یہ ہمیں معلوم ہونا چاہیے . . . .

. . . .

مسٹر یہ رات کا وقت تھا اور ہم چھپے ہوئے تھے۔ کیا اس حالت میں تم یہ توقع رکھتے تھے کہ میں فوجیوں کو گنوں گا۔

ایک ہزار؟ دو ہزار؟

کم از کم ایک ہزار۔ ممکن ہے دو ہزار ہو یا اس سے بھی زیادہ۔ ان کے پاس کشتیوں کی جو قطار تھی وہ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر کشتی سرخ وردی پہنے ہوئے سپاہیوں سے بھری ہوئی تھی۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ مسٹر میرے گھوڑے کی باگیں چھوڑ دیجیے۔"

آگے بڑھنے سے پہلے معلّم کو جماعت سے کہنا چاہیے کہ آبادکاروں کے ردِّ عمل کے متعلق امکانی
قیاسات کرلیں۔ سوچ لیں کہ وہ کیا کیا تدبیریں اختیار کر سکتے تھے۔ طلبہ کے جوابات کچھ بھی ہوں ۱۱۵
لیکن فاسٹ کی کتاب کا بیان زیرِ بحث رہنا چاہیے یعنی اس رات کو کیا کچھ پیش آیا۔

"زیرِ بحث چار صورتیں تھیں۔ جونس پارکر چاہتا تھا کہ ملیشیا کو فوراً جمع کر لینا چاہیے چونکہ ہم نے بک مین ٹیورن کے تہ خانے میں بارود اور گولیاں جمع کر رکھی تھیں۔ پارکر کی رائے یہ تھی کہ وہیں ہمیں اکٹھے ہونا چاہیے . . . .

. . . .

اس کے برعکس کوپر کی رائے یہ تھی کہ ملیشیا کو جمع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے نزدیک ضروری تھا کہ غیر عسکری وضعیت اختیار کی جائے۔ اس کی

رائے یہ تھی کہ سوئے ہوئے شہریوں کو مسلح کر دینے کے خطرے سب پر واضح ہو جائیں۔ اس طرح کسی نہ کسی کو نقصان پہنچے گا۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ گرجے میں کمیٹی کے ممبروں کا اجلاس ہو............
....

پادری کی رائے یہ تھی کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں حقائق کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ میرا خیال یہ تھا کہ دعا بھی کرنی چاہیے۔ بالفعل میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کوئی عملی طریقہ اختیار کرنا چاہیے..................
....

سیم ہاڈلے نے چوتھی تجویز پیش کی۔ اس نے کہا معمولی سے واقعے کے سلسلے میں خواہ مخواہ ہنگامہ آرائی کی جا رہی ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں آتا کہ برطانوی فوج بوسٹن کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس "لغو قصّے" کو ہرگز درست نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ بالکل بے معنی ہے۔ جو بھی انگریزوں کو جانتا ہے وہ بتائے گا کہ انگریز رات کو کوچ نہیں کرتے..................
....”

اس قسم کے حالات پر بحث و گفتگو جماعت کے طلبہ کے لیے فائدہ مند ہوگی۔ بہر حال یہ کھلا ہوا مسئلہ تھا یعنی یہ کہ کیا کرنا چاہیے؟ لڑنا چاہیے؟ گفت و شنید مناسب ہوگی؟ بھاگ جانا چاہیے؟ یا اس وقت تک ٹھہرے رہنا چاہیے۔ جب تک آتش باری کی نوبت نہ آئے؟ وغیرہ۔ یہ معاملہ لیکسنگٹن کے لوگوں کو اسی دن اور اسی وقت طے کر لینا چاہیے تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جو کچھ انھوں نے اس روز کیا، وہ تاریخ کا سرمایہ بن جائے گا۔

ایسے کھلے معاملات میں جو زیادہ پُر پیچ نہ ہوں اور ان کا تعلق ہمارے دور سے ہو، فیصلہ کر لینا اور بھی مناسب ہے۔ ایلیمنٹری جماعت سے سینیر ہائی سکول تک کے سامنے موجود مسائل کی ایک فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً سینیر ہائی سکول کے طلبہ غالباً اس مسئلے کو سامنے لے آئیں کہ ویٹ نام کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ کانگو کے معاملات کس طریقِ عمل کے متقاضی ہیں۔ ہمیں اقوام متحدہ میں رہنا چاہیے یا نہ رہنا چاہیے؟ کیا ہمیں جوہری توانائی کے تجربات بند کر دینے کے معاہدے کا پابند رہنا چاہیے؟ کیا ہمیں کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ میں آنے کا موقع دے دینا چاہیے؟ وغیرہ۔ طلبہ کو کچھ وقت کے لیے اخبار دن، میگزینوں یا دوسرے وسائلِ معلومات کا مطالعہ جاری رکھنا چاہیے اور ان تمام مآخذ پر نظر رکھنی چاہیے، جہاں سے اختلافی تجویزیں یا عمل کے متبادل منصوبے مل سکتے ہوں خصوصاً وہ منصوبے

جو وقائع پر مبنی ہوں۔ ہر مسئلے کے مجوزہ حل ساتھ رکھنے چاہئیں۔ یہ فہرست جتنی زیادہ طویل ہوگی اتنا ہی اچھا ہوگا۔ بہت سے مجوزہ حل سامنے رکھ کر احتیاط سے ان کا جائزہ لیا جائے گا تو واضح ہوگا کہ ان میں سے بیشتر اپنی توثیق کے لیے تاریخ پر منحصر ہیں مثلاً ویٹ نام کے مسئلے پر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر حملہ آور کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت دے دی جائے تو اس میں توسیع تسلط کی بو تیز تر ہوجائے گی، اور وہ ۱۱٦
مطمئن نہیں رہے گا۔ اس کے برعکس تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایشیا کی اکثر قومیں مغربی طاقتوں کی مداخلت پر رنجیدہ ہوتی ہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ مختلف مواقع پر زیادہ سے زیادہ قوت کا استعمال دشمن کی طرف سے بھی زیادہ سے زیادہ قوت لانے کا موجب ہوجاتا ہے۔ ویٹ نام کی یہی کیفیت ہے پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی جنگ اس وقت تک کامیابی کی منزل پر نہیں پہنچ سکتی جب تک عوام کی حمایت حاصل نہ ہو۔ اگر طلبہ کی جماعت فی الوقت اپنے آپ کو انفراداً یا اجتماعاً فیصلہ کن کردار پر کاربند سمجھے گی تو فیصلے کی مشکلات زیادہ واضح ہوجائیں گی یعنی تاریخ جو کچھ بتاتی ہے اس میں سے کون سا نظریہ صحیح یا بہتر ہے۔ اسی طرح طلبہ کو ان مسائل کا بھی جائزہ لینا چاہیے جن سے واشنگٹن، لنکن، ولسن، ٹرومین، کینیڈی وغیرہ اپنے اپنے زمانوں میں دوچار ہوئے۔ ان سب کو مشکل فیصلے کرنے پڑے اور سب کے سامنے متعدد متبادل طریقے تھے جن میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا تھا۔

غالباً دورِ حاضر کا کوئی واقعہ نہیں جس سے واضح ہوسکے کہ آجکل کے مقتدرانہ سیاسیات سے تعلق رکھنے والے تاریخ کے قطعی اور غیر متبدل قوانین ناپید ہیں جتنا کہ ۱۹۶۱ - ۱۹۶۲ء میں کیوبا کے بحران کے متعلق پیش آیا تھا۔ سینیر ہائی سکول کے طلبہ اخباروں اور رسالوں کے مطالعے سے اکتوبر ۱۹۶۲ء کے نازک دور کے حالات بہ آسانی فراہم کرسکتے ہیں۔ جماعت غالباً سب سے پہلے یہ کوشش کرے گی کہ جمہوریہ امریکہ کے صدر اور اس کے مشیروں کے سامنے عمل کے کون کون سے ممکنات ہوسکتے تھے۔ مندرجہ ذیل طریقے ان میں ضرور شامل ہوں گے :

۱۔ پورا معاملہ اقوام متحدہ کے سامنے پیش کردیا جائے۔

۲۔ جو میزائلیں کیوبا میں موجود ہیں انھیں ناگہانی فضائی حملے کے ذریعے سے تباہ کردیا جائے۔

۳۔ فوج اتنی بڑی تعداد میں پہنچادی جائے جو کامیاب حملے کی ضمانت بن سکے۔

۴۔ کیوبا تک چیزوں کی بہم رسانی کے تمام وسائل روک لیے جائیں یعنی پابندی لگادی جائے یا قرنطینہ قائم کردیا جائے۔

۵۔ کیوبا کو موجود میزائل رکھنے کی اجازت دے دی جائے، لیکن واضح کردیا جائے، کہ آئندہ مغربی دنیا میں مداخلت ریاستہائے متحدہ امریکہ کبھی برداشت نہ کرے گی۔

طلبہ کو ہر معاملے میں روس کے ردِ عمل کے ممکنات کا جائزہ لینا چاہیے یعنی مجوزہ اقدامات میں روس کی ردِ عمل کیا ہوگی۔ خصوصیت سے طلبہ کی جماعت کو جائزہ لینا چاہیے کہ خود ہماری قوم کی روش کیا ہوگی اس امر کا اندازہ ۱۵ر اکتوبر سے یکم نومبر ۱۹۶۲ء تک کے اخبارات سے ہو سکتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہماری قوم کے اکثر افراد کے دلوں میں خوف اور بے یقینی موجود رہی۔ اس موقع پر بہت کم امریکی یہ بتانے کے لیے تیار تھے جب تک ان پر یہ نہ واضح ہو جاتا کہ روسیوں کی روش کیا ہوگی۔ تاریخ نے واضح کر دیا تھا کہ ان کا جواب کیا ہوگا۔ کیوبا کی ناکہ بندی کرنے کے متعلق جماعت کے طلبہ مطالعہ کر رہے ہیں اور ان کی رائے یہ معلوم ہوتی کہ میزائلیں لانے والے روسی جہازوں کو راستے میں روک لیا جائے
لیکن روس نے فیصلہ کر لیا کہ ایسے تمام جہاز لوٹ جائیں اور امریکہ کے ساتھ مسلح جنگ کی نوبت نہ آئے ۱۷
اس پر سب کو اطمینان ہوا۔ بظاہر بہت دانشمندانہ فیصلہ ہو گیا تھا اور امریکہ نے جو تدابیر اختیار کی تھیں وہ کامیاب ہوئیں لیکن جو بھی واقعہ کے متعلق معاصرانہ بیانات پڑھے گا اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ تاریخ نے جو ضمانتیں دی تھیں ہمارا عمل ان سے مختلف تھا اور کئی ایسے متبادل راستے تھے جو ہمارے عمل یا روسیوں کے فیصلۂ مراجعت کو بدل سکتے تھے۔

بہت سے لوگوں کے لیے تاریخ بظاہر تخلیقی فکر کے لیے ایک بند ہے نئے افکار پر اثر نہیں ڈالتے۔ مختلف عمروں کے طلبہ کو امداد دینے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ مختلف دوروں میں جو مثبت ممکنات رہی ہیں، انھیں سمجھنے میں مدد دی جائے بشرطیکہ انسان ان کا صحیح تصور کر سکے۔ ان لوگوں کے بیانات کا تجزیہ کیا جائے جو نیک نیت تھے مگر تصور سے عاری تھے اور انھوں نے مستقبل کے متعلق جو تصور کیا وہ وقت کی رسمی دانش کے مطابق تھا۔ فرض کر لیجیے کہ جماعت ایسے عنوانوں کا مطالعہ کر چکی ہے جیسے طیاروں، ٹیلی وژن، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون وغیرہ کی ایجادات یا امریکی انقلاب کے کلیدی واقعات، سکولوں کی علیحدگی کا خاتمہ، مجلسی تحفظ کا ارتقا، مفت لازمی تعلیم سب کے لیے وغیرہ۔ معلم کو چاہیے کہ مندرجہ ذیل عنوان چاک سے تختۂ سیاہ پر لکھ دے :

"تاریخ ہمیں کیا سکھاتی ہے ؟"

(اس عنوان کے تحت ذیل کی وضع کے سوالات لکھے جا سکتے ہیں)

۱۔ کیا انسان ہوا سے زیادہ بھاری طیاروں میں پرواز کر سکے گا ؟
۲۔ کیا انسان ہوا کے ذریعے سے دور دور تک تصویریں بھیج سکے گا ؟
۳۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک دیا سلائی کی رگڑ سے پورا شہر روشن ہو جائے ؟
۴۔ کیا امریکہ سب کے لیے مفت تعلیم کا انتظام کر سکے گا ؟
۵۔ کیا امریکہ میں بھی کبھی یہ نظارہ ممکن ہوگا کہ تمام نسلیں بنیادی علیحدگی کے

بغیر سکولوں میں تعلیم پا سکیں ؟

۶۔ کیا امریکی نو آبادیاں انگلستان کو شکست دے کر آزادی حاصل کر سکیں گی ؟"

کمیٹیاں یا طلبہ کے گروہ ایک سوال کو چھان بین کے لیے چن سکتے ہیں۔ بہر حال سوال کا جواب ضرور دینا چاہیے اور اس کے لیے تاریخ کی شہادت لازم ہے اور وہ جواب اس رنگ میں نہ ہونا چاہیے جو بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں رہنے والے لوگوں کی طرف سے ہو بلکہ ان لوگوں کی طرف سے ہونا چاہیے جو زمانۂ ماضی میں مختلف اوقات پر زندگی بسر کرتے رہے مثلاً جو گروہ ہوا سے بھاری چیزوں میں پرواز کی صلاحیت کا جائزہ لے رہا ہو وہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس کا ہونا چاہیے۔ تمام شہادتوں کو اکٹھا کر چکنے کے بعد تاریخ ہمیں کیا بتاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے کے اکثر اصحاب قائل نہ ہو سکے کہ ہوا سے زیادہ بھاری چیز میں پرواز ممکن ہے تاہم تھوڑا ہی عرصہ بعد رائٹ برادران نے تاریخی پرواز میں کامیابی حاصل کر لی۔ لہٰذا جو گروہ اس امکان پر جستجو کر رہا تھا اسے بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس زندگی بسر کر رہا تھا۔

۱۱۸ پلیسی بہ مقابلہ فرگوسن کے مقدمے میں جو فیصلہ سپریم کورٹ نے کیا تھا (۱۸۹۶ء)۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ایسے سکول کا وجود میں آنا مشتبہ ہے لیکن ۱۹۵۴ء میں اسی عدالت نے اپنا پہلا فیصلہ الٹا دینا مناسب سمجھا اور رفتہ رفتہ ملے جلے سکول ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف حصوں میں حقیقتیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔

جس گروہ کا تعلق اس معاملے سے تھا کہ آیا امریکہ کی تیرہ نو آبادیاں برطانیۂ عظمیٰ کو شکست دے سکتی ہیں، اسے تصور کر لینا چاہیے کہ اس کے افراد ۱۷۵۰ء کے آس پاس رہتے ہیں۔ اس زمانے میں نو آبادیوں کا، برطانیہ جیسی طاقت کو شکست دے دینا بہت بعید معلوم ہوتا تھا کیونکہ دونوں کی فوجی اور بحری طاقت کا معاملہ نیز تجربے اور ساز و سامان کے پیش نظر یقینی ہو گا کہ ایسی نامساوی جنگ نو آبادیوں کے لیے تباہ کن شکست کا موجب ہو گی تاہم جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، دوسرے عوامل بروئے کار آتے گئے اور ناممکن حقیقت بن گیا۔

ایسے مسائل کی چھان بین کی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ تاریخ ہمیں کچھ نہیں بتاتی، کیا کرنا چاہیے۔ ہر نئی نسل میں بلکہ ہر نئے دور میں ایسے حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو پیشتر کی نسل کے نزدیک دائرۂ امکان سے باہر تھے۔ تاریخ میں نتیجے کا دروازہ کھلا رکھنے کا تصور بھی اچھی چیز ہے۔ اسی سلسلے میں زیادہ مثبت ذریعہ یہ ہے کہ زمانۂ ماضی کی بعض بڑی بڑی شخصیتوں کے متعلق پوری طرح جائزہ لیا جائے جو عام حدود سے آگے بڑھ کر بھی یہ دیکھنے کے لائق تھے کہ "کیا کچھ ہے" اور "کیا کچھ تھا"۔ پھر

ماضی کے اس علم کی بدولت وہ سب کے لیے کامیاب زندگی کے وسائل پیدا کر سکتے تھے۔ جان ایف کینیڈی نے اپنی کتاب "پروفائلز اِن کریج" میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے افراد کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے جنھوں نے معمولات و روایات سے قطع نظر کرتے ہوئے عموماً بہت بڑی ذاتی قربانیوں کے بعد ملک کی بہبود کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں ماضی کے متعلق بھی احساس تھا اور مستقبل کی معنویت کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ شعور رکھتے تھے۔

سڈنی کنگزلے کا ایک ڈراما ہے جس کا نام ہے "پیٹریٹس"۔ اس کی تمہید میں مصنف نے ایک عظیم القدر تاریخی شخصیت کی عملی مثال دی ہے اور یہ مثال خود ہمارے عہد کے متعلق نہایت گہرے مضمرات سے لبریز ہے۔ اس کا تعلق ٹامس جیفرسن سے ہے۔ ہم اسے ایک جہاز کے عرشے پر کھڑا ہوا پاتے ہیں جو امریکہ جا رہا ہے۔ یہ ۱۷۹۰ء کا واقعہ ہے۔ جیفرسن کو تصور میں اعلانِ آزادی کے لکھنے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایک شخص مسٹر ریڈ اعتراض کرتے ہیں:

"ریڈ: یہ دوسرا فقرہ۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔

جیفرسن: لیکن یہ فقرہ تو پورے مضمون کی جان ہے۔ کیا ہم لوگ ایک ایک انچ کی رفتار سے آزادی پر پہنچیں گے۔

ریڈ: یہ معاملہ ہمیں کہاں پہنچائے گا۔ اس پر متعجب نہ ہونا چاہیے کہ ہم ان لوگوں کو جو جائدادوں کے مالک ہیں شاہ پسندوں کی آغوش میں پہنچا دیں گے۔

جیفرسن: مجھ سے کہا گیا تھا کہ آزادی کا اعلان لکھ دو۔ میں نے لکھ دیا۔ میں نے کوئی نئی چیز پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ امریکی قلب کی آواز ہے ہمارے لوگ اس کے خواہاں ہیں۔

ریڈ: قانونی نقطۂ نگاہ کے مطابق ....

جیفرسن: جو لوگ ترکِ وطن کر کے امریکہ پہنچے، جنھوں نے اپنا پسینہ اور خون بہا کر اسے آباد کیا وہ مزدور تھے، قانون دان نہ تھے۔

ریڈ: نہایت افسوس ہے لڑکے! تمھیں کوئی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔ اگر تاریخ میں ایسی کوئی چیز ملتی ہے تو مجھے دکھاؤ۔

جیفرسن: تاریخ میں اس نئی دنیا جیسی کون سی چیز ہے یا نئی دنیا کے انسان کہاں ملتے ہیں۔ ہمیں ایسی زمین کہاں نظر آتی ہے جسے قدرت نے انسانی حقوق پر مبنی نئے آزاد معاشرے کی تعمیر ۱۱۹

کے لیے مقدر کر رکھا ہو۔ باقی رہا نمونے کا معاملہ تو آؤ ہم خود نمونہ پیش کریں۔ کسی بُری مثال کی پیروی کے بجائے اچھی مثال پیش کر دینا بدرجہا بہتر ہے[۱]"

بنجمن فرینکلن نے بھی تاریخ میں تصادمات و حوادث کا ناگزیر سلسلہ نہیں دیکھا تھا۔ یہی دیکھا تھا کہ رُوئے زمین پر اچھی زندگی بسر کرنے کے امکانات کیا کیا ہیں۔ اس نے ۱۷۸۳ء میں یہ پیغام اپنے ایک دوست کو بھیجا تھا۔ :

"پیسی ۲۷ جولائی ۱۷۸۳ء

بنجمن فرینکلن بنام جوزف بنکس

صلح عود کر آنے پر آپ کے اظہارِ مسرت میں مَیں بھی انتہائی خوشدلی سے شامل ہوتا ہوں۔ امید ہے یہ صلح پائدار و استوار ہوگی اور یہ بھی امید ہے کہ اس دنیا کے لوگ آخر کار عقل اور احساس سے کام لے کر اپنے جھگڑے ایک دوسرے کا گلا کاٹے بغیر ختم کر دیں گے۔ بہرحال وہ اپنے آپ کو دانشمند مخلوق کہتے ہیں۔ میری رائے کے مطابق پہلے کبھی ایسی اچھی جنگ یا ایسی بُری صلح نہیں ہوئی۔ جنگوں پر جو روپیہ صرف ہو رہا ہے اگر یہ سارے کا سارا عوامی فوائد کے کاموں پر صرف کیا جاتا، تو دنیا کے لیے راحت و آسائش کے سامانوں میں کسی قدر اضافہ ہو جاتا۔ زراعت دور دور تک پھیل جاتی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی کھیتی باڑی کے لیے کام میں لائی جاتیں۔ دریاؤں کو کشتی رانی کے قابل بنا لیا جاتا یا انھیں نہروں کے ذریعے سے ملا دیا جاتا۔ پُل تعمیر ہو جاتے۔ آبی گزرگاہیں بن جاتیں۔ نئی سڑکیں وجود میں آ جاتیں۔ رفاہِ عامہ کے اور بہت سے کام ہو جاتے۔ عالیشان عمارتیں نظر آتیں۔ جا بجا اصلاحات ہو جاتیں اور انگلستان بہشت کا نمونہ اختیار کر لیتا۔ جو کچھ پچھلی جنگ میں شرانگیزی کے لیے صرف کیا گیا، وہ لوگوں کی خیر سگالی میں صرف کیا جاتا تو لاکھوں کو فائدہ پہنچتا۔ ہزاروں خاندانوں پر تباہی نازل نہ ہوتی۔ ہزاروں مزدوروں کی زندگیاں ختم نہ کی جاتیں، جو مزدوری کے مفید کام انجام

---

[۱] "دی پیٹریٹس" از سڈنی کنگز لے۔

دیتے .... ہے۔"

اپر ایلیمنٹری جونیر اور سینیر ہائی سکول کے طلبہ فرینکلن کے خط کا مقابلہ دورِ حاضر کی دوسری نمایاں دستاویزوں سے کر سکتے ہیں، مثلاً جوہری توانائی پہ پابندی لگانے کا معاہدہ، حقوقِ انسانی کا اعلان یا اقوامِ متحدہ کے منشور کے اقتباسات۔

مثلاً:

"ہم اقوامِ متحدہ کے لوگ عزم کیے بیٹھے ہیں کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کی لعنت سے بچائیں جو ہماری زندگی میں دو مرتبہ انسانیت کے لیے ناقابلِ بیان مصیبتوں کا باعث بن چکی ہے اور ہم بنیادی انسانی حقوق کے متعلق اپنا عقیدہ از سرِ نو تازہ کرتے ہیں — یعنی انسان کی قدر و قیمت اور وقار کا معاملہ، مردوں اور عورتوں کے حقوق یکساں ہیں۔ چھوٹی اور بڑی قوموں میں بہ لحاظ حقوق کوئی فرق نہیں اور ہم ایسے حالات پیدا کر دینا چاہتے ہیں جن میں انصاف اور معاہدوں کے لیے احترام اور بین الاقوامی قانون کے دوسرے مآخذ قائم رکھے جائیں۔ مجلسی ترقی کو فروغ حاصل ہو۔ وسیع تر آزادی میں زندگی کے بہتر معیار بروئے کار آئیں۔

ان مقاصد کے لیے:

"رواداری سے کام لینا چاہیے اور اچھے ہمسایوں کی حیثیت میں ایک دوسرے کے ساتھ امن سے رہنا چاہیے نیز:

بین الاقوامی امن و تحفظ قائم رکھنے کے لیے اپنی قوت متحد کر دینی چاہیے۔ یہ بھی یقین دلا دینا چاہیے کہ ایسے اصول اور وسائل و قواعد پیشِ نظر رہیں جن کے مطابق مسلح قوت کبھی استعمال نہ کی جائے البتہ مشترکہ مفاد (مفادِ انسانیت) کے لیے حسبِ ضرورت اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی بین الاقوامی نظام کو قوموں کے اقتصادی اور مجلسی ترقی کے لیے استعمال کیا جائے۔

ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی کوششیں

۱؎ "ورکس آف فرینکلن" - جلد دہم ص ۱۴۷، ۱۴۸۔

متحد کر دیں۔

لہذا ہماری حکومتوں نے ان نمائندوں کے ذریعے سے جو سان فرانسسکو میں جمع ہیں۔ جو اپنے پورے اختیارات کی نمائش کر چکے ہیں اور انھوں نے اقوام متحدہ کے موجودہ منشور پر اتفاق کر لیا ہے اب وہ ایک بین الاقوامی تنظیم کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو اقوام متحدہ کے نام سے معروف ہوگی۔

بحث و نظر کا مرکزی نقطہ یہ ہوگا کہ جنگ ناگزیر نہیں نیز اگرچہ تاریخ میں جنگوں کا ریکارڈ برابر چلا جا رہا ہے لیکن کوئی ایسا قانون بھی نہیں جو بتاتا ہو جنگ ضرور ہونی چاہیے اور ہمیں اپنے دور میں (جیسا کہ ہر دور کے لوگوں کا قاعدہ رہا ہے) موقع حاصل ہے کہ نیا راستہ اختیار کر لیں یا پرانے راستے پر قائم رہیں۔

چودھواں باب

معلّموں کے لیے تجویز کردہ طریقے

(۲)

بہترین طریقہ یہ ہے کہ ماضی کو اس کے اپنے حالات کی بنا پر سمجھا جائے۔ تاریخی وقائع کا جائزہ ان معیاروں، قدروں، روشوں اور عقیدوں کی روشنی میں لیا جائے جو ایک خاص وقت میں رائج تھے اور خاص قوم کے لیے تھے انھیں کاملاً بیسویں صدی کے معیاروں کی بنا پر نہ پرکھا جائے۔

"............ اگر ابتدائی دور کے معاشروں کے متعلق اخلاقیات کے اعلیٰ معیاروں کی بنا پر کام لیا جائے۔ جنگ، انقلاب یا ہنگامے کے اوقات میں طبعی روش اور متوازن فیصلوں کی توقع رکھی جائے۔ ایک ملک کے معیاروں، رسموں یا عوامی طریقوں سے دوسرے ملک میں کام لیا جائے۔ کسی انفرادی فعل کو فرد کے تصوّر یا ماحول کو سامنے رکھے بغیر نامناسب قرار دیا جائے۔ بے خبری کے متعلق رواداری نہ برتی جائے جو کسی دوسری ثقافت کے متعلق جامع اور صحیح معلومات نہ ہونے کا نتیجہ ہو۔ یہ اور ایسی دوسری ناکامیاں یعنی اشخاص اور وقائع کو اپنے تاریخی ڈھانچے میں رکھنا لازماً ان موجود دستاویزوں کے سمجھنے میں عموماً کارآمد نہ ہوگا۔ اس سے شخصیتوں اور ضابطوں کے متعلق غلط اندازے کیے جائیں گے۔ [۱]"

ہر نسل نے کسی نہ کسی صورت میں پیشرووں کے بنیادی معیاروں، قدروں اور عقیدوں سے غیر مناسب برتاؤ کیا ہے۔ اس کا اثر رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا۔ جب کوئی شخص تین چار یا زیادہ نسلیں پیچھے جاتا ہے تو روش کے نمونوں میں تغیّر زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح کسی دور کی انسانی

---

۱ : لوئی گوٹس چاک۔ صفحہ ۱۳۶۔

سرگرمیوں اور وقائع کو کاملاً معروضی نقطۂ نگاہ سے سمجھنا زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ جب ہم ماضی کے مطالعے کی کوشش کرتے ہیں تو بیسویں صدی کی ثقافت اس میں رکاوٹ بن جاتی ہے ٹھیک اسی طرح یہ ثقافت غیر مغربی تہذیبوں کے مطالعے میں بھی رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایڈورڈ ایچ۔ کار مشہور مؤرخ تھا۔ جس نے لکھتے ہوئے اس مسئلے کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

> "جو کچھ انگریزی بولنے والے ملکوں میں گزشتہ دس سال کے اندر رُوس کے متعلق لکھا جا چکا ہے اور جو کچھ رُوس میں انگریزی بولنے والے ملکوں کے متعلق لکھا گیا ہے وہ بھی حقیقت نافہمی کے اثرات سے پاک نہیں رہا اور کسی نے یہ خیال نہیں رکھا کہ جو کچھ دوسرے فریق کے دل میں گزر رہا ہے اپنے خیال سے کام لے کر اس کا سرسری اندازہ ہی کر لیا جائے .... تاریخ اس وقت تک لکھی ہی نہیں جا سکتی، جب تک مؤرخ ان لوگوں کے متعلق کسی نہ کسی قسم کا ربط ضبط دل میں نہ پیدا کر لے جن کے متعلق لکھنا منظور ہے۔ [1]"

انٹرمیڈیٹ درجوں کے معلّم نئی دنیا کی آبادکاری کے مطالعے کے سلسلے میں اس فہم و بصیرت کا انتظام کر سکیں گے۔ معلّم اپنی جماعت سے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ فرض کر لیجیے، آپ لوگ ویسا ہی سفر کرنا چاہتے ہیں جیسا انگریزوں نے ۱۶۰۷ء میں جیمز ٹاؤن آتے وقت کیا تھا۔ وہ ایک بے آباد و ویران جگہ پر پہنچے تھے جہاں نہ سٹور تھے نہ بڑی بڑی منڈیاں تھیں نہ دوائیں تھیں۔ مہینوں تک انھیں کسی مدد کی امید نہ تھی۔ سفر سے تقریباً ایک مہینہ پیشتر وہ اشیائے خوردنی، لباس، سروسامان، اسلحہ، خانہ داری کی چیزوں کی فہرستیں بناتے تھے۔ جن کے بغیر نئی دنیا میں زندہ رہنے کی قطعاً کوئی صورت نہ تھی۔ معلّم یہ کر سکتا ہے کہ جماعت سے کہے کہ ہر فرد اپنی فہرست تیار کر لے۔ پھر تمام فہرستوں کو اکٹھا کر کے چاک سے سیاہ تختے پر لکھ دیا جائے، جیسا کہ بچّے لکھتے ہیں۔ جب جماعت ضرورت کی تمام چیزوں کی فہرست بنا لے گی تو معلّم کہہ سکتا ہے کہ اسے خوب احتیاط سے دیکھ لیا جائے۔ یہ چیزیں تھیں جو عموماً نئے آبادکار ۱۲۲
اس دور میں اپنے ساتھ لاتے تھے۔

---

[1] : کار : "وٹ از ہسٹری" ، صفحہ ۲۷۔

(سامان کی یہ فہرست ۱۶۲۲ء میں لندن میں شائع ہوئی تھی)

پوشیدنی

ایک منمتھ کیپ
تین قمیصیں
ایک ویسٹ کوٹ
ایک سوٹ کینوس کا
ایک سوٹ فرائز کا
ایک سوٹ کپڑا
تین جوڑے آئرستانی جرابوں کے
چار جوڑے جوتے
ایک جوڑا گارٹر
ایک جوڑا کینوس کی چادروں کا
تین سو پندرہ انچ کینوس بستر وغیرہ کے لیے
ایک نمدہ بستر کے لیے جو دو آدمیوں کے بستر کا کام دے سکے۔
دو سو پینتیس انچ موٹا کینوس جو دو آدمیوں کے لیے بستر کا کام دے سکے اور اس میں گھاس پھوس بھرلی جائے۔
بحری سفر کے دوران میں ایک موٹا نمدہ دو آدمیوں کے لیے

کھانے پینے کی چیزیں

آٹھ بشل[1] غذا
دو بشل مٹر
دو بشل اوٹس
ایک گیلن اگاوائٹ
ایک گیلن تیل

---

[1] : ہمارے حساب کے مطابق انتیس سیر۔

دو گیلن سرکہ

اسلحہ

ایک پوری زرہ
ایک بندوق جس کی نالی پانچ ساڑھے پانچ فٹ ہو۔
ایک تلوار
ایک پیٹی
ایک بنڈالیری
دس پونڈ بارود
ساٹھ پونڈ گولیاں یا سیسہ، پستول اور بطخیں مارنے کی بندوق۔

اوزار

پانچ عدد چوڑے کدال
پانچ عدد تنگ کدال
دو چوڑے کلہاڑے
پانچ درخت کاٹنے والے کلہاڑے
فولاد کے دو دستی آرے
دو دو دستوں والے آرے
ایک چوکھٹے میں لگا ہوا آرا
دو ہتھوڑے
تین بیلچے
دو چوڑے بیلچے
دو برمے
چھ چھینیاں
دو پرس
دو سوراخ کرنے کے اوزار
دو کلہاڑیاں

دو ہینڈ بل
چکی کے دو پاٹ
ہر قسم کی میخیں
دو میخیں اکھاڑنے والے اوزار

خانہ داری کا سامان

لوہے کا ایک برتن
ایک دیگچہ
ایک بڑا فرائی پین
انگیٹھی نما چولھا
دو دستے والی دیگچیاں
ایک پیکدان
رکابیاں
تاب
لکڑی کے چمچے وغیرہ

معلّم کو طلبہ سے کہنا چاہیے کہ ان میں سے جو جو چیزیں وہ اپنی فہرست یا نقشے میں لکھ چکے ہیں انھیں حذف کر دیں اور جو نہیں لکھیں وہ فہرست میں شامل کر لینی چاہییں۔ ہم تو انھیں بہت ضروری سمجھتے تھے لیکن ابتدائی دور کے آباد کاروں کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ طلبہ بہت سی ایسی چیزیں پیش کریں گے جو ابتدائی دور کے آباد کاروں کے پاس نہ تھیں۔ معلّم ان سے پوچھ سکتا ہے کہ ان میں سے کتنے لوگ اس قسم کا سفر اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں گے جو آباد کاروں نے اختیار کیا۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ اس موقع پر بہت سے طلبہ کی روشش بہ نظر احتیاط کیا ہوگی یعنی اگر جیمز ٹاؤن میں آباد ہونے والے لوگ اتنی تھوڑی چیزیں لے کر ایسے بحری سفر پر روانہ ہو جاتے تھے جو ہمارے دور کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ خطرناک اور آرام و آسائش سے محروم تھا تو کیا یہ لوگ ایسا سفر اختیار کرتے۔ پھر معلّم بچوں سے سوال کر سکتا ہے کہ وہ سوچیں آیا وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ کسی ایسے مکان میں جائیں جو ۱۶۲۰ء کے آس پاس بہت سے انگریز آباد کاروں نے بنا لیے تھے۔ ہم نے جو فہرست تیار کر رکھی ہے ان میں سے کتنی چیزیں ان جھونپڑیوں میں ہوں گی۔ طلبہ کی تیار کی ہوئی

فہرست کے محتاط مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ بہت سی چیزیں جیمز ٹاؤن کے آباد کاروں کو میسّر ہی نہ تھیں جو ہمیں بیسویں صدی میں میسّر ہیں گویا وہ سترھویں صدی میں ان چیزوں سے محروم تھے۔

یہ تفصیلات مندرجہ ذیل وضع کے سوالات سے سامنے آئیں گی :

۱ : اگر میری جونز جو بیسویں صدی میں امریکا کی شہری تھی کوئی ایسا سفر اختیار کرتی، جس میں صرف ابتدائی فہرست کی چیزیں موجود ہوتیں تو کیا اسے کم یا زیادہ تکلیف ہوتی جو پرسلا ایوانز نام ایک انگریز خاتون کو سترھویں صدی میں پیش آئی تھی ؟

۲ : آپ کے خیال کے مطابق زیادہ تکلیف کس کو ہوگی اور کیوں ؟

۳ : کیا میری اور پرسلا دونوں کے لیے ضرور مشکلات ہوں گی ؟

امید ہے طلبہ سمجھ جائیں گے کہ دونوں کے لیے دوستوں، رشتہ داروں اور متعارف مقامات کو چھوڑنا خاصی تکلیف کا باعث ہوگا۔ بیسویں صدی میں سفر کے لیے ایسی سہولتیں اور آسائشیں میسّر ہیں کہ ہمارے لیے یہ سفر بہت زیادہ مشکلات کا باعث ہوگا۔ سترھویں صدی کا مسافر اس سفر کی مشکلات کا اندازہ صرف ان حالات کی بنا پر کرے گا، جو اس کے عہد میں میسّر تھیں۔

پرائمری جماعت کے طلبہ کے سلسلے میں ایک اور ذریعہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے یعنی زمانۂ ماضی کے متعلق تصویریں پیش کی جائیں۔ پہلی اور دوسری جماعت کے طلبہ کو بھی ایسی تصویریں دکھائی جا سکتی ہیں جن سے یہ واضح ہو سکے کہ اس زمانے کے لوگ کس طریقے پر رہتے تھے مثلاً ایک یا دو نسل پیشتر کی موٹروں کی تصویریں، ایسے لباس کی تصویریں جس کا فیشن تھا، میگزینوں کے تراشے، بعض جوتے یا بوٹ یا دوسری چیزیں جو کسی نہ کسی نے محفوظ رکھ چھوڑی ہوں۔ ایسی تصویروں اور اشیاء کی نمائش ضرور ہونی چاہیے اور معلم اپنی جماعت کے طلبہ کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرے گا۔ طلبہ کے ریمارک سنے گا۔ ان کا ردّ عمل دیکھے گا اور بچّے یقیناً ان تمام چیزوں کا مذاق اڑائیں گے اور ان پر ہنسیں گے۔

اس موقع پر کوئی سادہ سا ڈرامہ کا بھی انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ایک بچہ ماں بن جائے گا۔ دو تین اس کے بچے ہوں گے۔ دورِ حاضر کے کسی مکان کے کسی کمرے میں یہ ڈرامہ کھیلا جا سکتا ہے۔ ڈاکیا ابھی سیرس روبک کی نئی فہرست دے گیا ہے۔ ماں اور بچّے اس فہرست کا مطالعہ کرتے ہیں کہ کون کون سی چیزیں خریدی جائیں اور انھیں کون کون سی چیزیں پسند ہیں۔ غالباً طلبہ کے چند گروہ اس ڈرامے میں خوشی سے حصّہ لیں گے اور ان چیزوں کی تلاش کریں گے، جو انھیں اچھی

معلوم ہوتی ہیں۔ معلم کہے گا کہ یہ معاملہ پھر ایک مرتبہ زیرِ غور لایا جائے اور اب کے اسے پچاس یا ایک سو سال پیشتر کے دور میں رکھا جائے گا۔ ماں اور بچے ایک کمرے میں بٹھا دیے جائیں گے اور بالکل نئی فہرست ان کے سامنے پیش کی جائے گی جس میں مطلوب دور کی چیزیں ہوں گی۔ اس وقت مندرجہ ذیل طریقے کے سوالات کے ذریعے سے بحث میں گرمی پیدا کی جا سکے گی۔

۱ : تمہارا کیا خیال ہے کہ لوگوں کی روش کیا ہو گی ؟

۲ : کیا تمہارے نزدیک لوگ بھی ان چیزوں کو دیکھ کر ہنسیں گے جیسے تم ہنسے تھے۔ کیوں ہنسیں گے اور کیوں نہیں ہنسیں گے ؟

۳ : ہم میں سے بعض کو یہ پرانی چیزیں کیوں عجیب و غریب معلوم ہوئیں ؟

۴ : کیا تمہارا خیال ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہمارے دور کی چیزوں کو بھی لوگ عجیب و غریب سمجھیں گے ؟

اسی طرح بڑے بچے اخبار نیو یارک ٹائمز کے مندرجہ ذیل عنوان پر بحث کریں گے، جو ۲۲ مئی ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں چھپا تھا :

"لنڈ برگ ساڑھے تینتیس گھنٹے میں پیرس پہنچ گیا۔ ایک ہزار میل اسے برف اور کہر میں پرواز کرنی پڑی۔ فرانس میں جو لوگ اس کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے وہ تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے ہوئے اسے اڈے سے باہر لے گئے۔"

ظاہر ہے کہ آج نیو یارک سے ساڑھے تینتیس گھنٹے میں پیرس پہنچ جانا اس عہد کے بچوں کے لیے قطعاً تعجب انگیز نہیں جو جیٹ طیاروں کے دور کے تربیت یافتہ ہیں اور جو پانچ چھ گھنٹے میں اوقیانوس سے بذریعہ طیارہ پار ہو جانے کے عادی ہیں۔ تاہم جس عنوان کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، وہ حقیقی ہے اور ۱۹۲۷ء میں لوگوں نے واقعی اس پر بے انتہا خوشیاں منائی تھیں۔ بچوں کے لیے اس طریقے پر خوش ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ سمجھ لیں کہ چند حقائق کی حیثیت رکھتے ہیں اور بچوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ لنڈ برگ کی پرواز اس عہد میں اپنی نوعیت کی پہلی پرواز تھی اور اس وقت تک بحری جہازوں کے ذریعے سے عبور کرنے میں کئی دن لگتے تھے اور اس پرواز نے ان کی دنیا کو کسی نہ کسی حد تک مختصر کر دیا تھا۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ۱۹۲۷ء کا شہری فرض کرے تو لنڈ برگ کی پرواز پر جو جوش و خروش اور جشن منایا گیا اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے حقیقی احساساتِ مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے حالات سامنے رکھے جائیں جب لنڈ برگ نے یہ پرواز کی تھی

اور اسی عہد کے لوگوں کا ردِّ عمل صحیح اندازے کا معیار ہو سکتا ہے۔ چالیس پچاس سال بعد کے دور کی کیفیت میں اسے رکھنا بالکل نامناسب ہوگا۔

ماضی کے فیصلے یا اندازے میں جو مشکلات حائل ہیں انھیں ان لوگوں کی نگاہوں سے دیکھنا چاہیے جو اس زمانے میں زندہ تھے۔ ان مشکلات سے عہدہ برا ہونے کا ایک اور طریقہ بھی ہے مثلاً انٹرمیڈیٹ یا جونیئر ہائی سکول کے طلبہ خانہ جنگی کا مطالعہ کر رہے ہوں تو ان سے کہا جا سکتا ہے کہ ان سپاہیوں کی اوسط عمروں کا اندازہ کرو جو اس جنگ میں لڑے۔ اگرچہ اندازے مختلف ہوں گے لیکن امید رکھی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل پر زیادہ تر لوگوں کا اتفاق ہوگا۔ معلّم جماعت سے یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم عمروں کے وجوہ بھی لکھ دو۔

امید ہو سکتی ہے کہ طلبہ اپنے نظریے کی تائید میں مندرجہ ذیل قسم کے بیانات دیں گے:

- کم عمر لڑکوں کو ایک خاص وقت پر سکول جانا پڑتا تھا۔
- بچّوں کے لیے جنگیں لڑنا مناسب نہیں۔
- آپ کوچ، جنگ وغیرہ کے لیے مناسب قوت نہیں رکھتے۔ آپ کو کم از کم ______ سال کا ہونا چاہیے۔
- ہم سمجھتے ہیں کہ صرف وہی آدمی مسلح فوجوں میں شامل ہونے چاہییں جو پُوری قوت حاصل کر چکے ہوں اور تندرست ہوں۔
- جب تک آپ پُورے جوان نہ ہو جائیں گھر اور والدین سے الگ نہ ہونا چاہیے۔
- حکومت اس کی اجازت کبھی نہ دے گی وغیرہ۔

معلّم جماعت کے سامنے مندرجہ ذیل نقشہ پیش کر سکتا ہے جس میں بہت سے آدمیوں کی حقیقی عمروں کا اندازہ پیش کیا گیا ہے جو خانہ جنگی میں لڑے (اوسط عمر ۱۹ سال)۔

قریباً	۸،۴۴،۰۰۰	کی عمر سترہ سال تھی یا کم۔
قریباً	۲،۳۱،۰۰۰	سولہ سال کے تھے یا اس سے کم۔ ۱۲۶
قریباً	۱،۰۰،۰۰۰	پندرہ سال کے تھے یا اس سے کم۔
قریباً	۱،۵۰۰	چودہ سال کے تھے یا اس سے کم۔
قریباً	۳۰۰	تیرہ سال کے تھے یا اس سے کم۔
قریباً	۲۷۸	بارہ سال کے تھے یا اس سے کم۔

چونکہ حقیقی اعداد جماعت کے بہت سے قیاسی اعداد سے بے شک و شبہ متصادم ہوں گے لہٰذا معلّم کہہ سکتا ہے کہ ان غیر صحیح قیاسات کی تشریح پر توجہ جماؤ۔ نیز بعض ایسے حالات بتاؤ جن کی وجہ سے بہت سے بچّوں کو جنگ میں حصّہ لینا پڑا۔ جماعت اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتی ہے کہ سپاہی کے متعلق اس کا تصوّر دورِ حاضر کے احوال، روشوں اور عقیدوں پر مبنی ہیں اور خانہ جنگی کے سلسلے میں ان کے اندازے زیادہ تر اس لیے غیر صحیح تھے کہ طلبہ دورِ حاضر کے اندازوں کے مطابق سوچ رہے تھے۔ زمانۂ ماضی کے اندازے پیشِ نظر نہ تھے۔

تاریخ کے مطالعے سے ایک دانشمند معلّم کے سامنے واقعات کا لا متناہی سلسلہ آ جاتا ہے۔ جو مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر پیش آئے اور ان کے ذریعے سے طلبہ کو ہر سطح پر تعمیم میں مدد دی جا سکتی ہے۔ عمر اور درجے کی سطح کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائنگ اور تحریر کے مندرجہ ذیل نمونے اس قسم کے مطالعے اور تفتیش کے لیے بطور خاص موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

مارشل ڈیوڈسن نے "لائف ان امریکا" کے نام سے بہت ہی دلکش کتاب لکھی ہے اور اس کی پہلی جلد میں سمندر کے دیو پیکر جانوروں کے نقشے اور بیانات دیے ہیں، جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ چودھویں یا پندرھویں صدی میں موجود تھے۔ یہ دیو پیکر جانور ایسے تھے کہ جو بھی جہاز باقاعدہ آبی راستوں کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جاتا تھا، اسے جلد سے جلد خوفناک طریق پر ختم کر دیتے تھے۔ طلبہ حوصلہ مند اور عالی ہمت لوگوں کے بحری سفروں کا مطالعہ کرتے ہیں جنھوں نے پندرھویں صدی میں دُنیا کے متعلق انسانوں کے تصوّرات کو وسعت دی۔ ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ ان نقشوں کا مطالعہ گہری نظر سے کریں۔ بعض طلبہ ان لوگوں کی بے خبری کا مذاق اڑائیں گے۔ جنھوں نے ایسے دیو پیکروں کا وجود قبول کر لیا۔ معلّم کو چاہیے کہ اس نقطے سے آگے نکل کر جماعت سے کہے کہ وہ ایسے عقیدوں کے لیے قیاسی اور امکانی توضیحات پیش کرے۔ دوسرے لفظوں میں وہ کون سے حالات تھے جن کی بنا پر ایسے دیو پیکروں کا وجود قابلِ تسلیم سمجھا گیا۔ طلبہ مندرجہ ذیل طریق پر جوابات دیں گے:

۱ : اس زمانے میں لوگ جہاز رانی کے متعلق ویسی معلومات نہیں رکھتے تھے جیسی ہمیں حاصل ہیں۔ جہاز چھوٹے تھے۔ بہت سے جہاز واپس نہیں آتے تھے، اور لوگوں کو علم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسے جہازوں کا نقصان دیو پیکروں کے ذمّے لگا دیا جاتا تھا۔

۲ : اس زمانے میں نہ ریڈیو تھے نہ اخبار، بہت کم لوگ خواندہ تھے، لہٰذا خبریں ایک انسان سے دوسرے انسان کو پہنچتی تھیں اور سب کی سب صحیح

نہیں ہوتی تھیں۔

۳ : لوگ بحری دیو پیکروں کے علاوہ بہت سی چیزوں کے متعلق اوہام پرست تھے انھیں دیو پیکروں کا وجود ممکن معلوم ہوتا تھا۔

۴ : انسان نے سطحِ ارض کے متعلق بہت کم معلومات حاصل کی تھیں اور اس بارے میں علم بھی زیادہ نہ تھا۔

۵ : اس زمانے میں صرف چند سکول تھے اور بہت سے لوگوں کی تعلیم برائے نام تھی۔

اسی طرح ہائی سکول کے طلبہ ان حالات کا تجزیہ کر سکتے ہیں جن کی بنا پر ہسپانیہ کے ایک طبیب نے چودھویں صدی میں اپنے بیٹے کو خط لکھا۔ اس عہد کے لوگوں کے نزدیک یہ خاصا معقول اور عقل کے عین مطابق تھا۔

وہ لکھتا ہے :۔

"زیادہ کھانے اور بار بار کھانے سے پرہیز کرو۔ خصوصاً شب کے وقت۔

ناپختہ پیاز شام کے وقت نہ کھاؤ۔ بعض اوقات ایسا کر سکتے ہو۔ کیونکہ اس طرح پیاز کھانے سے عقل اور حواس عموماً کند ہوتے ہیں۔

.... دودھ اور مچھلی یا دودھ اور شراب بیک وقت کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ ایک ہی وقت میں دودھ اور مچھلی یا دودھ اور شراب کے استعمال سے برص پیدا ہوتا ہے۔

سردیوں میں ٹھنڈے پاؤں لے کر نہ سونا چاہیے پہلے آگ تاپ کر پاؤں گرم کرو یا چل کر بھی گرم کیے جا سکتے ہیں یا کوئی اور طریقہ استعمال کر لو۔ گرمیوں میں جوتا پہن کر نہ سو، کیونکہ اس سے ایسے بخار پیدا ہوتے ہیں جو دماغ اور حافظے کے لیے مضر ہیں۔

پیٹ بھرا ہوا ہو تو فوراً بستر پر نہ لیٹ جاؤ۔ کھانے سے ایک گھنٹہ بعد لیٹنا چاہیے۔ اگر کوئی ضرورت مانع نہ ہو تو کھانے کے بعد تھوڑا سا چلو پھرو تاکہ غذا معدے میں درست طریق پر بیٹھ جائے اور نم معدہ میں نہ رہ جائے۔ کیونکہ جو بخارات سر کی طرف جاتے ہیں۔ وہ بلغم سے بھر جائیں گے اور اس طرح حافظے کو نقصان پہنچے گا۔

اسی طرح گرمیوں میں مکھیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنا کمرہ روزانہ

جھاڑو سے صاف کرو اور اس پر پانی نہ چھڑکو کیونکہ مکھیاں نم آلود گرد سے پیدا ہوتی ہیں ہاں وقتاً فوقتاً تیز سرکہ چھڑک سکتے ہو جو دل اور دماغ کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ ؎[۱]"

نیو اورلیانز میں ۱۸۲۵ء کے آس پاس حبشیوں کی خرید و فروخت یا مبادلہ بالکل طبعی اور معقول سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ چند امریکی اس عمل کے سخت خلاف تھے۔ اکثر لوگ اسے زندگی کے اوضاع و اطوار کی صورت میں قبول کر لیتے تھے۔ بیسویں صدی کے تمام امریکی اس عمل کو قدیم دور کی چیز سمجھ کر سخت مذمّت کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک اچھا تجربہ ہے کہ انسان اس دور کی جنوبی ریاستوں کے شہری کی حیثیت میں فرض کرے اور اسی دور کی قدروں، روشوں اور عقیدوں کو پیشِ نظر رکھے۔ اس طرح جو معقولیّت پیدا ہوگی، اس سے طبیعت مطمئن ہو جائے گی۔ ذیل میں ایک چھوٹا سا اشتہار درج کیا جاتا ہے جو نیو اورلیانز میں بردہ فروشی کے موقع پر دیا گیا تھا۔ اس پر بحث کی جا سکتی ہے۔

اشتہار درجِ ذیل ہے :-

"مندرجہ ذیل ناموں کے قیمتی غلاموں کا مالک امریکہ کو چھوڑ کر یورپ جانے کے لیے تیار بیٹھا ہے لہٰذا وہ نیو اکسچینج میں اپنے غلام فروخت کر دینا چاہتا ہے۔ یہ نیلام نیو اکسچینج میں ہوگا جو سینٹ لوئی کے کارنز اور چارٹرس سٹریٹس میں واقع ہے۔ سولہ مئی کو ہفتے کے روز بارہ بجے ہوگا۔

۱ : سارا

یہ مخلوط نسل کی عورت ہے۔ عمر ۴۵ سال۔ نہایت عمدہ کھانا پکاتی ہے۔ گھر کے کام کاج کی عادی ہے۔ بیماروں کی تیمار داری میں بڑی ہی مشّاق اور وفا شعار ہے۔ بہ اعتبارِ کردار اس کی حیثیت درجہ اوّل کی ہے۔

۲ : ڈینس

مندرجہ بالا کا بیٹا۔ نسل مخلوط، عمر ۲۴ سال۔ اوّل درجے کا باورچی، اور جہاز کے لیے اوّل درجے کا سٹیورڈ۔ اس حیثیت میں کئی سال تک

؎[۱] : "ریڈنگز اِن یورپین ہسٹری" ص ۱۴۷ تا ۱۴۹۔

جہازوں پر کام کرتا رہا۔ بڑا دیانت دار، متحمل مزاج، اور اوّل درجے کی رعایا ہے۔

۳ : چول

نسل مخلوط، عمر ۳۶ سال۔ یہ عورت بلا استثنا ملک میں سب سے لائق خادمہ ہے۔ کپڑے دھونے میں درجہ اوّل۔ استری خوب کرتی ہے، لیس خوب لگاتی ہے۔ کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔ غیر شادی شدہ کو گھر کا انتظام رکھنے کے لیے ضرورت ہو تو اس عورت کو بہت اعلیٰ درجے کی سمجھنا چاہیے۔ یہ بیگمات کی خدمت گزاری بھی خوب کرتی ہے اور اس حیثیت میں شمال کی جانب سفر کر چکی ہے۔

۴ : فَینی

مندرجہ بالا کی بیٹی۔ نسل مخلوط، عمر ۱۶ سال۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جانتی ہے۔ بال بنانے میں اسے اعلیٰ حیثیت حاصل ہے۔ (گلیک کی شاگرد ہے) کپڑے بہت اچھے سیتی ہے۔ بیگمات کی خدمت بڑے اچھے طریقے پر کرتی ہے۔ ہوشیار اور مستعد ہے اور اوّل درجے کا کردار۔

۵ : ڈنڈرج

نسل مخلوط، عمر ۲۶ سال، ڈائننگ روم کا کام بہت اچھا جانتا ہے۔ تصویریں بھی بناتا ہے۔ اور تھوڑا بہت بڑھئی کا کام بھی جانتا ہے۔ دیانت داری اور سنجیدگی میں بہت کم آدمی اس جیسے ہوں گے۔

۶ : نینسی

مندرجہ بالا کی بیوی، عمر ۲۴ سال، قابلِ اعتماد خادمہ۔ کپڑے اچھے سیتی ہے۔ خصوصاً عورتوں کے گاؤن بہت عُمدہ

بناتی ہے گویا درزن ہے۔ کھانا اچھا پکاتی ہے۔ کپڑے اچھے دھوتی ہے انھیں استری خوب کرتی ہے۔

۷ : میری این

نینسی کی بیٹی، نسل مخلوط، عمر سات سال، فرانسیسی اور انگریزی جانتی ہے۔ بڑی مستعد، ہوشیار اور سمجھ دار ہے۔

۸ : فینی یا فرانسس

نسل مخلوط، عمر ۲۲ سال، کپڑے دھونے اور استری کرنے میں درجہ اوّل، کھانا اچھا پکاتی ہے اور بڑی اچھی گھریلو خادمہ ہے۔ کردار بہت عمدہ۔

۹ : ایما

ایک یتیم، عمر ۱۰، ۱۱ سال، فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانیں جانتی ہے۔ سات سال سے اس ملک میں آئی۔ سینا بھی جانتی ہے، بڑی مستعد اور ہوشیار ہے۔

۱۰ : فرینک

نسل مخلوط، عمر ۳۲ سال، فرانسیسی اور انگریزی جانتا ہے۔ اوّل درجے کا سائیس اور گاڑی بان۔ گھوڑوں کے متعلق اسے بڑی اچھی معلومات حاصل ہے۔ ہر اعتبار سے اوّل درجے کا کردار ہے۔ البتہ گاہے گاہے پی لیتا ہے مگر مدہوش نہیں ہوتا۔

یہ تمام غلام یہاں کی دیرینہ اور عمدہ رعایا ہیں۔ موجودہ مالک ۱۲۹
نے انھیں کئی سال پیشتر خریدا تھا لہٰذا وہ ایک ایک کے لیے ہر قسم کے جرائم اور امراض سے پاک ہونے کا عہد کرتا ہے جو ازروئے قانون ممنوع ہیں۔ صرف ایک فرینک ہے جس کی ضمانت ہر معاملے میں دی جاسکتی ہے سوائے اس کے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا۔

شرائط :

نصف رقم نقد، باقی نصف چھ مہینے کے نوٹوں پر جو مالک کی تسلی کے مطابق تیار کیے جائیں۔ ایک خاص کاغذ تیار کر دیا جائے جس کے مطابق تمام غلام اس وقت تک رہن رہیں گے۔ جب تک پوری رقم ادا نہ کی جائے۔ بیع نامے کی تصدیق ولیم باسویل کرے گا جو اس کام کے لیے مقرر ہے۔ اس کے مصارف خریدار کو برداشت کرنے ہوں گے۔

نیواورلیانز ۱۳ر مئی ۱۸۳۵ء

ہم میں سے اکثر لوگوں کو جادوگری کا خیال مضحکہ انگیز معلوم ہوگا لیکن ایسا بھی وقت تھا جب اسے معمولاً بالکل درست سمجھتے تھے۔ ۱۶۶۲ء میں میسا چوسیٹس کے بہت سے لوگوں نے ایک قانونی عدالت کی مندرجہ ذیل شہادت بالکل معقول اور منطقی تسلیم کر لی تھی۔ ہم ان معیاروں، قدروں اور عقیدوں کی توجیہ کیا کر سکتے ہیں جن کی بنا پر یہ روش ممکن سمجھی گئی۔

سوال : تم کو یہاں جادوگری کا ملزم قرار دیا گیا ہے ...... تم یہ کیونکر کرتی ہو ؟

جواب : مَیں بتا نہیں سکتی ......

سوال : کیا تم تسلیم کرتی ہو کہ تم جادوگرنی ہو ؟

جواب : ہاں۔

سوال : تم کب سے یہ کام کر رہی ہو ؟

جواب : ہفتے بھر سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا۔

سوال : کیا شیطان تمھارے سامنے نمودار ہوا تھا ؟

جواب : ہاں۔

سوال : کس شکل میں ؟

جواب : گھوڑے کی شکل میں۔

سوال : اس نے تم سے کیا کہا ؟

جواب : اس نے کہا کسی بات کا خوف نہ کرو .... لیکن وہ ابتدا ہی سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔

سوال : کیا تم............. کسی وقت کسی چھڑی یا پول پر سوار ہوئی تھیں ؟

جواب : ہاں۔

سوال : تم شیطان کی عبادت کیونکر کرتی تھیں ؟

جواب : اس نے کہا تھا کہ میری عبادت کرو۔ میری خدمت انجام دو۔ کیونکہ میں دیوتا ہوں اور خداوند ہوں۔

سوال : گاؤں میں کون کون سے جلسے ہوئے جن میں تم موجود تھیں ؟

جواب : میں وہاں ایک مرتبہ گئی تھی۔ رچرڈ کیریر میرے ساتھ پول پر سوار ہو کر گیا تھا اور شیطان ہمیں اٹھا کرلے گیا تھا۔ [۱]

۱۳۰ اسی طرح مختلف عمروں کے طلبہ ان حالات کی تحقیق کر سکتے ہیں جن کی بنا پر مندرجہ ذیل اشتہار نیو انگلینڈ کے ایک اخبار میں ۱۸۲۸ء میں چھپا :

"دس یا بارہ معزز خاندان جن کے ساتھ چار چار یا پانچ پانچ بچے ہوں اور ان کی عمریں نو سال اور سولہ سال کے درمیان ہوں، روئی کے ایک کارخانے میں کام کے لیے درکار ہیں جو پراویڈنس کے قرب و جوار میں ہے۔"

آخر میں معلم جو انٹرمیڈیٹ کے گریڈوں یا سینئر ہائی سکول میں کام کرتا ہے۔ تاریخی امور میں تخلیقی مشق بھی کرا سکتا ہے۔ مثلاً مستقبل کے متعلق فرضی گفتگوئیں کی جائیں مثلاً کسی جماعت کے طلبہ سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ فرض کر لیں کہ ۲۰۵۰ء میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ مفصلات میں کسی سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ نیویارک یا سان فرانسسکو جائیں۔ طلبہ کا خاص کام یہ ہے کہ اس سفر کے لیے وہ ایسے طریقے تجویز کریں جو آجکل کے طریقوں سے مختلف ہوں یعنی سفر کے دوران ہمارے آرام، تحفظ، قیام، رفتار وغیرہ کے متعلق کئی اصلاحات ہوں مستقبل میں ایسے سامانِ سفر کے پیشِ نظر جماعت اپنے مفروضات پیش کر سکے گی اور ۲۰۵۰ء کا سفر ان کے تعلیمی اندازوں سے زیادہ مشابہ ہو گا۔ ۲۰۵۰ء کا قیاسی شہری ۱۹۶۰ء کے سامانِ نقل و حرکت کے متعلق کیا تصور کرے گا۔ ۷۵ میل فی گھنٹے کی رفتار کے بارے میں اس کا ردِعمل کیا ہو گا ؟ حادثوں کی جو شرح آجکل ہے ۲۰۵۰ء میں کیا ہو گی ؟

---

[۱] : ٹامس ہچنسن : "دی وچ کرافٹ ڈی لوژن" (۱۹۶۲ء)
ص : ۳۵ تا ۳۷ ۔

کاریں یا ٹرک، ظاہری وضع و ہیئت کے اعتبار سے کیسے ہوں گے۔ اگر ہم محض ۲۰۵۰ء کے معیاروں کی بنا پر فیصلہ کریں تو کیا ہمیں ایک حد تک پرانے خیال کے آدمی نہ سمجھا جائے گا۔ ہماری تہذیب کے متعلق آنے والے دور کے مؤرخوں کا نظریہ ہماری خواہش کے مطابق کیا ہونا چاہیے۔

معلم یہ کر سکتا ہے کہ اس مثال کو پیشِ نظر رکھ کر مستقبل کے متعلق سوال کرے۔ اس میں مندرجہ ذیل قسم کے سوالات زیرِ غور آئیں گے جن کے بارے میں اخباروں کی سرخیاں مندرجہ ذیل وضع کی ہوں گی :-

- سپریم کورٹ نے فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ تمام پبلک سکول باہم متحد ہو جائیں۔ اس پر بحث جاری ہے۔
- محکمۂ دفاع اس سال دس بلین خرچ کر رہا ہے۔
- صدر جمہوریت نے افلاس کے خلاف پروگرام پیش کر دیا ہے۔
- ریاست کی قانون ساز مجلس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ موت کی سزا قائم رکھی جائے۔
- ریسرچ کرنے والے اب بھی سرطان کے علاج کے سلسلے میں اسباب کی تلاش کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی یقین کے ساتھ پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ جس کا مطلب یہ ہو کہ کسی نہ کسی دن سرطان کا علاج مل جائے گا۔ افلاس دور ہو جائے گا، اور جنگ کو آئندہ کے لیے جھگڑوں کے تصفیے کا مسلّم ذریعہ نہیں سمجھا جائے گا۔ بہ ایں ہمہ یہ سب کچھ دائرۂ امکان میں ہے۔ غالباً یہ ایک ذلّت خیز تجربہ ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں جو حالات ہیں انھیں مستقبل کے مؤرخ کی مفروضہ نگاہوں سے دیکھا جائے جو غالباً بہت مختلف دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہوگا۔ اور وہ غالباً محض اپنے زمانے کے معیاروں کے مطابق ہمارے متعلق فیصلہ نہ کرے گا۔

جو تاریخی واقعات پُر پیچ ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے سادہ، اور علت و معلول کے انداز میں پیش کیا جا سکے۔ اگر ماضی کا مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں تعددِ اسباب کا زیادہ دور دورہ ہے۔

"........... مؤرخ اپنی چھان بین وسیع اور گہری کرتا جائے گا تو اس سوال کے زیادہ سے زیادہ جوابات مسلسل جمع ہوتے جائیں گے۔ کیا وجہ ہے کہ ماضی قریب کے چند سال میں اقتصادی،

مجلسی، ثقافتی اور قانونی تاریخ کے مسائل کے جوابات تعداد اور وسعت میں حد درجہ بڑھتے گئے ہیں - اس سلسلے میں سیاسی تاریخ کے پُرپیچ واقعات نیز نفسیات اور اعداد کی نئی تکنیک کا ذکر نہیں کیا جا رہا........[1]"

تاریخ کے سلسلے میں جو خوفناک جرائم دیکھے گئے ان میں بہت سی چیزیں ہیں، لیکن ایک چیز یہ بھی ہے کہ پُرپیچ تاریخی واقعات کو وحدت پرستانہ، سطحی اور حد درجہ سادہ انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض نوجوان یہ اثر لیے بیٹھے ہیں کہ لوتھر نے جو پچانوے دعوے پیش کیے تھے وہی اصلاحِ کلیسا کا باعث بن گئے - اسٹام کا قانون امریکی انقلاب کا سبب تھا۔ غلامی کی وجہ سے خانہ جنگی شروع ہوئی - یہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل تاریخ کی تعلیم کے متعلق ہمارے طور طریقوں کا کچھ اچھا منظر پیش نہیں کرتے۔ یقیناً مطالعۂ تاریخ کا ایک نہایت اہم نتیجہ یہ ہے کہ انسان جن چیزوں میں اعتقاد رکھتا ہے جنھیں محسوس کرتا ہے اور جن کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ ان میں نمایاں تغیّر پیدا کرنے کے لیے بہت سے عوامل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جب تک یہ حقیقت سمجھ نہ لی جائے، ہم تاریخ کی تعلیم کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

پرائمری جماعت کے معلمین کے لیے ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ بچّوں کو ایک ایک معاملے کے زیادہ اسباب کا تصوّر دلانے کے لیے روزانہ کے معاصرانہ واقعات ان کے سامنے پیش کرنے چاہییں جو مختلف اسباب کے نتیجے میں بروئے کار آئے اور طلبہ سے کہا جائے کہ وہ ان کے مختلف ممکن اسباب پر غور کر لیں۔

مثلاً معلم طلبہ سے کہے گا :

"کل صبح ہم اپنے سکول سے پانچ بلاک اس طرف جائیں گے تاکہ بہت سے آدمیوں اور بڑی بڑی مشینوں کو برسرِکار دیکھیں۔ کیا تمھیں معلوم ہے وہ کیا کر رہے ہیں؟ ہاں وہ ایک نیا ابتدائی سکول بنا رہے ہیں - کیا آپ نے دیکھا کہ بہت سے پُرانے گھر مسمار کر دیے گئے تاکہ سکول کی عمارت کے لیے جگہ نکل آئے۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ جب یہ نئی عمارت بن جائے گی - ہم اس میں منتقل ہو جائیں گے اور جس عمارت میں ہمارا سکول اب ہے وہ ڈھا دی جائے گی۔ ۱۳۲

---

[1] : کار : ص ۱۱۷، ۱۱۸ -

بتاؤ یہ نیا سکول کیوں بن رہا ہے ؟

اس ضمن میں طلبہ مختلف جواب دیں گے :

۱ : ہمارا سکول پرانا ہے اور یہ اتنا محفوظ نہیں جتنا کہ نیا ہوگا۔

۲ : ہماری موجودہ عمارت چھوٹی ہے اور جو بچے سکول میں آنے چاہییں ان کے لیے کفایت نہیں کرتی۔ ممکن ہے ہمارے ہمسائے میں اور بچے سکول جانے کے خواہاں ہوں۔ یا ہماری بہنیں اور بھائی سکول میں آئیں گے یا نئے کنبے یہاں منتقل ہو رہے ہوں گے۔

۳ : ہمارے سکول میں کوئی کیفے ٹیریا نہیں۔ بڑے سکول میں اس کا بھی انتظام ہوگا۔

۴ : ہمارے موجودہ سکول کی عمارت زیادہ خوبصورت نہیں۔ نئی عمارت یقیناً خوبصورت ہوگی۔

۵ : جو بچے اس سکول میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں وہ ہمارے کھیل کے میدان میں کھیل نہیں سکتے۔ بڑے بچے چھوٹے بچوں کو باہر نکال دیتے ہیں ہمیں کھیل کے لیے بڑے میدان کی ضرورت ہے۔

۶ : جس زمین پر ہمارے موجودہ سکول کی عمارت ہے اسے شاید کوئی شخص کسی اور کام میں لانے کا خواہاں ہوگا۔ مثلاً :

- نئی قسم کی عمارت بنانا چاہے گا۔
- یا بازار بنائے گا۔
- یا کچھ اور۔

۷ : اس سکول میں شور زیادہ ہوتا ہے۔ غالباً تعلیم کا انتظام کرنے والوں کو زیادہ پُرسکون جگہ کی تلاش ہے۔

۸ : ہمارے سکول میں بعض کمرے سرما میں زیادہ گرم ہو جاتے ہیں، بعض زیادہ سرد ہوتے ہیں۔ ممکن ہے تعلیم کے منتظمین اس سلسلے میں کچھ کرنے کے خواہاں ہوں۔

جب بچے اپنی اپنی تعبیرات پیش کر چکیں تو معلم کو چاہیے کہ ان کے لیے مزید معلومات مہیا کردے۔ یا ان سے کہا جائے کہ اپنے والدین سے دریافت کرو کہ نئے سکول کے حقیقی اسباب کیا کیا ہیں ؟

بہت سے مؤرخین تاریخ کے طلبہ کو آگاہ کر چکے ہیں کہ جب کسی واقعے کے سلسلے میں بہت سے اسباب کارفرما ہوں تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام عوامل یکساں اہمیت کے حامل ہوں گے۔ مؤرخ کے کام کا ایک حصّہ یہ بھی ہے کہ اسباب عناصر کے اثرات کا اندازہ کرے۔ ان کے تعلق کا جائزہ لے اور ایک ایک فشار کا درجہ الگ الگ کرے۔ معلم کا ایک کام یہ بھی ہے کہ طلبہ سے کہے کہ تمام نکات کو بہ اعتبارِ اہمیّت لکھ لیں۔

(مثلاً تحفّظ بعض دوسرے عناصر کے مقابلے میں زیادہ اہم سمجھا جائے گا)

سینئیر ہائی سکول کے طلبہ بھی کسی مسئلے کے حل کا تجربہ کر کے فائدہ اٹھائیں گے اور اس سے لذّت اندوز ہوں گے اور وہ بعض ممکن اسباب کا اندازہ کریں گے جو کسی واقعے کی تہ میں مضمر ہیں اور واقعہ انھی کی آبادی میں بہ زمانۂ قریب پیش آیا تھا۔ وہ کام اس طرح شروع کریں گے کہ حال ہی میں فلاں گروہ نے شکست کیوں کھائی۔ فرضی اسباب کا ایک ایسا نقشہ تیار کر لیا جائے گا، جس کا خاکہ یہاں درج کیا جا رہا ہے
۱۳۳ اور آگے چل کر اسے غیر رسمی اور جزوی طریق پر صحیح مان لیا جائے گا یا غلط قرار دیا جائے گا۔

شکست سے اس لیے سابقہ پڑا کہ:

۱ : اس کے لیے پوری طرح تشہیر نہیں کی گئی۔ جن لوگوں سے ووٹ حاصل کیے جا سکتے تھے، ان میں سے بہت کم ووٹ دینے کے لیے گئے۔

۲ : جو لوگ اس کے حق میں تھے، انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اس لیے وہ ووٹ دینے کے بجائے گھروں میں بیٹھے رہے۔

۳ : مقامی شہریوں نے محسوس کیا کہ ہمارے سکول جیسے بھی ہیں اچھے ہیں اور ان پر مزید خرچ کرنا ضروری نہیں۔

۴ : اضافی محاصل ہر شکل میں آجکل غیر ہر دلعزیز ہیں۔

۵ : ہماری آبادی میں بڑی تعداد بڑی عمر کے شہریوں کی ہے، جنھوں نے خلاف ووٹ دیے کیونکہ ان کی آمدنی محدود تھی۔

۶ : وغیرہ وغیرہ۔

پھر طلبہ اپنے مسئلے کے متعلق ہر قسم کی متعلقہ معلومات یکجا کریں گے۔ وہ جماعت میں مختلف چیزیں لا سکتے ہیں۔ مثلاً:

- پوسٹر
- اخباروں کی کہانیاں
- ایڈیٹوریل

- ایڈیٹر کے نام خطوط
- اشتہارات
- وہ چیزیں جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں استعمال کے لیے لکھی گئیں، اور مقصود یہ تھا کہ ووٹروں سے اپیل کی جائے۔
- ان تقریروں کی نقلیں جو حامیوں اور مخالفوں نے کیں۔

طلبہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس قسم کے سابقہ واقعات کے پس منظر کے متعلق معلومات بروئے کار لائیں۔ بعض سوالات پر احتیاط سے غور و فکر کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً :

سکول کے سپرنٹنڈنٹ

مقامی اخبار کے ایڈیٹر

مالکانِ مکان

نوجوانوں اور بوڑھوں وغیرہ سے مل کر صحیح حالات معلوم کر سکتے ہیں۔

ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جنھوں نے خلاف یا حق میں دباؤ ڈال کر مطلب پورا کیا۔

اس قسم کی تمام کوششوں کو سائنٹیفک دریافتیں نہیں کہا جائے گا۔ سارا زور اسباب کے تعدد پر ہوگا۔ جماعت کے طلبہ غالباً یہ بھی چاہیں گے کہ مختلف اسباب کی اضافی اہمیت کے متعلق اندازے پیش کریں جو ان کے علم میں آئے۔

بہر حال نوجوان اس قسم کی سرگرمیوں میں مشغول رہ کر ہر معاملے کے متعلق سادہ سے اسباب و نتائج کو بہ آسانی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے۔

تیسرے درجے کے طلبہ کو معلم بعض ایسے تاریخی واقعات پر متوجہ کر سکتا ہے، جن کے اسباب مختلف تھے اور جن امور سے بچے متعارف تھے ان کے متعلق بھی پہلی مرتبہ متعدد اسباب کا معاملہ بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

مثلاً :

پوچھ سکتا ہے :-

انگریز کیوں آباد کار بن کر امریکہ پہنچے

پھر بورڈ پر طلبہ کے افکار و نظریات لکھ سکتا ہے۔

جب بچے تمام تجاویز زیرِ بحث لا کر ان کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو جائیں گے تو معلم مندرجہ ذیل
اشتہار اُن کے سامنے پیش کر سکتا ہے جو ۱۶۰۹ء کے آس پاس لندن میں وسیع پیمانے
پر دیا گیا تھا۔ ۱۳۴

اس پوسٹر اور اس کی اپیل کا تجزیہ بڑی احتیاط سے کرنا چاہیے۔ معلم کو چاہیے کہ پرانی انگریزی کی بعض تکلیف دہ چیزیں واضح کر دی جائیں۔

مثلاً :

ایس (S-P) جو ایف (f) معلوم ہوتا ہے۔

یا ایسے بعض مشکل الفاظ۔

> **نیا برطانیہ**
>
> **نہایت عُمدہ پھلوں کی پیشکش**
>
> **باغات لگانے کے سِلسلے میں**
>
> **ورجینیا میں**
>
> **لندن**
>
> یہ اشتہار سیموئیل میچم کے لیے چھاپا گیا۔
>
> پلاٹ اس کی دکان پالس چرچ یارڈ
>
> میں فروخت ہوں گے۔
>
> **۱۶۰۹ء**

اس ابتدائی وضع کی اپیل پر غور و بحث کے بعد معلم بہ لحاظ مناسبت دُوسرے درجے میں ہنری سٹیل کومیجر کی کتاب "دی فرسٹ بک آف امیریکن ہسٹری" کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اس میں بھی وہی سوال زیرِ بحث لایا گیا ہے جو معلم کے پیشِ نظر ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباس جماعت کے طلبہ کا مشاہدہ وسیع کرنے کے سلسلے میں کارآمد ہو سکتا ہے :۔

" آباد کار یہاں کیوں آئے ؟ انھوں نے انگلستان میں اپنے گھر، کنبے اور دوست کیوں چھوڑے ؟ اور کس وجہ سے خطرناک سمندر عبور کرتے ہوئے ایک غیر معلوم دنیا میں پہنچے ۔ بہر حال یہ بڑی ہی خوفناک جانبازی تھی جو اُنھوں نے قبول کی، لیکن ان کی آمد کا سلسلہ کیوں جاری رہا ؟

بعض کے نزدیک یہ محض مہم جوئی تھی اور مہم جوئی آج بھی دُنیا کے ہر حصے میں لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے ۔

مثلاً :

- خطۂ منجمد کی چھان بین ۔
- کوہستان ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا ۔
- بیرونی فضائے بسیط میں پرواز ۔

بعض کے لیے اس مہم جوئی کے ساتھ بے اندازہ دولت کی آرزوئیں وابستہ تھیں ....

دوسرے لوگ اپنے بادشاہ یا ملکہ کے جلال وغیرہ کے لیے نکل پڑے اور انھوں نے انگلستان کا پرچم ساتھ لیا ۔ یہاں تک کہ امریکہ میں نیا انگلستان بنا دیا ۔

اکثر ایسے تھے جو بہر حال پرانی دنیا کو چھوڑنا چاہتے تھے اور ان کی آرزو تھی کہ زندگی از سرِ نو شروع ہو ۔ ایک اور سبب بھی تھا جو بہت سے آباد کاروں کو امریکہ لے آیا ۔ یہ سبب پیورٹینوں اور دوسرے لوگوں کے لیے بہت قوی تھا جو نیو انگلینڈ آئے ۔ یہ تھا مذہب .... [1] "

۱۳۵

یہی عام مسئلہ یعنی ترکِ وطن جونیر اور سینیر ہائی سکول کے طلبہ کے سامنے بھی زیادہ تفصیل سے پیش کیا جا سکتا اور اس کے ضمن میں فکر کی سطح بلند تر رکھی جا سکتی ہے ۔ ترکِ وطن کے اسباب پر مختصر سی بحث کے بعد معلم مختصر کتابوں سے چھوٹے چھوٹے اقتباسات پڑھ کر سنا سکتا ہے ۔

---

[1] : ہنری سٹیل کومیجر : " دی فرسٹ بک آف امیریکن ہسٹری " ص ۶ ، ۷ ۔

جو اقتباس ذیل میں درج ہے یہ جان ایف کینیڈی کی نہایت عمدہ کتاب سے لیا گیا ہے۔ جس کا نام ہے۔ "اے نیشن آف امیگرینٹس"۔

"امریکہ آنے کے لیے غالباً اتنے ہی وجوہ تھے، جتنے لوگ یہاں آئے۔ یہ بڑا اہم انفرادی فیصلہ تھا۔ تاہم کہا جا سکتا ہے کہ تین بڑی قوتیں اس کی موجب ہوئیں :

اوّل مذہبی تشدّد

دوم سیاسی ظلم و جور

سوم اقتصادی مشکلات

یہی تین چیزیں بے شمار لوگوں کو مجبور کر کے امریکہ لے آئیں۔ ہر شخص اعلانِ آزادی کے حلف کی تعبیر اپنے طور پر کر رہا تھا یعنی زندگی، آزادی، اور کسبِ راحت کا وعدہ۔" (ص ۱۴)

اس کتاب میں بعض نہایت واضح تصویریں بھی ہیں جو رسالوں، اشتہاروں، سنگی طباعت کی چیزوں، کارٹونوں اور فوٹوگرافوں سے لی گئی ہیں جنھیں بآسانی جماعت کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

معلم بعض ابتدائی مسائل پر بھی متوجہ ہو سکتا ہے یعنی تارکینِ وطن نے جو خط اپنے ان عزیزوں کو لکھے جو بدستور قدیم ملک میں مقیم رہتے اور ان کے سامنے نئی زندگی کے احساسات پیش کیے۔ ان میں ایسی چیزیں بھی بیان کی گئی تھیں جو ترکِ وطن کا باعث ہوئیں۔

مندرجہ ذیل خطوط اس سلسلے میں ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں :

"میں یہاں اس سے بدرجہا بہتر جاگیر کا مالک ہوں جو انگلستان میں میں نے کرائے پر لے رکھی تھی اور مجھے زرعی کاروبار سے زیادہ وابستگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں ہر شہری .... حکومت کا جزو ہے۔ اس میں شریک ہے محض رسماً نہیں حقیقتہً اور وہ ہر عہدہ، اور منصب حاصل کر سکتا ہے ..... [1]"

"یہاں مزدوری بہت زیادہ ہے۔ ایک جوان آدمی سال بھر میں ڈیڑھ سو ڈالر سے ایک سو ساٹھ ڈالر تک کما سکتا ہے۔ یہاں

---

[1] : مورس برک بیک : "لیٹرز فرام الی نوائے۔" ص ۲۹ -

ایک غریب آدمی جلد دولت مند کسان بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ محنت و مشقت کرتا رہے اور احتیاط سے کام لے، وہ بہت دولت جمع کرسکتا ہے .... ایسی دولت حاصل کرنا ناروے میں بہت مشکل ہے۔[۱]

---

۱۳۶ "یہاں دنیا کی تمام قوموں کے لوگ بھائیوں اور بہنوں کی طرح رہتے ہیں، حالانکہ یہاں کوئی فوج نہیں، سپاہی نہیں، پولیس بھی نہیں، چوری یا بھیک کی یہاں کوئی مثال نہیں ملتی۔ پڑوسیوں کے درمیان ناراضی کا کوئی وجود نہیں۔ میرے ساتھ ہر فرد کا برتاؤ اچھا ہے۔ ہر فرد مہربانی اور تعاون سے کام کررہا ہے۔ یہاں کوئی شخص کسی قسم کی چیز جبراً تم سے نہیں لے سکتا ....[۲]

"امریکہ کے باشندے ملازموں سے بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں، انھیں ملازم نہیں معاون سمجھا جاتا ہے .....[۳]

"یہاں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ تمھارا باپ کون تھا اور کیا کرتا تھا۔ صرف یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم کیا کرسکتے ہو۔ ریاستہائے متحدہ کے ہر شہری کے لیے آزادی ویسی ہی ضروری ہے جیسی سانس لینے کے لیے ہوا! ....[۴]

"الی نائے کی ریاست میں زیادہ تر زمین چراگاہوں کی ہے۔ وہاں جنگل بہت کم ہیں۔ درخت صرف دریاؤں اور ندیوں کے کنارے اُگتے ہیں۔ گرمی کا موسم نہایت خوش نما ہوتا ہے، اس وقت پورا ملک جس میں جنگل اور مرغزار دونوں شامل ہیں۔ گھاس اور رنگ برنگ پھولوں سے بھر جاتا ہے جو موسم بہار کے اوائل ہی میں کھلنے لگتے ہیں اور یہ سلسلہ موسم خزاں تک

۱۔ تھیوڈور سی بلیگن: "لینڈ آف ڈیئر چوائس"۔ ص ۳۸ ۲۔ ایضاً ص ۵۳۔
۳۔ ایضاً ۸۶ ۴۔ مورس برک بیک "نوٹس آن اے جرنی اِن امیریکا" ص ۳۴۔

قائم رہتا ہے۔ جب مختلف پھول گر کر ختم ہو جاتے ہیں، نئے اُگ اُٹھتے ہیں
موسمِ خزاں میں زرد رنگ کے بعض بڑے بڑے پھولوں کے ڈنٹھل دس دس فٹ
بلند ہوتے ہیں۔ یہاں کا موسمِ گرما رُوئے زمین پر بہشت کے مشابہ ہے ؎ۤ"

اسی انداز میں معلم اعلانِ آزادی کی تمہید پڑھ سکتا ہے اور اس کی توجہ اس حصے پر رہنی چاہیے :

"...... یہ ضروری ہے کہ ان اسباب کا اعلان کیا جائے جو علیحدگی کے موجب ہوئے۔"

اسی طرح انٹرمیڈیٹ اور جونیئر ہائی سکول کے طلبہ کے روبرو بھی معلم "اعلانِ اعظم" کے متعلق طلبہ کے ردِّ عمل کو تقویت پہنچا سکتا ہے۔ "دی گریٹ ڈیکلریشن" ہنری سٹیل کومیجر کی ایک کتاب ہے اس میں مختلف روزنامچوں، خطوں، خودنوشتہ سوانح اور رسالوں وغیرہ سے عمدہ اقتباسات درج ہیں۔ جن میں سے ہر اقتباس معنی خیز بحث کا موضوع بن سکتا ہے :

"جب ہم کہتے ہیں کہ اعلانِ آزادی کی نوبت کس طرح آئی اور اسے کیوں ضروری سمجھا گیا تو ہم بڑے بڑے سوالات کرتے ہیں۔ درحقیقت ہم انقلابِ امریکہ کے اسباب کی تاریخ کے طلب گار ہوتے ہیں...... جولائی ۱۷۷۶ء تک براعظم کی دوسری کانگرس میں بالاتفاق اعلانِ آزادی کا فیصلہ کیا گیا۔

اس سے کیا تغیر پیدا ہوا؟

تین چیزیں واضح ہو گئیں :

اوّل : اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہا کہ جارج سوم شاہِ انگلستان عہدِ امریکہ کے مطالبات ماننے کا ارادہ نہیں رکھتا اور نہ اہم مراعات دینے کے لیے تیار ہے کیونکہ وہ اہلِ امریکہ کو شریر 'باغی' سمجھتا ہے۔

دوم : یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ اگر اہلِ امریکہ متحد رہے اور انھیں فرانس سے تھوڑی بہت امداد مل گئی تو ان کے لیے جنگ میں کامیابی کا بڑا اچھا موقع ہے۔ بنکرہل ؎ۤ کی جنگ سے پیشتر ۱۳۷

ؔ۱ "برک بیک" لیٹرز فرام الی نوائے"۔ ص ۱۴۱۔

ؔ۲ بوسٹن کے پاس ایک پہاڑی، جس پر امریکہ کی جنگِ آزادی میں ایک لڑائی ہوئی تھی (۱۷جون ۱۷۷۵ء)۔

کوئی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

سوم : اس غیر معمولی پمفلٹ کا اثر جو "کامن سینس"[1] کے نام سے مشہور ہوا.....

آرتھر وال ورتھ الفانسو ٹوروکی کتاب کی تیسری جلد سے ٹیکساس کی بغاوت کے سلسلے میں اہل میکسیکو کا نقطۂ نگاہ پیش نظر لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ٹوروکی کتاب میکسیکو کی ان تاریخوں میں سے ہے جو ثانوی درجے کے مدارس میں عام طور پر پڑھائی جاتی ہیں اور اس میں بتایا گیا ہے کہ میکسیکو اور امریکہ کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کا اصل باعث جوع الارض تھی اور جنگ کا پورا الزام امریکی سامراجیوں کی سازشوں پر عائد کیا گیا ہے لیکن ٹورو نے جو تجزیہ کیا ہے وہ حد درجہ سادہ ہے۔ یہ کسی جنگ کے آغاز کے متعلق حد درجہ سادہ اسباب کا ایک اور نمونہ ہے۔

یہاں ٹوروکی کتاب سے دو پیرے پیش کیے جاتے ہیں :

"اس وقت سے جب میکسیکو خود مختار نہیں ہوا تھا، ریاستہائے متحدہ کی خواہش تھی کہ اپنا علاقہ ہسپانیۂ نو کے نقصان پر وسیع کرلیں اور اسے ریوگرینڈی[2] تک لے جائیں۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس علاقے پر حملے کرتے رہتے تھے اور انھوں نے کئی دعوے پیدا کرلیے جن میں سے کوئی بھی پوری طرح ثابت نہ تھا.......

.... جو لوگ جنوبی ریاستوں میں رہتے تھے انھوں نے علاقے کی توسیع کے لیے ہماری طرف نظریں جمائیں اور وہ چاہتے تھے کہ جنوب میں غلاموں کی اور ریاستیں بنالیں اور اپنا اقتدار مستحکم کرلیں۔ وہ ٹیکساس لینے پر بھی تلے بیٹھے تھے۔ انھیں امید تھی کہ صدر جیکسن سے انھیں امداد ملے گی۔ صدر جیکسن ایک بے اصول آدمی تھا۔ وہ غلاموں کا مالک تھا اور اسے اس معاملے سے ذاتی دلچسپی تھی۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے ذرائع استعمال کرسکتا تھا۔ خواہ وہ اخلاق سے بالکل عاری ہوتے ......[3]"

اسی طرح سینیئر ہائی سکول کے طلبہ کو یا ان کے مختلف گروہوں کو خانہ جنگی کے اسباب کی چھان بین پر لگایا جاسکتا ہے۔ جب جماعت کے طلبہ خانہ جنگی کے تمام عوامل کی فہرست مرتب کرلیں تو معلم اس مقالے

---

[1] مشہور انگریز اہل قلم ٹامس پین (جنوری ۱۷۳۷ء - جون ۱۸۰۹ء) کی کتاب جس نے امریکی آبادکاروں کو اعلان آزادی پر آمادہ کیا۔

[2] شمالی امریکہ کا ایک دریا۔ [3] "سکول ہسٹریز ایٹ وار" ص ۳۹ تا ۴۱۔

کے بعض حصے انھیں سنا سکتا ہے۔ جو ہاورڈ کے بیل نے لکھا ہے۔ یہ بڑا ہی دلچسپ اور سوچ سمجھ کر لکھا ہوا مقالہ ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ اصل مسئلے تک مورخ کی رسائی کا طریقہ اس میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے
۱۳۰ معلم بیل کے مندرجہ ذیل تبصرے سے یہ سلسلہ شروع کر سکتا ہے:

"....... مورخین نے خانہ جنگی کے اسباب بہت زیادہ بیان کیے ہیں، جنھیں پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کی کوئی سادہ سی توضیح ممکن نہیں۔ ابتدائی دور کے مصنفین سادہ جواب پیش کرتے رہے لیکن وہ بعد کے لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے۔ اب رجحان یہ ہے کہ سادہ توضیحات کے بجائے گوناگوں توضیحات پیش کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ حد درجہ پرپیچ ہو گیا ہے۔

بیل کے مسودے میں ایک چیز واضح ہے اور وہ یہ کہ خانہ جنگی کے نہ محض اسباب بہت زیادہ تھے بلکہ جنوبی ریاستوں کے مورخوں اور شمالی ریاست کے مورخوں نے اس کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ باہم مختلف ہیں۔ بیل لکھتا ہے کہ پہلی عالمی جنگ سے مورخین نے یہ سلسلہ شروع کر دیا ہے کہ سازشی ریاستوں کے حقوق اور غلامی کے بجائے ان کی توجہ مجلسی، ثقافتی، نظریاتی، سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی عوامل کی طرف منعطف ہو گئی ہے۔ اس دور میں مورخین کے کام کا سراغ لگاتے ہوئے اس نے جنوبی ریاستوں کے ابتدائی مصنفین کے بیانات ۱۸۶۱ء سے ۱۹۰۰ء تک پیش نظر رکھ کر ان کا خلاصہ بیان کر دیا ہے:

"......... جو اہم عوامل جنگ کا موجب بنے وہ درج ذیل ہیں: غلاموں کی آزادی، اس کے لیے غلامی کے خلاف انجمنیں بن گئیں۔ کانگرس میں غلامی کے مخالفوں نے اضطراب افزا سرگرمیاں شروع کر دیں، ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۰ء تک جان کوئنسی ایڈمز اور جوشوا گیڈنگز ان سرگرمیوں کے رہنما تھے، پھر غلامی کی تنسیخ کے لیے درخواستوں کا منظم طوفان بپا ہو گیا۔ غلاموں کی آزادی کے لیے ایک مستقل جماعت بن گئی۔ ایسی کوششیں شروع ہو گئیں کہ جنوبی ریاستوں کے باشندے ٹیکساس میں آبادکاری کے فوائد سے بہرہ ور نہ ہو سکیں اور میکسیکو کے ساتھ جنگ میں کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ نیو انگلینڈ میں مہاجروں کی امداد کے لیے جو انجمن بنی تھی اس کی سازشیں، کنزس میں جان براؤن کی سرگرمیاں، آزاد ریاستوں کے آدمیوں کا غلامی کے قانون کو ماننے سے انکار۔ کولمبیا میں غلامی اور بردہ فروشی پر کامیاب حملے۔ جنوبی ریاستوں کے خلاف پادریوں، خطیبوں اور اخباروں کی سرگرمیاں۔ یہ الزامات کہ

جنوبی ریاستوں کے ادارے اور خود جنوبی ریاستوں کے باشندے بُرے ہیں ری پبلکن پارٹی نے ایک ایسی تنظیم بنالی جو جنوبی ریاستوں کو تباہ کرکے زیر اثر لانے کا باعث ہو سکتی تھی۔ ری پبلکن پارٹی والوں نے غلامی کے خلاف معاملات سنبھال لیے۔ ''انکل ٹامز کیبن'' اور ہیلپر کی کتاب ''امپینڈنگ کرائسس'' وسیع پیمانے پر شائع کیے گئے۔ کانگرس میں چیز، سیوارڈ اور سمنر کے حملے۔ شمالی ریاستوں نے ڈریڈ سکاٹ کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ ری پبلکن پارٹی کا ارادہ تھا کہ ریاستوں میں غلامی کو ختم کر دیا جائے۔ شمالی ریاستیں اقتدار کی حریص تھیں اور تلی بیٹھی تھیں کہ ان کا دائرہ اقتدار وسیع ہو جائے۔ لنکن کی روش غلامی اور جنوبی ریاستوں کے خلاف تھی۔ لنکن کا صدر منتخب ہونا جنوبی ریاستوں کے باشندوں کے نزدیک یہی معنی رکھتا تھا۔ مفاہمت کی کوششوں کو ری پبلکن پارٹی والوں نے ناکام بنایا، اور ان کا عزم تھا کہ جنوبی ریاستوں کو دبایا جائے اور مجبور کیا جائے .....''

(ہاورڈ کے بیل)

۱۳۹ ممکن ہے سینیئر ہائی سکول کے طلبہ کے پاس تفصیلات میں جانے اور اس میں مضمر نظریاتی اختلاف کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے وقت نہ ہو، انھیں کم از کم یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خانہ جنگی میں بہت سی قوتیں برسرِ کار تھیں اور کسی بھی شخص کا نقطۂ نگاہ ایک کثیر الاسباب تاریخی واقعے کے جائزے میں رنگ آمیزی کا باعث ہو سکتا ہے۔

ماضی کے متعلق جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے وہ حد درجہ جزوی، متفرق اور جانبدارانہ ہے۔ ہر فرد مہیا تاریخی ''حقائق'' کی اہمیت کے متعلق مختلف الرائے ہے اور ہر نسل ماضی کی تاریخ اپنی ضرورتوں، آرزوؤں اور نقطۂ نگاہ کے مطابق از سرِ نو لکھتی ہے جو مؤرخ تاریخ نگاری کی نوعیت، فلسفے اور طور طریقوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ تاریخ میں ان مسائل، معاملات، ناگزیر طور پر نامکمل، تنگ نظر اور موضوعی نقطۂ نگاہ کے بارے میں خاص طور پر مضطرب چلے آتے ہیں۔ انھوں نے بارہا اس بدیہی حقیقت کا کھلم کھلا اعلان کر دیا ہے (اگرچہ بعض اوقات اسے نظر انداز کیا جاتا رہا) کہ ہم یا ہمارے بعد آنے والے مؤرخین انسان کی کہانی کا کوئی بھی اہم حصہ بیان نہیں کر سکتے۔ وہ اکثر اعتراف کر چکے ہیں کہ دنیا کے متعلق خواہ وہ ماضی کی دنیا ہو یا حال کی، ان کا محیطی نقطۂ نگاہ ان کے تجرباتی محاذوں کی بنا پر محدود رہ گیا ہے، خواہ وہ قومی ہوں یا علاقائی یا مذہبی یا فلسفیانہ یا مجلسی یا اقتصادی وغیرہ۔ انھوں نے بارہا تسلیم کیا ہے کہ ہمارے

انفرادی مدرکات ایسے فلٹر بنے رہے ہیں جن سے محرکات اور مواد چھن جاتے ہیں اور انھوں نے مان لیا ہے بعض نے بہ آسانی اور بعض نے مشکل سے، کہ تاریخ بھی بدلتی رہتی ہے۔

انسان کو کرۂ ارض کے معاملات اور معاصرانہ واقعات و مسائل سے دلچسپی کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت اور فوری ذاتی مسائل کے ساتھ تعلق آج کل کے معاشرتی علوم کے پروگراموں میں ایک موزوں چیز سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح طلبہ گرد و پیش کے مسائل اور مواد کے متعلق نقادانہ انداز میں سوچنے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو تاریخی مآخذ وہ پیش نظر رکھیں گے اور جن میں سرگرمیاں اور غور و فکر ان کا کام ہوگا، وہ بہرحال انسانوں نے انسانوں کے متعلق لکھے اور ممکن ہے وہ انسانی غلطیوں، کمزوریوں، اندازے اور غور و فکر کے نقص سے پاک نہ ہوں گے۔ لہٰذا پیدا ہونے والے انسانی مسائل کے متعلق سعی و تلاش اور غور و فکر کی سرگرمیاں بڑھ جائیں گی۔

پانچویں بنیادی تاریخی بصیرت کے سلسلے میں معلّم اپنے طلبہ کو دریافت اور از سرِ نو دریافت کی روح کے متعلق کچھ احساسات دے گا جو تاریخ کا جزو بن سکتے ہیں جن کی بنا پر تاریخ کے لیے چھان بین، تحریر، مطالعے،
تعبیر، تعلیم اور بحث و نظر کا کام تخلیقی انداز میں ہوگا۔ ایک اعتبار سے تاریخ ایک ایسا سلسلہ ہے جو برابر ۱۴۰
جاری ہے اور اس کا اختتام کوئی نہیں۔ یہ ایسا ذائقہ ہے جس کی خوشبو طلبہ کے دماغ تک پہنچ جانی چاہیے ادبی اور تاریخی تحریرات کے ذریعے سے معلم اپنے طلبا کے دل میں مطالعے کے لیے زندگی بخش قوت اور شعلۂ حیات پیدا کر سکتے ہیں۔

سیموئیل کلیمنز نے اپنی کتاب "ایڈونچرز آف ٹام سایر" میں سحر انگیز انداز اختیار کر کے انگن جو کی تقدیر پر ایک ٹکڑا لکھا ہے جس میں تاریخ کے متعلق اپنا احساس ظاہر کیا ہے۔ یہ احساس اس کی دوسری تصانیف میں بھی نمایاں تھا۔ معلم چاہے تو ان دلکش افکار میں اپنے طلبہ کو حصہ دار بنائے، بشرطیکہ وہ اس انداز کا صحیح اندازہ کر لے۔ اس میں انسانی معاملات کے متعلق دُور اندیشانہ نقطۂ نگاہ رکھا گیا ہے۔ وقتی اور بے وقت دونوں قسم کے معاملات پیش نظر رہے ہیں اور لامتناہی تلاش کے سلسلے میں انسانی افکار و اعمال کے متعلق "کیوں اور کیسے" برابر جاری ہے۔

> .... وہ بدبخت بھوک سے موت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ پاس ہی ایک مقام تھا جہاں سٹالک مائٹ[1] آہستہ آہستہ قرنوں اور صدیوں سے زمین کے ساتھ ساتھ نشو و نما پا رہی تھی اور چھت سے سٹالک ٹائٹ[2] قطرہ قطرہ

---

[1] کاربونیٹ لائم کا تہ نشین مادہ جو غاروں کے فرش پر پایا جاتا ہے۔

[2] وہ مادہ جو قلموں کی شکل میں غاروں کی چھتوں سے لٹکتا ہے۔

گر رہا تھا۔ اس قیدی نے سٹالگ مائٹ کو توڑا، اور اس مقام پہ ایک پتھر رکھ دیا جس میں ایک گڑھا سا بنا دیا تھا۔ قطرہ ہر تین منٹ کے بعد ایک دفعہ گرتا تھا۔ اس طرح دن رات میں ایک چمچہ بھر مشروب تیار ہوتا تھا۔ یہ قطرہ اس وقت بھی گر رہا تھا جب اہرام تازہ تازہ بنے تھے، اس وقت بھی گر رہا تھا جب ٹرائے[1] فتح ہوا تھا، اس وقت بھی گر رہا تھا جب روما کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس وقت بھی گر رہا تھا جب مسیح کو صلیب[2] پر چڑھایا گیا تھا۔ اس وقت بھی گر رہا تھا جب فاتح نے برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس وقت بھی گر رہا تھا جب کولمبس بحری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی گر رہا تھا جب لیکسنگٹن[3] کا قتلِ عام ایک تازہ خبر کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ قطرہ اب بھی گر رہا ہے۔ یہ اس وقت بھی گرتا رہے گا جب تمام موجود چیزیں تاریخ کی سہ پہر اور روایت کی شفق میں گم ہو جائیں گی اور فراموشی کی تاریک رات انھیں نگل جائے گی کیا ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد یا مشن ہے۔ کیا یہ قطرہ پانچ ہزار سال سے اس لیے گر رہا ہے کہ انسانی کیڑے کی وقتی ضرورت پوری کر دے، یا دس ہزار سال بعد یہ کسی اور مقصد کے پورا کرنے کا ذریعہ بنے گا کچھ بھی ہو بہت برس گزر چکے ہیں جب اس کم نصیب نیم تربیت یافتہ وجود نے پتھر کو اندر سے کھرچا تھا۔ تاکہ یہ بیش بہا قطرے اس میں جمع کر لے[4]......"

ایک اور ادبی اقتباس جو سینئر ہائی سکول کے طلبہ کی توجہ اپنی طرف کھینچے گی اور اسے قابو میں رکھے گی اور یہ سمجھنے میں مدد دے گی کہ جب کوئی مورخ کسی ایسی کلید کی دریافت پر پہنچتا ہے جو نئی معلومات اور بصیرت کے دروازے کھول دے گی۔ وہ تحریر ہے جو نتھینیل ہاتھورن نے اپنی کتاب "دی سکارلٹ لیٹر" (نارنجی خط) کی

---

[1] موجودہ جمہوریہ ترکیہ کا ایک شہر جو زمانہ قدیم میں ٹرائے نام ریاست کا مرکزی مقام تھا۔ یہاں زبردست جنگ ہوئی تھی۔ ہومر نے ایلیڈ میں اسی جنگ کی کہانی لکھی ہے۔

[2] مسیحیوں کا عقیدہ یہی ہے لیکن قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

[3] ریاست میساچوسٹس، امریکہ کا ایک مقام جہاں ۱۹ اپریل ۱۷۷۵ء کو جنگِ آزادی کی ایک لڑائی لڑی گئی۔

[4] "دی ایڈونچرز آف ٹام سایر" - ص ۲۶۲، ۲۶۳-

تمہید میں قلمبند کی ہے۔ ہاتھورن بتاتا ہے کہ اس نے کسٹم ہاؤس کی دوسری منزل میں جہاں وہ کام کرتا تھا ایک پرانا سا پشتارہ دیکھا۔

۱۴۱ ایک روز میں بیکار تھا اور مینہ برس رہا تھا۔ خوش نصیبی سے میں نے ایک چیز دریافت کی جو ایک حد تک دلچسپی کا باعث تھی۔ ایک جگہ کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔...... میرا ہاتھ ایک چھوٹے سے پشتارے تک پہنچ گیا جو ایک پرانے زرد رنگ کے کپڑے میں احتیاط سے باندھا گیا تھا۔..... اسے دیکھتے ہی میری قوتِ دریافت تیز تر ہو گئی۔ میں نے جلدی سے سرخ رنگ کا فیتہ کھولا جو ارد گرد لپٹا ہوا تھا، خیال یہ تھا کہ کوئی خزانہ روشنی میں آ رہا ہے۔.....

....

لیکن جس چیز نے میری توجہ اپنی طرف کھینچی وہ پُراسرار پشتارہ تھا جو سرخ رنگ کے کپڑے میں بندھا ہوا تھا لیکن زیادہ مدت سے باندھ کر ڈال دیا گیا تھا اور اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔...... سرخ رنگ کے کپڑے نے ایک خط کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس پر جلی انداز میں اے (A) لکھا گیا تھا۔ میں نے اس کی پیمائش کی تو وہ سوا تین انچ لمبا تھا۔ یہ دراصل ایک زیبائشی لباس کے لیے تجویز کیا گیا تھا لیکن اسے پہنا کیونکر جا سکتا تھا۔ کس درجے اور مرتبے کا آدمی پہن سکتا تھا۔ یہ سب کچھ ایک معما تھا۔...... مجھے اس کے حل ہونے کی بہت کم امید تھی۔.......

....

نارنجی خط پر غور و فکر میں ڈوب جانے کے بعد میں کاغذات کے ایک چھوٹے سے گول کیے ہوئے پلندے کے متعلق بالکل غافل ہو گیا جو اس کے اوپر لپیٹ دیا گیا تھا۔ اب اسے کھولا تو مجھے سمجھ کر بڑا اطمینان ہوا...... کہ پورے معاملے کی معقول توجیہ مل گئی۔ فل سکیپ سائز کے کئی تختے تھے جن میں ایک خاتون مسیٹر پرین کی زندگی اور گفتگو کے متعلق بہت سی معلومات درج تھیں، اور ہمارے اجداد کی نگاہوں میں وہ ایک اونچے درجے کی شخصیت تھی وہ اس زمانے میں زندہ تھی، جب میساچوسٹیس کا ابتدائی دور شروع ہوا تھا اور سترھویں صدی کے اختتام تک زندہ رہی...... میں نے اس مخطوطے کی مزید

چھان بین کی تو اور بہت سی باتوں اور اس خاتون کی کُل تکلیفوں کا ریکارڈ مل گیا۔ انھی کے لیے خوانندۂ کتاب سے کہا جاتا ہے کہ وہ نارنجی خط کی کہانی پڑھ لیں۔ یہ بات بھی ذہن میں محفوظ رہے کہ اس کہانی کے اہم حقائق مسٹر سرویئر پیو کی دستاویز کے مطابق بالکل درست اور صحیح ہیں اصل کاغذات اور نارنجی خط اب تک میرے قبضے میں ہیں اور ہر اس شخص کو دکھائے جا سکیں گے جو اس کہانی میں دل چسپی لے گا اور دیکھنا چاہے گا ...... "[1]

اب آپ ایک حقیقی واقعے کی طرف آیئے۔ معلم کو چاہیے کہ سینیئر جماعت کے طلبہ کو کارل سینڈبرگ کی کتاب "ابراہم لنکن دی پریری ایئرز اینڈ دی وار ایئرز" سنائے۔ یہ ایک جلد کی کتاب ہے۔ یہ انتخاب تاریخ کے ہمیشہ ابھرنے والے ممکنات واضح کرتا ہے، یعنی اس دائرے میں بار بار جائزہ
۱۴۲ لینا چاہیے۔ انتخاب ناگزیر ہے۔ تاریخی بیان میں حذف کے سوا چارہ نہیں۔ روداد کا نامکمل ہونا اور مختلف معاملات سے تعلق رکھنے والے مسائل کا تجزیہ اور مؤرخ کے کام کی پیچیدگی۔

"میں نے اس کام کے سلسلے میں ایسے نئے مواد اور چھان بین سے کام لیا جس سے لنکن کی زندگی اور شخصیت پر نئی روشنی کا اضافہ ہوا۔ میں نے مرغزار کے سال موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے اوائل میں لکھ لیے تھے، اور میں تیس سال سے انتہائی سرگرمی کے ساتھ لنکن کی زندگی کے اس حصے کے بارے میں چھان بین کرتا رہا تھا، جو اس کے صدر بننے سے پیشتر گزر چکا تھا، لنکن کی وفات کے بعد تیس سال کے کسی بھی دَور میں اس کی زندگی کے حقائق اور انسانوں کے متعلق ایسی سخت چھان بین کبھی نہیں ہوئی۔

.... لنکن کا ہر سوانح نگار اس امر پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کے خطوط اور تقریروں کا پورا حصہ یا بعض حصے چھوڑ دے جنھیں وہ شامل کرنا چاہے گا۔ اسی سے واضح ہو سکتا ہے کہ لنکن کے سوانح کے متعلق ہر کتاب کیوں ایک دوسری سے مختلف ہے۔ ہر سوانح نگار خود وہ فقرے یا پیرے انتخاب کرنے اور رہنے دینے کا فیصلہ کرتا ہے جو اس

---

[1] "دی سکارلٹ لیٹر" - ص ۲۷ تا ۳۱۔

کے اندازے کے مطابق صاحبِ سوانح کی تصویر یا کہانی پر پوری روشنی ڈالے گا۔ اگر سب کچھ لے لیا جائے تو وہ داستان سنانے میں بہت زیادہ وقت لگے گا جتنا کہ اصلاً اس میں نہیں لگا۔

لنکن کے ایسے خطوط جا بجا موجود ہیں جو ابھی تک چھپے نہیں لیکن امید نہیں کہ ان کے ذریعے سے کوئی اہم روشنی اس کے سوانح پر پڑے گی۔ فروری ۱۹۵۴ء میں لنکن کے وہ خطوط پہلی مرتبہ شائع ہوئے جو اس نے جج ڈیوڈ ڈیوس کو لکھے تھے۔ میں نے ان سے کام لیا ہے۔ ان خطوں سے لنکن کے ماہر مدبر ہونے پر ذرا زیادہ گہری روشنی پڑتی ہے۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو آدھی رات کے وقت ایک قومی واقعہ کا افتتاح ہونے والا تھا۔ جسے عام طور پر پردہ کشائی سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی کانگرس کی لائبریری میں رابرٹ ٹی لنکن کے ذخیرے کا افتتاح جو مدت سے خفیہ چلا آتا تھا۔ آئندہ پانچ روز میں میں سات اخباروں کو اٹھارہ ہزار تین سو خطوں، تاروں، مسودوں اور متفرق امور کے متعلق رودادیں بھیجتا رہا۔ اس وقت چودہ ایسے فاضل اور مصنف موجود تھے، جنھوں نے اتفاق کیا کہ لنکن پر کوئی خاص روشنی تو نہیں پڑی لیکن ان دستاویزوں سے وہ خطوط زیادہ گہرے اور پختہ ہو گئے جو لنکن کی پُرپیچ شخصیت کے متعلق پہلے سے واضح تھے .....[1]"

ثانوی درجے کے طلبہ سے کہا جا سکتا ہے کہ ماضی اور حال کی تاریخی تحقیقات سے ایسی ڈرامائی مثالیں پیش کرو، جن کی حیثیت سراغ رسانی کی سی ہے۔ مختلف طلبہ اپنے ہم جماعتوں کو ایسی کہانیاں سنا سکتے ہیں، جیسی رشید[2] کے پتھر (روسیٹا سٹون) سے مصر قدیم کی زبان کی کلید دریافت کی گئی ہے۔ جماعت کا کوئی طالب علم یہ بیان کر سکتا ہے کہ "انسٹی ٹیوٹس آف اوریٹری" کا پورا متن کس طرح دریافت ہو۔ پیٹرارچ کو اصل متن کا محض کٹا ہوا حصہ ملا تھا۔ ۱۴۱۶ء میں پورا متن مل گیا تو اسے بہت بڑا واقعہ قرار دیا گیا تھا۔ تھوڑی سی چھان بین کر لی جائے تو یہ حقیقت آشکارا

---

[1] سینڈ برگ کی مذکورہ کتاب جلد اول ص ۱۱/۷ - ۱۱/۷

[2] مصر کا ایک شہر ہے جو ڈیلٹا میں واقع ہے نپولین نے مصر پر حملہ کیا تھا تو ایک پتھر اسے وہاں ملا تھا جس پر ہیروگلانی کی ایک تحریر کے ساتھ اس کا یونانی ترجمہ ثبت تھا۔ اسی سے مصریات کی کلید دریافت کر لی گئی۔

۱۴۳ ہو جائے گی کہ جب یہ چیز جو پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی - یورپ کے خدمت گزاران انسانیت اور دوسرے لوگوں کے نزدیک بہت مقبول ہوئی تھی - ارسیمس۱، لوتھر، ایلاٹ، ملکاسٹر، بن جانسن، پوپ، جان سٹورٹ مل اس ادارے سے خوب آگاہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پہ بہت توجہ کی گئی۔ اور بعد کے دوروں میں اس کا ذکر کثرت سے ہوا، اور اس پہ بہت کچھ لکھا گیا۔ طلبہ ایسی کہانیاں اور مقالے پیش کر سکتے ہیں، جن میں تاریخی دریافتوں کا ذکر ہو - ایسی ایک دلچسپ روداد وہ ہے جس کے متعلق جیمز موریس نے ۳۰ مئی ۱۹۶۴ء کے "سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ" میں ایک مقالہ "شاہ جان کا گم شدہ خزانہ" کے زیر عنوان لکھا - اس مقالے میں سے مندرجہ ذیل اقتباس اس مہم جوئی اور ہمت کا احساس دلا سکتا ہے، جسے تاریخ کہتے ہیں :

"انگلستان کے چھ انچ نقشے میں ایک مقام ایسٹ انگلیا کی دلدلی زمین میں ہے، جو انگلستان کے بحیرۂ شمالی والے ساحل پہ واقع ہے ......

....

اس مقام کے نچلے حصے سے جو ایک ویران جگہ واقع ہے - ناٹنگھم یونیورسٹی کے استاد ارضیات نے متعدد عجیب چیزیں نکالی ہیں اور اگر آپ آداب ملحوظ رکھتے ہوئے درخواست کریں تو پروفیسر ولیم ڈی ایوانز آپ کو یونیورسٹی کی کارگاہوں میں دعوت دے سکتے ہیں اور وہ عجائبات دکھا سکتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں اور بے شائبہ مبالغہ انھیں ڈرامائی حیثیت حاصل ہے، خوب غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک نہایت عمدہ پُراسرار چمک دمک ہے - ان میں سے بعض چاندی کے ٹکڑے ہیں - چھوٹی چھوٹی گولیاں یا مڑے ہوئے تار بعض پہ نیلے رنگ کی مینا کاری ہے - یہ چیزیں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں میں جمی ہوئی تھیں - بعض چیزیں سونے کی ہیں یا کہنا چاہیے - سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں، جو بہت پرانے معلوم ہوتے ہیں اور ان سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں - ایوانز آپ کو یہ چیزیں اس طرح دکھائے گا، جیسے مرلن نے کھانے کی میز کھولی اور اس میں سے شاہ آرتھر نے تلوار کھینچ کر نکالی - اسے بالکل حق بجانب سمجھنا چاہیے - کیونکہ یہ اس خزانے کے ابتدائی باقیات ہیں، جو

---

۱ ہالینڈ کا فاضل (۱۴۶۶ - ۱۵۳۶ء) -

انگلستان کے بادشاہ جان کے ہاتھوں ایسٹ انگلیا میں ۱۱ر اکتوبر ۱۲۱۶ء کو ضائع ہوا تھا۔

. . . .

. . . . . . مختلف لوگوں نے بار ہا اسے تلاش کیا۔ مؤرخوں نے بڑی محنت سے کام لے کر اس خزانے کے گم ہونے کے واقعات کی تفصیلات فراہم کیں، لیکن حال ہی میں جب کہ اصل حادثے پر سات صدیاں گزر چکی ہیں، اس خزانے کے ابتدائی نشانات ملے ہیں جن سے بہت سے دلوں میں نئے ولولے پیدا ہوئے ہیں اور کئی نظریات وضع کر لیے گئے۔ آس پاس کے کھیتوں میں بہت سے ہل چلانے والوں کی آنکھیں اس امید کے ساتھ زمین پر گردش کرتی رہیں کہ شاید کوئی سراغ مل جائے۔[۱]"

مؤرخوں نے ایسی ہی کئی دستاویزیں دریافت کیں جو جعلی تھیں، خود بنائی گئی تھیں، غلط اور غیر صحیح تھیں۔ ان کی دیکھ بھال بھی سینئیر ہائی سکول کے نوجوانوں کے لیے ایک دلکش تجربہ ہوگا۔ تاریخی چھان بین کے اس دلکش پہلو کے متعلق تحقیقات شروع کرنے سے پہلے معلم کو چاہیے کہ مندرجہ ذیل مکالمے کا کچھ حصہ
۱۴۴ پڑھے جو آرنلڈ جوزف ٹائن بی اور ایلی ڈی بریک کے درمیان ہو۔ ٹائن بی لندن یونیورسٹی میں بین الاقوامی تاریخ کی تحقیق کا پروفیسر ہے اور بریک ڈینور یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کا صدر ہے۔

مکالمہ یہ ہے:

بریک: لیکن انیسویں صدی کے مؤرخین نے جو حد درجہ طویل دستاویزیں مرتب کی ہیں، سمجھ رہے ہیں کہ وہ ماضی کے متعلق حقیقتِ ثابتہ پر پہنچ گئے۔

ٹائن بی: بیشک۔ دستاویزوں کے متعلق وہ بہت ہی بھولے تھے۔ کیا یہ صحیح نہیں، وہ سمجھ رہے تھے کہ دستاویزیں بھی ایک ارضی تہ ہیں۔ دستاویزیں جھوٹی نہیں ہو سکتیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ بہت سی دستاویزیں دانستہ بنائی گئیں اور جھوٹی تھیں، جو بھی کسی حکومت کا ملازم ہے اور اس نے ایسی دستاویزیں

---

[۱] جیمز مارس کا مذکورہ مقالہ "سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ" (۳۰ مئی ۱۹۶۴ء) ص ۶۲۔

پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دستاویزیں اس غرض سے نہیں بنائی گئی تھیں کہ مؤرخین کے لیے حقائق کا سرمایہ فراہم ہو۔ یہ بھی مان لینا چاہیے کہ وہ جھوٹ کی اشاعت کے لیے نہیں بنائی گئی تھیں۔ تاہم وہ کسی عملی مقصد کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ان کا مقصد تھا کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے۔ یہ نہ تھا کہ تاریخ کے لیے مواد بہم پہنچائے جائیں۔"

بعدازاں معلم کو چاہیے کہ جماعت کے روبرو بڑے بڑے فاضلوں کی تحریرات سے اقتباسات سنائے جائیں، جن سے تاریخ کے اس مسئلے پر روشنی پڑے، اور جو دستاویزوں کے معروف معاملات کے متعلق سراغ رسانی کا کام انجام دے چکے ہوں۔ طلبہ ان کے متعلق مزید چیزیں پڑھ سکتے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں سے جو کارآمد ہو سکتی ہے لوئس گاٹشی چاک کی کتاب ہے جس کا نام ہے "فورجڈ اور مسرپریزنٹڈ ڈاکومنٹس"۔ اس کتاب کا تیسرا باب ہے "ایکسٹرنل کرٹیسزم" یعنی تاریخ، بشریات اور عمرانیات میں ذاتی دستاویزوں کا استعمال۔ ہومر کیری ہاکٹ کی ایک کتاب ہے "دی کرٹیکل میتھڈ اِن ہسٹاریکل ریسرچ اینڈ رائیٹنگ"۔ اس کا وہ حصہ دیکھنا چاہیے جس میں تاریخی انتقاد کے اصول پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ایلن نیونز کی کتاب ہے "دی گیٹ وے ٹو ہسٹری"۔ اس کے پانچویں باب کا عنوان ہے "دی چیٹنگ ڈاکومنٹ"۔ وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ ذیل میں چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں جن سے تمام مؤرخ متعارف ہیں۔ طالب علم ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ انفراداً بھی اور اجتماعاً بھی، اور جماعت میں اس پر بحث کر کے روشنی ڈالی جا سکتی ہے:

۱۔ قسطنطین کے عطیات (یہ دستاویز اس غرض سے استعمال ہوئی تھی، کہ پاپاؤں کے لیے جاگیرات کے دعاوی کو تقویت پہنچے۔ لورینزو ویلانے ۱۴۴۰ء میں ثابت کیا کہ یہ دستاویز آٹھویں صدی کی جعلسازی ہے۔

۲۔ پارسن میسن لاک ویمر کی کتاب "لائف آف جارج واشنگٹن"۔ یہ ایک اخلاقی وضع کی کتاب ہے جس کا انداز لوک کہانیوں کا سا ہے۔ اس میں چیری (گیلاس) کی افسانوی کہانی بیان کی گئی ہے۔

۳۔ نپولین کے متعلق منتخب مواد (اس میں وہ روزنامچے شامل ہیں جو نپولین کے گردوپیش
رہنے والے آدمیوں نے لکھے، نیز لاس کاسیس کے جعلی خطوط شامل ہیں جو نپولین کے ۱۲۵
آخری دور میں اس کا رفیق تھا)۔

۴۔ مورے کا خط (یہ خط تھا جس میں چین سے مزدور منگانے کی تجویز کی گئی تھی اور یہ خط غلط طور پر جیمز گارفیلڈ سے منسوب کیا گیا تھا ۱۸۸۰ء)۔

۵- موآبی "تورات" (یہ منصوبہ شپیرا نے بنایا تھا، تاکہ برٹش میوزیم کو دھوکا دے۔ اس میں احکام عشرہ کی ایک خاص تعبیر درج تھی۔)

۶- جان پال جونز کے سوانح حیات مرتبہ اے سی بوئل (یہ دو جلدوں کی کتاب ہے جس کا ایک حصہ صحیح اور ایک حصہ افسانوی ہے۔)

۷- رابرٹ سپرنگ کی جعل سازیاں (اس میں سیکڑوں دستاویزیں ہیں جو فلاڈیلفیا کے ایک دستاویز فروش نے بنائی تھیں تاکہ دستاویزیں جمع کرنے والوں کے ہاتھ بیچے۔)

۸- لنکن اور رٹلیج کی خط و کتابت (یہ جعلی خطوں کا مجموعہ ہے۔ کہا جاتا ہے، کہ یہ ابراہم لنکن کے خطوط تھے جو این رٹلیج کو لکھے گئے۔)

۹- ایچ۔ ایل مینکن کی تاریخ حمام (یہ ایک مقالہ تھا جو مذاقیہ انداز میں لکھا گیا اسے درست سمجھ لیا گیا اور بعد میں یہ مشہور ماخذ میں شمار رہا)۔

پانچویں تاریخی تفہیم کو جس کا تعلق تاریخ نگاری سے ہے۔ پانچ مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے —: اول یہ کہ کسی تاریخی واقعے کی چھان بین کسی ایسے شخص کے ذریعے سے ہو جو خود اس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک تھا جب کہ وہ واقعہ پیش آ رہا تھا۔ اس معاملے میں زور اس حقیقت پہ ہے کہ واقعہ کے متعلق فرد کے ادراک پہ اس کے پس منظر کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سیکڑوں ذاتی دستاویزیں مثلاً خط، روزنامچے، تذکرے وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک نہایت غیر معمولی حد تک عمدہ ماخذ جارج ٹمپل ٹن سٹرانگ کا روزنامچہ ہے جسے ایلن نیونز اور ملٹن ہیلسے ٹامس نے ایڈٹ کیا۔ معلم کو سٹرانگ کے تشخص پر زور نہ دینا چاہیے لیکن اس نے جو بے شمار تبصرے لکھے، اور یہ تبصرے اہم قومی مسائل کے متعلق تھے ان میں سے اقتباسات پڑھنے چاہئیں۔ جب طلبہ مختلف مسائل کے متعلق سٹرانگ کے مدرکات سے واقف ہو جائیں تو معلم کو چاہیے کہ طلبہ سے مندرجہ ذیل انداز کے سوال کرے :

۱- آپ روزنامچے کے بہت سے اقتباسات سن چکے ہیں۔ آپ کی رائے اس فرد کے متعلق کیا ہے جس نے یہ سب کچھ لکھا؟

---

[1] لفظی معنی "کتاب پنجگانہ" یعنی پانچ کتابیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب تورات کی ہیں یعنی کتاب پیدائش، کتاب خروج، کتاب احبار، کتاب عدد، کتاب استثناء۔

۲- یہ فرد مرد تھا یا عورت ؟

۳- یہ فرد اچھا پڑھا لکھا تھا، یا اس کی تعلیم معمولی تھی ؟

۴- اس فرد کا پیشہ کیا ہو سکتا تھا ؟

۵- اس کی مالی حیثیت کیسی تھی ؟

۶- کیا آپ اس فرد کے سیاسی رجحانات کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں ؟

۷- اس نے اپنی معلومات یا رائیں کن ماخذ سے حاصل کیں ؟

۸- کیا یہ روزنامچہ نگار سرد مزاج، پُرسکون، صاحبِ غور و فکر اور معروضی تھا ؟ یا معمولی بات پر جوش میں آجاتا تھا۔ جلد فیصلے کر لیتا تھا اور اس کے مزاج میں تعصّب تھا ؟

۱۴۶

۹- کیا آپ کسی ایسی خیالی شخصیت کا تصوّر کر سکتے ہیں جس نے ان تمام واقعات کے متعلق مختلف انداز میں لکھا ہو، اور اس کے احساسات نیز رائیں مختلف ہوں ؟

۱۰- کیا آپ کسی ایسی حقیقی شخصیت کا خیال کر سکتے ہیں جو اس موقع پر زندہ ہو، اور وہ اس روزنامچے کے مصنف کی مختلف رایوں سے اتفاق کرے جن کے اقتباسات ہم نے پڑھے ہیں ؟

۱۱- کیا آپ کسی ایسی شخصیت کا تصوّر کر سکتے ہیں جو زندہ ہو، اور اس روزنامچہ نگار کی رایوں سے اختلاف کرے ؟

۱۲- آپ ان واقعات کے متعلق کیا احساسات رکھتے ہیں جن کا ذکر اس روزنامچے میں آیا ہے، نیز اس مرد یا عورت کے ذاتی فلسفے کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے جس نے یہ واقعات لکھے ؟

۱۳- آپ کیوں اس روزنامچہ نگار کے افکار اور قدروں سے اختلاف یا اتفاق کرتے ہیں ؟

۱۴- آپ اپنی معلومات، روش اور قدریں کہاں سے حاصل کرتے ہیں ؟

۱۵- کیا کوئی اور شخص وقت کے واقعات کے متعلق آپ کی تحریر سے آپ کے پس منظر کا اندازہ کر سکتا ہے ؟

۱۶- کیا کوئی فرد اپنی زندگی کے واقعات کامل معروضی طریق پر لکھ سکتا ہے ؟

۱۷- کیا کسی فرد کے لیے یہ ممکن ہے کہ اپنی بعض پابندیوں اور رجحانات کا تعین کر دے؟ نیز دوسرے افراد کی پابندیاں اور رجحانات کی وضاحت ہو جائے تاکہ دونوں فریق انسانی معاملات میں ذاتی تاثرات کے متعلق آگاہ رہیں۔

۱۸- کیا کوئی فرد ماضی یا حال کے واقعات کے متعلق زیادہ معروضی طریق پر سوچنے اور لکھنے کی صلاحیت کو تقویت پہنچا سکتا ہے؟

۱۹- جو بحث ہماری جماعت میں ہو چکی ہے، کیا اس سے آپ کو تاریخ کے متعلق یعنی تاریخ نگاری اور تاریخی مواد کی خواندگی کے متعلق کوئی چیز معلوم ہوئی ہے؟

اس قسم کے سوالات کے متعلق خاصی بحث و نظر کے بعد معلم یہ کر سکتا ہے کہ طلبہ کو جارج ٹمپلٹن سٹرانگ کے متعلق سوانحی معلومات فراہم کر دے اور جو کچھ سٹرانگ نے اپنے روزنامچوں میں لکھا ہے۔ اس کے حد درجہ موضوعی صحت کے متعلق فیصلہ کرنے میں مدد دے۔ اس دور میں اور جو روزنامچے لکھے گئے۔ انھیں بھی چھان بین کر کے نکالنا چاہیے۔ تاکہ سٹرانگ کے روزنامچے کا مقابلہ دوسرے روزنامچوں سے ہو جائے۔ سب سے آخر میں معلم کو چاہیے کہ طلبہ کو ان الفاظ میں دعوت دے:

"ہم لوگ جارج ٹمپلٹن سٹرانگ کے روزنامچے پر غیر معمولی دلچسپی اور قدر و قیمت کی بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے اس کے پس منظر اور نظریات کا مقابلہ دوسرے روزنامچوں سے کیا ہے جو اسی زمانے میں لکھے گئے۔ اب میں آپ کو عملی اقدام کا موقع دیتا ہوں۔ میں ہر ایک کو دعوت دیتا ہوں کہ آئندہ وہ دو ہفتے کے لیے روزنامچہ باقاعدہ مرتب کرے جس میں قوم ملک اور دنیا نیز اپنی آبادی کے واقعات کے متعلق احساسات پیش کیے جائیں۔ اگر یہ کام آپ کے دل پسند ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ آپ موجودہ واقعات کے متعلق مختلف رسالے، اخبار اور میگزین پڑھیے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات، رُوداروں، اداریوں تجزیوں، ملاقاتوں کی کیفیتوں، بحثوں وغیرہ کے متعلق سب کچھ پڑھیں اور سنیں۔ ہر اس بحث اور گفتگو کا خاص خیال رکھیں۔ ۱۴۷

جس میں آجکل کے واقعات زیرِ غور ہوں اور تمھارے گرد و پیش رہنے والے لوگ حصہ لیں، خواہ گھر پر، خواہ سکول میں خواہ کسی اور جگہ۔ اگر آپ ایسا کر سکیں تو ضروری ہے کہ جو کچھ روز نامچے میں لکھیں، وہ کسی دوسرے کو نہ بتائیں، نہ ان امور کے متعلق کسی سے بات کریں، بلکہ اس دستاویز کو تا بحدِ امکان ذاتی و شخصی سمجھیں۔

دو ہفتے ختم ہو جائیں تو میری خواہش یہ ہوگی کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کا تجزیہ کریں۔ اپنے آپ سے پوچھیں کہ آپ کی تحریر اور ردِعمل میں آپ کے پس منظر کا کتنا حصہ ہے۔ آپ کس حد تک معروضی یا کسی ایک طرف جھکے ہوئے رہے ہیں، اور آپ معاصرانہ واقعات کے جائزے اور پیشکش کی صلاحیت کو کیونکر بہتر بنا سکتے ہیں۔ پھر آپ چاہیں تو مَیں آپ کی تحریر کو پڑھنے کی عزت حاصل کروں گا۔ بعد ازاں آپ کے روز نامچوں کے وہ حصے آپ کے ہم جماعتوں کو سناؤں گا۔ جن کے پڑھے جانے پر آپ راضی ہو جائیں۔ مَیں ایک ایک روز نامے سے مختلف حصے پڑھتا جاؤں گا جو ایسے ہی واقعات پر مشتمل ہوں تاکہ اس طرح آپ کو مختلف تقابلات دیکھنے کا موقع مل جائے۔

مَیں خود بھی روز نامچہ لکھوں گا۔ آئندہ دو ہفتے کے لیے اس فیصلے کا پابند رہوں گا۔ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس کو مل جل کر پڑھیں گے اس وقت مَیں آپ سے پوچھوں گا کہ مختلف واقعات کے متعلق میرے احساسات کی مثالیں بتانے کی کوشش کریں اور وہ احساسات بتائیں جو مَیں نے ان حقائق کے متعلق پیش کیے ہیں۔

سب سے آخر میں یعنی جب یہ کام ختم ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ ہم میں سے بعض افراد روز نامچے لکھنے کا کام کم از کم تھوڑی مدت کے لیے جاری رکھیں گے۔ واقعات میں کوئی تبدیلی آجائے گی تو اس پر لکھیں اور بتائیں کہ آپ کا نظریہ کیا ہے۔"

مختلف امور کا جائزہ لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ تاریخ میں واقع ہو چکا ہے۔ اسے مختلف (کی) نگاہوں سے دیکھ سکیں، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ واقعات سے متعلق تھے، جب کہ یہ

پیش آرہے تھے۔ معلم اپنے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرسکتا ہے کہ نمایاں، اہم اور بامقصد تاریخی واقعات کی نشاندہی کریں جو جماعت میں اس قسم کی سرگرمیاں جاری رکھنے کا باعث بن سکیں، اور جن کے مطالعے کے دوران میں زیادہ سے زیادہ مقابلے کا سامان مہیا ہو سکے۔ پھر تقریروں، اداریوں، مضمونوں، خطوں وغیرہ کے ذریعے سے مختلف نظریات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو منتخب واقعہ کے سلسلے میں پیش آئے۔

فرض کر لیجیے کہ جماعت اس سلسلے میں عورتوں کے لیے ووٹوں کے حقوق کو منتخب کرتی ہے۔ اس سلسلے میں طلبہ کو بے شمار مسالہ مل جائے گا جس سے نظریات پر بحث ہو سکے گی۔ ان میں سے ایک مآخذ سوسن بی اینٹنی کی تقریر ہے جو عورتوں کے لیے ووٹ کے حقوق پر ۱۸۷۳ء میں کی گئی تھی۔ اس کا ایک حصہ ذیل میں درج ہے :

"دوستو اور ہمسر شہریو ! ۱۴۸

میں آج رات آپ کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت میں کھڑی ہوں جس کا جرم یہ ہے کہ گزشتہ صدارتی انتخاب میں میں نے ووٹ دینے کا جرم کیا، حالانکہ قانوناً مجھے اس کا حق حاصل نہ تھا۔ آج شام میرا کام یہ ہوگا کہ ثابت کروں اس طرح ووٹ دینے میں میں نے نہ محض کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اپنے شہری ہونے کا حق استعمال کیا، جو مجھے اور امریکہ کے تمام شہریوں کو قومی دستور کی رو سے حاصل ہے اور کوئی مملکت اس سے انکار کی مجاز نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . .

. . . . . . عورتوں سے ایسی گفتگو کرنا کہ وہ آزادی کی برکات سے مستفید ہیں، صریح مذاق ہے، جب انھیں وہ ذریعہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں جو جمہوری حکومت کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے یعنی ووٹ۔

. . . .

ولبسٹر، ورسسٹر اور بُوویر شہری کی تعریف یہ کرتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ کا باشندہ جسے ووٹ دینے اور عہدے پر متمکن ہونے کا حق حاصل ہے۔

جو مسئلہ اب حل طلب ہے محض یہ ہے، کیا عورتیں افراد ہیں؟ اور میں ہرگز یقین نہیں رکھتی کہ ہمارے مخالفوں میں سے کوئی یہ کہنے کی بھی

جسارت کر سکے گا کہ وہ افراد نہیں ...."

مندرجہ ذیل بیان ۱۸۶۷ء میں امریکی سینیٹ میں دیا گیا تھا :

"اب ہمارے سامنے ووٹ دینے والوں کا اتنا ہجوم ہے اور ان کی تعداد اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ان میں سے منتخب افراد کے لیے ووٹ کا حق دینا حق و انصاف کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے اور اسے جرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مشکلات اور یہ داخلی پریشانیاں بہت بڑھ جائیں گی جب ریاستہائے متحدہ میں ووٹ دینے والے ایک کروڑ کے بجائے دو کروڑ ہو جائیں گے۔ اگر عورتوں کو ووٹ کا حق دے دیا جائے گا تو اس کا فوری اور براہِ راست اثر یہی ہوگا۔

.... اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن ہستیوں کو ہم اس سرزمین کی خواتین کہتے ہیں جو اچھی تربیت یافتہ اور اچھی تعلیم پائی ہوئی عورتیں ہیں، جن کے جذبات نازک ہیں، وہ گھروں کے اندر رہتی ہیں اور انھیں وہیں رہنا بھی چاہیے۔ ان کی کرخت جنس باہر نکل کر ووٹ دینے کے لیے جائے گی .... آپ لوگ اس سرزمین کی کم از کم ایک تہائی عورتوں کو غیر مہذب دائرے میں پھینک دیں گے، جب وہ ووٹ دینے کے سلسلے میں مردوں کے ساتھ شریک ہوں گی۔"

تاریخ میں ایک ہی واقعے کے متعلق کچھ عرصہ بعد جائزہ لینے کی کوشش اس لیے ضروری ہے کہ اس
طرح طلبہ کے لیے افراد کے نظریات کا تجزیہ کرنے میں مدد ملے گی اور وہ اسے بہتر طریق پر ذہن نشین ۱۴۹
کر سکیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدائی اثر کچھ وقت گزر جانے کے بعد دھیما پڑ جائے، بدل جائے
یا بالکل محو ہو جائے۔

بہت سے بچوں نے یہ کھیل کھیلا ہوگا کہ پہلے ایک کہانی ایک بچے کی زبان سے سنی جاتی ہے۔ پھر پورا مجمع وہی کہانی سناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب آخری بچے کی زبان سے وہ کہانی سنی جاتی ہے تو اس کی صورت و ہیئت بدل جاتی ہے۔ جب پہلا بچہ اپنی بیان کردہ کہانی دوبارہ سناتا ہے تو سب عموماً ہنس پڑتے ہیں۔ اس کھیل کو بآسانی تبدیل کر کے وہی بات حاصل کی جا سکتی ہے جو ہم واضح کرنا چاہتے ہیں۔ معلم سکول کا وقت شروع ہونے پر جماعت کو کوئی کہانی سنا دیتا ہے یا تختہ سیاہ پر کوئی بیان لکھ دیتا ہے یا کوئی خاکہ پیش کر دیتا ہے (یا کوئی بچہ یا چھوٹے بچوں کا گروہ جماعت کو کوئی کہانی یا روداد سنا دیتا ہے)۔ اس کے فوراً بعد معلم ایک ایک طالب علم سے کہے گا کہ وہ اٹھے، اور

ہال میں جاکر ٹیپ ریکارڈر کے سامنے جو کچھ سنا ہے سنا دے اور جو کچھ دیکھا ہے بیان کر دے۔ پھر تمام بچوں کے بیانات پوری جماعت کو دوبارہ سنائے جائیں اور ان پر بحث کی جائے۔ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مختلف بچوں کے ذاتی احساسات ان تصریحات میں داخل ہو گئے۔ معلم ان کی حقیقی حیثیت واضح کر سکتا ہے۔ ایک ہفتہ یا زیادہ مدت تک اس امر کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ اس کے بعد یہ پورا واقعہ از سرِ نو دہرایا جاتا ہے۔ جو کچھ ریکارڈ ہو چکا اسے پھر پوری جماعت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس وقت معلم بچوں سے پوچھ سکتا ہے کہ ان دونوں ٹیپ ریکارڈروں میں کیا فرق پڑا۔ اسی طرح کسی تاریخی واقعے کو لے کر جس سے بچوں کو دلچسپی ہو، اور وہ ان کی صلاحیتوں کے عین مطابق ہو، طلبہ کو بتایا جا سکتا ہے کہ جو تجربہ انھوں نے کیا وہ کس طرح تاریخ کی تحریر کا جزو بن جاتا ہے۔ مثلاً انٹرمیڈیٹ درجے یا سینیئر ہائی سکول کے طلبہ کے سامنے چارلز وارن کی کتاب کا پانچواں باب پیش کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا نام ہے "آڈ بائی ویز اِن امیریکن ہسٹری"۔ پانچویں باب کا عنوان ہے جب واشنگٹن کو صدرِ امریکہ بنایا گیا تھا تو موسم کیسا تھا؟

وارن لکھتا ہے:

"جس وقت واشنگٹن کو صدر بنایا گیا تھا، اس وقت موسم کیسا تھا؟
یہ سوال بظاہر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن مختلف شاہدوں کے
بیانات میں جو اختلاف ہے وہ اس امر کی ایک دلچسپ شہادت ہے
کہ تاریخ نگاری میں ذاتی یادداشتیں قابلِ اعتماد نہیں ہوتیں....
........." [1]

۱۵۰ وارن بتاتا ہے کہ جارج واشنگٹن کے صدر بننے کے متعلق معاصرانہ شہادتیں بہت کم ہیں اور ان میں موسم کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ سب سے پہلی مرتبہ موسم کا ذکر ۱۸۵۴ء میں ہوا، یعنی اصل رسم ادا ہونے کے پینسٹھ سال بعد۔ اس بیان کا مصنف روفس ڈبلیو گریس وولڈ تھا۔ وہ ۱۷۸۹ء میں زندہ نہ تھا اور اپنی روداد کے لیے کوئی سند پیش نہیں کرتا۔ لیکن کہتا ہے:

"آٹھ بجے کے قریب افق پر کچھ بادل نمودار ہوئے جن کی وجہ سے ناخوشگوار دن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ۹ بجے گھنٹیاں بجیں تو ساتھ ہی مختلف گرجوں کے گھنٹے بجنے لگے۔ تاکہ لوگ جمع ہو کر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں کہ یہ امر قوم کے لیے باعثِ برکت ہو۔ صدر خدا کی حفاظت میں رہے۔

---

[1] چارلز وارن کی مذکورہ کتاب، ص ۹۲۔

اس کے دور کا نظم و نسق کامیاب ہو۔ سورج خوب چمک رہا تھا گویا
اسے یہ کام سونپ دیا گیا تھا کہ دنیا کے آسمانی فرمانروا کی نیک شگونی
کا یقین دلا دے۔[1]"

وارن کہتا ہے کہ زیادہ قریبی دور کے مصنفوں نے بھی لکھا ہے کہ جب پہلے صدر کی صدارت کا افتتاح ہوا تو سورج چمک رہا تھا اور اس میں کسی قسم کا شبہہ نہیں، لیکن وہ بھی کوئی سند پیش نہیں کرتے۔ پھر وارن مس میری ہنٹ پامر کا ایک بیان پیش کرتا ہے جو ۱۸۵۹ء کے آس پاس لکھا گیا۔ مس پامر ۱۷۸۹ء میں چودہ سال کی تھیں اور جب اس نے اپنے پوتوں پوتیوں کے لیے یہ یادداشتیں لکھیں۔ تو اس کی عمر چوراسی سال کی تھی۔ وہ کہتی ہے :

"...... میں سمجھتی ہوں اتنی تیز بارش کبھی نہیں ہوئی جتنی اس دن ہوئی۔ ہم دیر تک اس جلوس کا انتظار کرتے رہے۔ بازار لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جب لوگوں میں ایک گونہ تیز رفتاری نمودار ہوئی تو ہم نے سمجھ لیا کہ جلوس نزدیک آ رہا ہے۔ جلوس آیا۔ بابائے ملک سر برہنہ تھا۔ اوپر چھتر کا سایہ تھا۔ سب سے آگے اسی کی سواری تھی..... جو لوگ آس پاس کے گھروں میں پناہ نہ لے سکے وہ بارش سے شرابور ہو گئے۔ اس زمانے میں چھتریاں بہت کم تھیں۔ ہوتیں بھی تو کچھ زیادہ کام نہ دے سکتیں۔[2]"

وارن ہمیں ایک اور بیان کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ۱۸۲۱ء میں ایلیزا موسن مارٹن نے لکھا تھا۔ یہ خاتون ۱۷۸۹ء میں قریباً ۱۶ سال کی تھیں اور بیان اس وقت لکھا جب اس کی عمر اڑتالیس سال کی تھی۔ اس نے اپنی یادداشت میں موسم کے متعلق تو کچھ نہیں لکھا لیکن کہتی ہے کہ ہجوم چھتوں پر بھی بے اندازہ تھا۔ اس بیان میں بارش کا مطلق ذکر نہیں۔ اس وجہ سے وارن کو یہ لکھنا پڑا :

"یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے جو مؤرخ کے لیے پیدا ہو گیا ہے، کیا مس مارٹن نے اڑتالیس سال کی عمر میں یادداشت لکھتے وقت بارش کا ذکر بھلا دیا، یا مس پامر نے چوراسی سال کی عمر میں بارش کا ذکر کر دیا جو اس وقت ہوئی ہی نہیں تھی۔[3]"

151

---

[1] چارلز وارن کی کتاب، ص ۹۶۔
[2] ایضاً ص ۹۹۔ [3] ایضاً ص ۱۰۰۔

اب زیرِ غور امر یہ ہوگا کہ تاریخی واقعات کے دو مختلف دوروں کی ودروداددں کا معاملہ کیا ہے۔ اس سے طلبہ کو یہ جاننے میں مدد ملے گی کہ تاریخ نگاری کا سلسلہ بدلتا رہتا ہے اور مختلف بیانات و تجربات میں نئے تصورات داخل ہو جاتے ہیں، لہٰذا ممکن ہے "حقائق" میں اضافہ ہو جائے یا انھیں حذف کر دیا جائے، یا وہ بدل جائیں۔ سکوانٹو کی دُعائے شکر کی کہانی جو بارہا بیان ہو چکی ہے۔ اس مظہر کی توضیح کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے معلم کو چاہیے کہ کسی معاصر کتاب کے متن میں سے مندرجہ ذیل حصہ پڑھے:

> "ساموسیٹ پلائی متھ واپس ہوا تو اس کے ساتھ ایک اور "انڈین" تھا جس کا نام سکوانٹو تھا، جو انگریزی بول سکتا تھا۔ یہ شخص پہلے ایک مرتبہ خلیج پلائی متھ کے نزدیک رہ چکا تھا۔ وہ گرفتار ہو کر کچھ مدت انگلستان میں بھی گزار چکا تھا۔
>
> سکوانٹو آبادکاروں کا گہرا دوست بن گیا۔ اس نے بتایا کہ جوار اور دوسری غذائی جنسوں کے بونے کا طریقہ کیا ہے۔ اسی نے بتایا کہ مردہ مچھلیاں بیجوں کے ساتھ رکھ دینے سے زمین زرخیز ہو جاتی ہے اور فصلیں اچھی ہوتی ہیں۔ سکوانٹو نے انھیں یہ بھی بتا دیا کہ ہرن، خرگوش اور جنگلی فیل مرغ کو شکار کرنے کے طریقے کیا ہیں۔
>
> سکوانٹو ہی نے انھیں بتایا کہ خودرو آلوچے، سٹرابری اور انگور جنگل میں کہاں پائے جاتے ہیں۔ نیز انڈینز کے ساتھ دوستی پیدا کرنے کے طریقے سکھائے۔ گویا سکوانٹو ہی کی وجہ سے آبادکاروں کو امریکہ میں رہنے کا ڈھنگ آ گیا[1]"

معاصر کتاب کے پڑھنے کے فوراً بعد معلم طلبہ سے کہہ سکتا ہے:

"اب میں آپ لوگوں کے سامنے پلائی متھ کی آبادی کی پہلی کہانی پڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ ولیم بریڈفورڈ نے لکھی تھی جو نوآبادی کا دوسرا گورنر تھا۔ یہی بریڈفورڈ ہے جسے بعض اوقات "بابائے تاریخِ امریکہ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے پلائی متھ کے آباد ہونے کی تاریخ لکھی تھی۔ بعد میں پلائی متھ کی جو تاریخیں لکھی گئیں وہ بریڈفورڈ ہی کی

---

[1] "بیسک سوشل سٹڈیز" ص ۳۱، ۳۲۔

کہانی سے پیدا ہوئی تھیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن کا کچھ حصہ میں پہلے پڑھ چکا ہوں، آپ احتیاط سے سنیں، میں پڑھتا ہوں۔ پھر ہم نئی اور پرانی کہانی کے متعلق بات چیت کریں گے۔"

اس کے بعد معلم کو چاہیے کہ بریڈفورڈ کی کہانی میں سے کچھ حصّہ پڑھے، خصوصاً وہ حصّہ جس میں سکوانٹو کا ذکر ہے :

"...... سکوانٹو انھی کے ساتھ رہا، ان کی ترجمانی کرتا تھا، اور خدانے اسے آبادکاروں کی بھلائی اور بہبود کے لیے ایک خاص ذریعہ بنا کر بھیجا تھا، جس نے توقعات سے بڑھ کر مدد دی۔ اس نے بتایا، کہ جوار کیونکر بوئی جائے۔ مچھلیاں کہاں سے ملیں گی۔ دوسری جنسیں کہاں سے آئیں گی۔ وہ ان کے فائدے کے لیے انھیں غیر معروف مقامات پر لے جاتا تھا اور کبھی ان سے الگ نہ ہوا تاآنکہ موت اسے اٹھا لے گئی......

152 ....

بعدازاں وہ جس طرح جوار بو سکتے تھے بوئی۔ سکوانٹو نے اس سلسلے میں انھیں بڑی مدد دی۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ بونے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کی ورسنی اور پرورش کا طریقہ بھی واضح کر دیا تھا۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ جب تک مچھلی لا کر بیج کے ساتھ نہ ملائی جائے گی، نتیجہ کچھ نہ ہوگا۔

....

پھر کچھ افواہیں سنی گئیں، ایک اور انڈین نے جس کا نام ہوبامک تھا، بتایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ نرگھن سیٹس سے مل گئے ہیں۔ وہ انھیں کسی نہ کسی موقع پر دھوکا دے گا لہٰذا انھیں احتیاط کرنی چاہیے۔ اس نے سکوانٹو کی بھی بعض باتیں ان پر واضح کیں اور کہا کہ یہ باتیں میں نے سکوانٹو کو دوسرے انڈینز کے ساتھ خفیہ خفیہ کرتے سنا ہے۔ پھر وہ دس بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ باہر نکلے۔ اپریل کے مہینے کا آغاز تھا۔ سکوانٹو اور ہوبامک دونوں ساتھ تھے اور دونوں کے درمیان رقابت تھی......

....

"....... انھیں جلد معلوم ہو گیا کہ سکوانٹو اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے تیار ہے اور وہ اپنے مقصد کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ انڈینز کو ڈرا رہا ہے، ان سے تحفے لے کر خوب دولتمند بن رہا ہے۔ انھیں یہ یقین دلا رہا ہے کہ جب چاہے گا، ان کے خلاف جنگ شروع کرا دے گا، اور جس کے ساتھ چاہے گا، صلح کرا دے گا۔"

معلم طلبہ سے کہہ سکتا ہے کہ نئے اور پرانے بیانات میں یکسانیاں اور اختلافات الگ الگ کر کے
پھر بتاؤ کہ بعض اختلافات کیوں پیدا ہوئے۔ بچے شروع میں کہیں گے کہ دونوں کہانیاں سکوانٹو کے
متعلق ہیں اور ان میں اس امداد کا ذکر ہے جو سکوانٹو نے آبادکاروں کو دی۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ
دونوں بیانوں میں اختلاف کا ایک رنگ ہے اور ایک کو سمجھ لینا آسان ہے دوسری کو نہیں۔ یہ بھی
اضافہ کر سکتے ہیں کہ اس کہانی کے نئے بیان میں مصنف نے اپنے قیاسات شامل کر دیے ہیں۔ سکوانٹو
نے واقعی آبادکاروں کو شکار کے بہترین طریقے سکھائے ہوں گے لیکن پرانے بیان میں سکوانٹو کی رقابت
کا ذکر نہیں کیا گیا اور نہ یہ بتایا گیا کہ وہ دوسروں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ یہ بھی کہہ
سکتے ہیں کہ جو کتاب نصاب کے لیے لکھی گئی تھی اس میں کہانی کی پوری تفصیلات کے لیے گنجائش نہ تھی،
اور مصنفین سکوانٹو کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہتے تھے جو آبادکاروں کی دوستی کے خلاف
ہوتی۔ ان امور کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ معاصر کتاب پر نکتہ چینی کی جائے۔ محض یہ غرض ہے کہ بچوں پر
۱۵۳ واضح ہو جائے کہ تاریخ لکھنے کا انداز وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا ہے۔ اب یہ معاملہ سامنے آتا ہے، کہ
غور سے دیکھا جائے، وہ کون سے طریقے ہیں جن کی بنا پر مؤرخ کا نقطۂ نگاہ مہیا معلومات سے متاثر
ہوتا ہے۔ وہ کون کون سے کلیدی نکتے سامنے آتے ہیں اور کیونکر دستاویزوں کی تعبیر میں تخلیقی شان
پیدا ہوتی ہے۔ ماضی سے بہت سی مثالیں اخذ کی جا سکتی ہیں جو سیکھنے والوں کو یہ سمجھانے میں مدد دیں گی
اور معلموں کو وہ مثالیں جلد سوجھ جائیں گی۔ یہ فرض کر لینا کہ نیانڈرٹل کے لوگ[1] بھی کسی نہ کسی مذہب
کے پابند تھے کیونکہ وہ اپنے مردوں کو ہتھیاروں اور زیورات کے ساتھ دفن کرتے تھے، یا تو یہ مقصد تھا
کہ دوسری زندگی میں یہ چیزیں ان کے کام آئیں گی، یا انھیں محض نذرانے سمجھ لینا چاہیے، یہ تصوّر
معلوم شہادت پر مبنی ہے اگرچہ وہ بہت ہی محدود ہے۔ اس بارے میں نظریات بنتے رہے اور اب تک

---

[1] یہ زمانہ قدیم کے انسان تھے جن کے ڈھانچے اسی نام کے ایک مقام سے ملے ۔۔ یہ مقام ڈسل ڈارف (جرمنی) سے قریب ہے۔ بعدازاں بلجیم، فرانس سے ایسے ہی ڈھانچے ملے۔ یہ عہد حجری ہی کے ایک دور کے افراد تھے۔

بن رہے ہیں تاکہ ان باقیات کا کچھ مفہوم ذہن نشین ہو جائے جو سٹون ہینج کے مقام پر ہیں۔ یہ مقام سالسبری کے میدان میں ہے جو انگلستان کے ضلع ولٹ شائر میں ہے۔ معلم ایسی ہی اور مثالیں دے سکتا ہے زیادہ مثالیں نیشنل جیاگرافک سوسائٹی کی کتاب "ایوری ڈے لائف ان اینشنٹ ٹائمز" سے مل سکتی ہیں۔ جب متعدد مثبت مثالیں مہیّا ہو جائیں گی اور بنیادی معاملہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا، تو معلم

مندرجہ ذیل تلخیص پیش کرتے ہوئے جماعت سے کہہ سکے گا کہ جو افسانوی موقع و محل پیش کیا گیا ہے اس پہ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے:

"ہم دیکھ چکے ہیں کہ مؤرخین اور دوسرے لوگ ان بہت سی چیزوں سے کام لے چکے ہیں، جو زمانۂ ماضی کے لوگوں نے چھوڑیں۔ اس طرح کوششیں کر چکے ہیں کہ جو زندگی بہت پہلے بسر کی جا رہی تھی، اس کی کہانیاں مرتب کر لی جائیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ کسی ایک فرد کے لیے ابتدائی تہذیبوں کے متعلق ایسی معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ بعض اوقات کوئی انسان ان چیزوں کے متعلق احتیاط سے ایک رائے قائم کرتا ہے۔ جن کے متعلق دوسرے لوگ پہلے سوچ چکے ہیں، محسوس کر چکے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر شخص اپنے طریق حیات کو بہترین سمجھتا ہے کیونکہ اس سے قریب تر ہے۔ یہ بھی جان چکے ہیں کہ جب کوئی شخص ماضی کی چیزوں کو سمجھے بغیر واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے تو انھیں دورِ حاضر کی ان چیزوں میں لے آتا ہے جنھیں وہ بخوبی سمجھتا ہے۔ آئیے! اب یہ دیکھیں کہ آپ کے خیالات آجکل کیونکر کام کرتے ہیں۔ ہمیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ ہمارے شہر میں ایک نیا سکول تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اس سکول کے لیے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب بڑے وسیع پیمانے پر منائی جائے گی۔ سکول کا سپرنٹنڈنٹ اور بہت سے دوسرے لوگ اس تقریب میں موجود ہوں گے۔ سپرنٹنڈنٹ بچوں کے ایک گروہ سے کہتا ہے کہ ایسی چیزیں چن لو جو سنگِ بنیاد کے پیچھے سیمنٹ کے ذریعے سے لگا دی جائیں گی۔ بچے جو چیزیں چنتے ہیں ان میں اپنے طریق زندگی کے متعلق بعض اہم باتیں ہوں گی۔ اب سے بہت سال بعد جو لوگ آئیں گے اور ان چیزوں کو دیکھیں گے تو وہ اس

عہد کے لوگوں کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں گے۔

ہمیں فرض کر لینا چاہیے کہ جماعت کے تمام بچوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ضروری چیزیں چُن لیں۔ آپ بتائیے کہ آپ کیا چنیں گے اور کیوں چنیں گے۔

"یہ میرے سامنے کارڈ دھرے ہیں جن میں سے ہر ایک پانچ انچ لمبا اور تین انچ چوڑا ہے۔ میں آپ میں سے ہر ایک کو ابتدا میں پانچ پانچ کارڈ دوں گا۔ اگر آپ کو مزید کارڈوں کی ضرورت پیش آ جائے تو میری میز کے قریب آ جائیں۔ مزید کارڈ دے دیے جائیں گے۔ ان میں سے
ہر ایک کارڈ پر ایک ایک چیز لکھیں۔ پھر ہم آپ کے تمام افکار و ۱۵م
خیالات تختۂ سیاہ پر ترتیب وار لکھ دیں گے۔ پھر ایک ایک چیز کے متعلق پوچھیں گے، کہ آیا یہ انتخاب اچھا تھا؟

آخر میں ہم یہ سوچنے کی کوشش کریں گے کہ پانسو یا ایک ہزار سال بعد جو شخص ہمارے طریقِ زندگی کے متعلق ان نشانوں کے بارے میں جو سنگِ بنیاد میں رکھے گئے کیا کچھ لکھ سکے گا۔"

اختتام

ڈاگ ہیمر شولڈ کہتا ہے: زندگی اپنی بے پایاں ممکنات اور یگانہ حال کے ساتھ دوبارہ کبھی واقع نہیں ہوتی۔ والٹر سیلر اور رابرٹ ییٹ مین اپنی عجیب وغریب چھوٹی سی کتاب میں، جس کا نام ہے: "۱۰۶۶ء اینڈ آل دیٹ" خوانندہ کتاب کو آگاہ کرتے ہیں کہ یہ انگلستان کی وہ تاریخ ہے جو یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اس میں وہ سب کچھ آگیا جو ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ اس کتاب میں ایک سو تین اچھی چیزوں، پانچ بُرے بادشاہوں اور دو حقیقی تاریخوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں حقیقت کا ایک عنصر موجود ہے اور لوگ سکول میں تاریخ کے طور پر جو کچھ پڑھتے ہیں اسے یاد رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب سے پڑھنے والوں کو مدد ملے گی خواہ وہ پیشہ ور معلم ہوں یا نہ ہوں۔ وہ اپنے تنگ تصوّر سے بہت وسیع تصوّر پر پہنچ جائیں گے۔ اگر اس کتاب نے اپنا مقصد پورا کیا تو پڑھنے والا تاریخ کی قدر وقیمت، اہمیت اور حرکیت سے زیادہ آگاہ ہو جائے گا جو اسے تعلیمی نظم کی حیثیت سے حاصل ہے۔ اسے بے انتہا تبدیلیاں دکھائی دیں گی (اگر وہ معلم ہے تو اپنے طلبہ کو دکھانے کی کوشش کرے گا)۔ وہ مؤرخ کے کام کی پیچیدگیوں کو بہتر طریق پر سمجھ سکے گا خصوصاً جب وہ ماضی پر پہنچے گا۔ اور سب میں اس نہایت بیش قیمت عادت کو فروغ دے گا کہ ماضی کا مطالعہ انھی لوگوں کی نگاہوں سے کرنا چاہیے، جو اس میں زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحب ادراک خوانندۂ کتاب بھی اس کے مطالعے کے بعد ماضی کے سلسلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ نقطۂ نگاہ اختیار کرے گا۔ تاریخ جو کچھ بتانا چاہتی ہے وہ اس پر آشکارا ہو جائے گا، ساتھ ہی پتا چل جائے گا کہ اس میں کون کون سی تحریرات ہیں۔ یہ بھی جان لے گا کہ دورِ حاضر کا انسان ان لوگوں کا بے انتہا احسانمند ہے، جو اس سے پہلے گزر چکے۔

کرین برنٹن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تمام طبعی انسان ..... یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ کسی نظام، کسی کائنات اور کسی ایسے عمل میں شریک ہو جائے جو فرد اور ماحول کی فوری داد وستد سے بالا ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ بچے بھی یہی چاہتے ہیں، ان کی آرزو ہے کہ کسی تاریخی تناظر کو دیکھیں۔ کسی ایسے کل کا جزو قرار پائیں جو وقت کے کسی لمحے سے زیادہ طویل ہو۔ یہ فطری خواہش جب ان بصیرتوں سے مل جاتی ہے جن کا ذکر پروفیسر کومیجر نے کیا ہے اور ان کی تکنیک ایڈیٹروں نے بیان کی ہے تو نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ تاریخ کے متعلق زیادہ وسیع زیادہ پختہ اور زیادہ وظیفہ بجالانے والا فہم پیدا ہو جائے معلم تاریخ کے مالۂ وماعلیہ کے متعلق وسعتِ فہم پیدا کر لیں گے

تو ان کی ادعائی حیثیت گھٹ جائے گی اور میولر کے اس انتباہ کی حقیقت بہتر انداز میں سمجھ لیں گے کہ آخری تجزیے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخری تجزیہ کوئی نہیں۔ مختصر یہ کہ جماعتوں میں وہی تاریخ آنی چاہیے جو مؤرخوں نے لکھی ہو۔

ایچ۔ جی ویلز[1] نے ہمیں اپنی کتاب "دی ڈسکوری آف دی فیوچر" کے آخر میں ایک نہایت بصیرت افروز بات کہی ہے۔ وہ زماں میں آگے اور پیچھے کی طرف دیکھتا ہوا کہتا ہے:

"ماضی آغاز کا آغاز ہے۔ جو کچھ ہے،
جو کچھ رہ چکا ہے، وہ طلوعِ سفر کی شفق ہے
...... ایک دن آئے گا جب وہ ہستیاں
جو ہمارے افکار اور ہمارے رگوں پٹھوں میں
چھپی ہوئی ہیں، روئے زمین پر اسی طرح
کھڑی ہوں گی جس طرح کوئی شخص سٹول پر
کھڑا ہوتا ہے اور قہقہے لگاتی ہوئی اپنے ہاتھ
ستاروں کی طرف بڑھائیں گی!"

٭

---

[1] انگلستان کا مشہور مصنف (۱۸۶۶ - ۱۹۴۶ء)۔